MAHS204CCT

جدید تاریخ نویسی

Modern Historiography

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

ماسٹر آف آرٹس (ایم۔اے۔)

(دوسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدر آباد-32، تلنگانہ-بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Modern Historiography
ISBN: 978-81-967513-1-9
First Edition: October 2023

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2023
Copies	:	500
Price	:	310/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Bussiness Enterprises, Hyderabad

Modern Historiography

for

M.A. History 2nd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500032 (TS), Bharat
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ
Chief Editor

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
&
Honorary Professor, Centre for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
اعزازی پروفیسر، مرکز مطالعات اردو ثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر
Editor

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر زبان
Language Editor

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مجلس ادارت
Editorial Board

Prof. Perwez Nazir
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
شعبہ تاریخ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر مشتاق احمد کاؤ
سابقہ صدر شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College
Azamgarh, U.P.

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Prof. Danish Moin
Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر دانش معین
صدر، شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Vidya Vachaspati
Shaik Mahaboob Basha
Programme Coordinator – History
DDE, MANUU, Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈینیٹر، تاریخ
ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest
Faculty DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد

Mr. Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest
Faculty DDE, MANUU, Hyderabad

محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
ڈی ڈی ای، مانو، حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	**اکائی نمبر**
ڈاکٹر اے۔سبھاش	اکائی 1،2
ڈاکٹر وویکانند	اکائی 3،16
ڈاکٹر وی۔راجا گوپال	اکائی 4،9
ڈاکٹر اے۔سبھاش، ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	اکائی 5
ڈاکٹر احمد	اکائی 6
محمد عاصم	اکائی 7،8
ڈاکٹر فردوس حمید پرے	اکائی 10
ڈاکٹر ضیاء الحق	اکائی 11
ڈاکٹر ارونا پریتی	اکائی 12،13،14
محمد عاصم، ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	اکائی 15

مترجمین	
پروفیسر نجم السحر	اکائی 9
ڈاکٹر شیخ وسیم	اکائی 1،2،13
ڈاکٹر اکرام الحق	اکائی 12،14
ڈاکٹر ضیاء الحق	اکائی 3،4،16
ڈاکٹر خورشید احمد بھٹ	اکائی 5

پروف ریڈرس

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

فہرست

9	وائس چانسلر	پیغام
10	ڈائرکٹر	پیغام
11	کورس کوآرڈی نیٹر	کورس کا تعارف
	تاریخی نظریات	**بلاک I**
15	نشاۃ ثانیہ اور سائنسی تاریخ نویسی کا ارتقاء	اکائی 1
31	تحریک روشن خیالی کی وراثت	اکائی 2
49	اثباتیت پسندی اور رانکے	اکائی 3
67	مارکس اور تاریخ کی مادی تشریح	اکائی 4
84	گرامسی	اکائی 5
99	’’تاریخ کیا ہے‘‘ کے بارے میں ای۔ایچ۔کار کا نظریہ	اکائی 6
111	فرانسیسی انالس مفکرین	اکائی 7
125	ذہنیت کی تاریخ	اکائی 8
	فلسفہ تاریخ	**بلاک II**
134	اسپینگلر اور ’مغرب کا زوال‘	اکائی 9
146	ٹائن بی اور ’تہذیبوں کی تاریخ‘	اکائی 10

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

بلاک III	**مابعد جدیدیاتی نظریہ**	
اکائی 11	مابعد جدیدیت: فوکالٹ، دریدا، ہیڈن وہائٹ	161
بلاک IV	**ہندوستانی نظریات**	
اکائی 12	نوآبادیاتی تاریخ نویسی: مستشرقین اور افادیت پسند	173
اکائی 13	قوم پرست اور فرقہ وارانہ تاریخ نویسی	185
اکائی 14	مارکسی تاریخ نویسی	200
اکائی 15	ماتحتوں کی تاریخ	213
اکائی 16	مابعد جدیدیت اور ہندوستانی تاریخ	230
نمونہ امتحانی پرچہ		248

”اردو زبان جب ہی ترقی کر سکتی ہے اور عالمی زبان بن سکتی ہے جب کہ اس میں باضابطہ تراجم،علوم وفنون کا سلسلہ قائم کیا جائے۔جدید علم کے ہر صیغے کی مبسوط اور جامع کتابیں ترجمہ کی جائیں۔علوم وفنون کا کوئی پہلو یورپ کی زبانوں میں ایسا نہ ہو جس کا ترجمہ اردو میں موجود نہ ہو۔جب تک اردو میں ایسا منظم سلسلہ قائم نہ ہو گا اس کی علمی ترقی محال ہے۔“

ابوالکلام آزاد

NATIONAL URDU

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ادبی اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو میں دستیاب تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ و شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ مبارزات (challenges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس کولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ انہیں مقاصد کے حصول کے لیے اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کے طلباء کے لیے کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کا کام عمل میں آگیا ہے۔ پہلے اور دوسرے سمسٹر کی کتب شائع ہو کر طلباء و طالبات تک پہنچ چکی ہیں۔ تیسرے سمسٹر کی کتابیں بھی جلد طلباء تک پہنچیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے ہم ایک بڑی اردو آبادی کی ضروریات کو پورا کر سکیں گے اور اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں گے۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں ۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کرکے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کرکے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 5 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centre) کام کررہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جارہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب۔ میں آپ کو 'جدید تاریخ نویسی' کورس میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ پچھلے سمسٹر میں، آپ نے قدیم اور عہد وسطی کی تاریخ نویسی کے بارے میں سیکھا، جس میں قدیم اور عہد وسطی کے ہندوستان میں تاریخ لکھنے کی روایات بھی شامل تھیں۔ اس سمسٹر میں، آپ جدید تاریخ نویسی کو سمجھیں گے جو نہ صرف دنیا میں بلکہ ہندوستان میں بھی رائج ہے۔ یہ کورس آپ کو مختلف تاریخی روایات سے متعارف کرائے گا، جس میں سائنسی تاریخ نویسی کے طریقوں سے لے کر تاریخ نویسی کی تازہ ترین روایت ،مابعد جدید تاریخ نویسی بھی شامل ہیں۔ آپ کارل مارکس، انتونیو گرامشی اور دیگر بااثر دانشوروں کی تشریحات کو سمجھ سکیں گے۔ دنیا بھر میں تاریخ نویسی کے میدان میں اہم ترقیوں کے اس پس منظر میں، آپ جانیں گے کہ ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کی آمد کے ساتھ جدید تاریخ نویسی کا آغاز کیسے ہوا۔ آپ اس بات سے واقف ہو سکیں گے کہ، جیسے ہی ہندوستانی قوم پرست شعور ابھرا، ہندوستانی دانشوروں نے ہندوستان کے ماضی کی برطانوی تشریحات پر سوال اٹھانا شروع کر دیا، ساتھ ہی اس بات پر بھی روشنی ڈال سکیں گے کہ کیوں اور کیسے ہندوستانی قوم پرست مورخین نے ہندوستانی تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی کوشش کی۔ مزید آپ یہ سمجھیں گے کہ طبقاتی جدوجہد کے مارکسی نظریے اور گرامشی کے ماتحتی کے خیال نے ہندوستانی تاریخ نویسی کو کس طرح متاثر کیا۔ مزید، آپ جانیں گے کہ مابعد جدیدیت کے فلسفے نے ہندوستانی تاریخ نویسی کو کس طرح متاثر کیا جس کے نتیجے میں نسائی، دلت اور سماج کے دیگر حاشیائی طبقات کی تاریخ لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختصراً، اس کورس کے ساتھ، آپ نہ صرف ہر تاریخی روایت کو سمجھ اور سراہ سکیں گے بلکہ اس کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ بھی کر سکیں گے اور یقیناً، سب کے ساتھ ہندوستان کے ماضی کے مختلف پہلوؤں، ان کے اقسام، تضادات، تسلسل اور تبدیلیوں پر اپنا موقف واضح کر سکیں گے۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی کتنی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک قلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا معاشرے سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیا واچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ میٹریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

جدید تاریخ نویسی

Modern Historiography

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

اکائی 1۔ نشاۃ ثانیہ اور سائنسی تاریخ نویسی کا ارتقاء

(Renaissance and the Evolution of Scientific Historiography)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 نشاۃ ثانیہ

1.3 انسانیت پسندانہ تاریخ نویسی

1.3.1 قدیم تاریخی روزنامچے

1.3.2 پیٹرارک کا نظریہ انسان دوستی

1.4 اطالوی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات

1.5 اطالوی نشاۃ ثانیہ کے اہم مورخین

1.5.1 لیونارڈو برونی

1.5.2 فلاویو بیونڈو

1.5.3 لوریزو والا

1.5.4 نکولو میکیاویلی

1.5.5 فرانسسکو گسیارڈنی

1.6 تاریخ نویسی کا کارٹیشین مکتب فکر

1.7 اطالوی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کی حدود

1.8 اطالوی نشاۃ ثانیہ سے آگے

1.9 فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی

1.9.1 جین بودن

1.9.2 رینے ڈیکارٹس

1.9.3 لاپو پلینئیر
1.10 اکتسابی نتائج
1.11 کلیدی الفاظ
1.12 نمونہ امتحانی سوالات
1.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

پندرہویں سے انیسویں صدی کے اوائل تک کا عرصہ جدید تاریخی فکر کی ترقی کے لیے ایک اہم بنیاد کا کام کرتا ہے۔اس دور میں بہت سے بنیادی تصورات اور تکنیکیں جس کی بنیاد عصری تاریخ نویسی میں مضمر تھی' بیان کی گئیں اور ان کو بہتر بنایا گیا۔اس عرصے کے دوران تاریخی سوچ کے پہلے طریقوں سے بتدریج رخصتی ہوئی۔ یہ تبدیلی دھیرے دھیرے اور کسی حد تک بے قاعدہ انداز میں ہوئی، جس کے لیے کوئی ایک عالم یا طریقہ کار مکمل طور پر ذمہ دار نہیں ہے۔اس کے بجائے یہ ایک مجموعی عمل تھا جو متعدد دانشوران بشمول مورخین، تاریخ ساز، نوادرات، علمی شخصیات اور فلسفیوں کی شراکت پر مبنی تھا۔ نشاۃ ثانیہ، اصلاح، روشن خیالی اور رومانویت وہ اہم سماجی، فکری اور ثقافتی تحریکیں تھیں جنہوں نے مغربی فکر کے ارتقاء کو خاص طور پر تاریخی فلسفے کے دائرے میں لایا۔اس باب میں ہم تاریخ نویسی کے میدان پر نشاۃ ثانیہ کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے نتیجے میں سائنسی تاریخ نویسی کے ارتقاء کو جان سکیں گے۔
- اس عرصے کے دوران جدید تاریخ نویسی سے متعلق تصورات اور تکنیکوں کی ترقی کو سمجھیں گے۔
- انسان پسندانہ تاریخ نویسی اور اس کے حامیوں کو جان سکیں گے۔
- اطالوی نشاۃ ثانیہ کے مورخین اور ان کی تاریخ نویسی کو جان سکیں گے۔
- اطالوی نشاۃ ثانیہ کے بعد کی تاریخ نویسی سے واقف ہو سکیں گے۔

1.2 نشاۃ ثانیہ (The Renaissance)

سولہویں صدی میں جارجیو وساری (Georgio Vasari: 1511-1574) ایک اطالوی آرٹ مورخ نے اٹلی میں فنون کے دوبارہ جنم کو بیان کرنے کے لیے 'ریناسینس' (Renaissance) کی اصطلاح وضع کی۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے 1855 میں

نامور فرانسیسی تاریخ دان Jules Michelet نے استعمال کی۔ تاہم جیکب برکھارٹ (Yacob Burkhardt) نے اپنے بنیادی کام اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کی تہذیب (The Civilization of Renaissance in Italy, 1860) کو جدیدیت کے آغاز سے تعبیر کیا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کا آغاز 14 ویں صدی فلورنس، اٹلی میں ہوا اور 17 ویں صدی کے اوائل تک پورے یورپ تک پھیلا، اس نے مغربی فکر اور ثقافت کی تشکیل نو میں اہم کردار ادا کیا۔

نشاۃ ثانیہ کے دوران، مغربی فکری ثقافت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ اس کی خصوصیت انسانیت پسندی (Humanism) کی جانب ایک تبدیلی تھی، اس فلسفیانہ نقطہ نظر نے 'خدا' پر عہد وسطیٰ کے زور سے ہٹ کر، دنیاوی واقعات میں 'انسان' کو سب سے آگے رکھنے کی کوشش کی۔ اس انسانیت پسندانہ نقطہ نظر نے بتدریج بہت سی مختلف فکری بشمول تاریخی مطالعات کوششوں کو متاثر کیا۔ یورپ میں، نشاۃ ثانیہ نے جدید تاریخی روایت کا آغاز کیا۔ انسان ایک بار پھر انسانی سوچ کا مرکز بن گیا اور تاریخی طریقہ کار نے قدیم یونانی مورخین کی طرح ایک بشری نقطہ نظر کو اپنایا۔ اس کے نتیجے میں انسانی تاریخ پر الٰہی اثرات بھی اپنی اہمیت کھونے لگے۔ تاریخ نے نشاۃ ثانیہ کے دوران ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا کیونکہ اس کو بھی سات ضروری لبرل فنون میں ایک اہم فن مان لیا گیا۔ لیکن اس کی حقیقی سوچ نے اسے شاعری جیسے دوسرے شعبوں سے الگ کر دیا۔ یہاں تک کہ بلند پایہ لوگوں کے لیے بھی تاریخ لکھنا ایک ترجیح بن گیا۔

1.3 انسانیت پسندانہ تاریخ نویسی (Humanist Historiography)

تاریخ نویسی کی شکل جو نشاۃ ثانیہ کے دوران ابھری اسے عام طور پر "انسانیت پسند تاریخ نویسی" کہا جاتا ہے۔ اس سے مغربی دنیا میں جدید تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتداء کا پتہ لیونارڈو برونی (Leonardo Bruni) کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے، جو ابتدائی طور پر اٹلی کے شہر فلورنس میں شائع ہوئیں، اس لیے برونی کو افتتاحی انسانیت پرست مورخ کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ اس کے بعد، یہ فکری تحریک روم، جینوا، وینس، نیپلز اور میلان سمیت دیگر اطالوی شہروں میں پھیل گئی۔
انسانیت پسند تاریخ نویسی کے ارتقاء کو دو الگ الگ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

- پہلا دور، پندرہویں صدی کے اوائل سے لے کر اٹلی پر فرانسیسی فوج کے حملے تک (1494)
- دوسرا دور، فرانسیسی حملے کے بعد

ابتدائی دور میں شہری انسانیت کا جذبہ غالب تھا، جس کی مثال برونی، اس کے جانشینوں اور دیگر کے کاموں میں ملتا ہے۔ اس کے برعکس بعد کے دور میں المیہ کے ایک مروجہ احساس نے لفظ قسمت (fortune) کو جنم دیا۔ اس 'قسمتی' تصور کو بیان کرنے میں میکیاولی نے ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ تاہم یہ بات قابل توجہ ہے کہ دونوں ادوار میں، تاریخی تحقیقات میں کافی دلچسپی رہی۔ اٹلی میں انسانیت پسندانہ تاریخ نویسی (Humanist Historiography) کی جڑیں ان ابتدائی تاریخوں میں تلاش کی جا سکتی ہیں جو 12 ویں صدی میں نمودار ہوئیں اور 14 ویں صدی کے وسط میں جیوانی ولانی (Giovanni Villani) کی تاریخ (1276-1348) میں اپنے عروج پر پہنچی۔

ان تاریخوں نے پیٹرارک کی انسانیت پسندی(Petrarchan Humanism) نے اٹلی میں انسانیت پسند تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی۔

1.3.1 قدیم تاریخی روزنامچے (Ancient Chronicles)

تاریخ کی ترتیب میں ماضی کو ریکارڈ کرنے کا رواج بہت طویل عرصے سے چلا آرہا تھا۔ قدیم زمانے سے بشمول عہد نامہ قدیم سے تاریخ کو دستاویزی شکل دینے کا یہ طریقہ قدیم یونانیوں اور رومیوں کے ادوار میں جاری رہا۔ عہد وسطیٰ میں فروغ پایا اور مختلف یورپی ممالک میں چودھویں اور سولہویں صدی کے درمیان اپنے عروج کو پہنچا۔ تاہم بعد میں اس میں کمی آنا شروع ہوئی اور اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل تک یہ تقریباً معدوم ہو گیا۔

ایک تاریخی روزنامچہ (Chronicle) ،تاریخی واقعات اور حقائق کا ایک تحریری خلاصہ ہے جو تاریخ کی ترتیب میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ طرز تحریر خواندہ تہذیبوں میں عام رہا ہے، لیکن عیسائی روایت نے انسانی تاریخ کو عیسائی زمانے کے مطابق ترتیب دے کر اس کا موثر استعمال کیا۔ وہ اکثر اپنے تحریروں میں خیالی (Mythical) اور افسانوی (Legendary) واقعات کو شامل کرتے تھے لیکن تفصیلی تجزیہ فراہم نہیں کرتے تھے۔ یہ انہیں زیادہ جدید تاریخی تحریر سے الگ کرتا ہے، جو ذرائع کے تنقیدی تجزیہ پر منحصر ہے۔

اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں تواریخ میں سیکولر امور کے بارے میں مزید معلومات شامل ہونے لگیں۔ اگرچہ بہت ساری تاریخیں مقامی واقعات پر مرکوز تھی، تاہم کچھ مبلند نظر افراد نے وسیع دائرہ کار کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، حتیٰ کہ عالمی واقعات کو گھیرنے کی کوشش کی۔ بارہویں اور چودھویں صدی کے دوران، مختلف قسم کے سرگزشت نے منظم تاریخی علم کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ سرگزشت(Chronicles) کا انسانیت پسند مورخین نے مذاق اڑایا تھا، لیکن انہوں نے ضروری معلومات فراہم کیں اور ان کی قائل کرنے والی داستانیں زیادہ تر ان پرانی تاریخوں پر مبنی تھیں۔

1.3.2 پیٹرارک کا نظریہ انسان دوستی (Petrarchan Humanism)

فرانسسکو پیٹرارکا (Francesco Petrarcha) جسے انگریزی میں پیٹرارک بھی کہا جاتا ہے اور انہیں 'بابائے انسانیت پسندی' (Father of Humanism) بھی سمجھا جاتا ہے۔ انہیں اکثر پہلا جدید آدمی بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ لکھتے وقت اس کو ماضی کی وراثت کا پورا احساس تھا۔ وہ پرانے کھنڈرات کا مطالعہ کرنے اور ان کی اہمیت کو سمجھنے والے اولین میں سے تھا۔ تاریخ کے بارے میں سوچتے وقت انہوں نے بنیادی طور پر قدیم روم کی شان پر توجہ دی۔ روم کے ماضی کی عظیم ہستیوں پر ان کی تحقیق تاریخ میں ایک اہم شراکت تھی۔

14ویں صدی کے آخری حصے میں ، جیوانی بوکاسیو (Giovanni Boccaccio, 1313–75) اور کولوچیو سالوتی (Coluccio Salutati, 1331–1406) نے پیٹرارک کے کام کو آگے بڑھایا۔ ان کا خیال تھا کہ وقت بدل جاتا ہے اور لوگ ماضی کو یاد کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ یہ سوچتے ہیں کہ تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید۔ یہ خیال بعد میں تاریخ کو دیکھنے کا معیاری طریقہ بن گیا۔ انسانی نقطہ نظر کے مطابق قدیم دنیا، کلاسیکی یونان اور رومن روشن خیالی سے مانا جاتا تھا۔ جبکہ عہد

وسطیٰ 5ویں سے 13ویں صدی تک کا دور ایک تاریکی دور تھا۔ لیکن 14ویں صدی سے تاریخی علم کی بحالی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

1.4 اطالوی نشاۃ ثانیہ تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات
(Main Features of Italian Renaissance Historiography)

انسانیت پسند تاریخ نویسی کو عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی اور اس کے بنیادی تصورات، شکل، طریقہ کار اور مقاصد کی بنیاد پر بیان کیا جا سکتا ہے۔

- انسانی تاریخ کے اندر تخلیقی صلاحیتوں اور تنقیدی سوچ کی ترکیب ہمیں ماضی کی قدامت (the pastness of the past) کے فکریہ سے ملتی ہے۔ اس سے انقلابی تصور کا تعارف ہوا۔ اس سے تبدیلی کا ایک احساس پیدا ہوا۔ اس سے بہت سارے تاریخی اقداروں کو سمجھنے کا احساس پیدا ہوا، جیسا کہ تاریخی واقعات کی غیر متوقعیت، الگ الگ تاریخی ادوار کی جانشینی اور انسانی معاملات کی خود مختاری، الٰہی یا مافوق الفطرت اثر سے آزادی۔ مزید برآں نشاۃ ثانیہ کے دور نے مختلف وقتی اور مقامی سیاق وسباق میں ہمارے تناظر اور انسانی تجربات کی ہم رشتگی کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں تاریخ نویسی جو مختلف دانشوران کے ذریعہ مرتب کی گئی تھی، نے ایک سیکولر اور عملی طریقہ کار اختیار کیا، جس میں انسانی عمل کی اہمیت پر زور دیا گیا۔
- نشاۃ ثانیہ کے مؤرخین اسلوب، زبان، پیش کش اور ساخت کے لحاظ سے قدیم زمانے کے مورخین سے متاثر تھے۔ انہوں نے Polybius، Salust، Livy، اور Tacitus جیسے ادبی ماڈلز سے تحریک حاصل کی اور تاریخی توثیق کے ان کلاسیکی فریم ورک کو اپنا کر انسانی تاریخ کی موجودہ عہد وسطیٰ، بائبل پر مبنی تشریح کو بالواسطہ چیلنج کیا۔
- اس دور کا ایک اہم پیش رفت ذرائع کی تصدیق کے لیے علم اللسان (philological) متن کو تنقیدی طریقہ کاری کے لیے استعمال کرنا تھا۔ تاریخی جانچ کے اس عمل کو اکثر جدید تاریخی شعور میں اہم کردار ادا کرنے کا سہرا دیا جاتا ہے۔ دانشوران نے دیگر مبینہ طور پر "قدیم" متن کی صداقت کو جانچنے کے لیے اسی طرح کی تکنیکوں کا استعمال کیا۔ مزید برآں اس وقت کے مورخین نے مختلف تاریخی ڈیٹا پوائنٹس کے درمیان وجہ اور اثر کے تعلقات پر زور دیا، حالانکہ تمام مورخین نے مستقل طور پر اس نقطہ نظر کی پیروی نہیں کی، کیونکہ کچھ مورخین محض واقعات کو بیان کرنے سے مطمئن تھے۔
- انسانیت پرست دور میں تاریخی کوششوں کا بنیادی مقصد تدریسی تھا۔ انسانیت پرست مورخین نے تاریخ کی عملییت پر زور دیا، لوگوں کو قیمتی سیاسی اور اخلاقی اسباق دینے میں اس کی افادیت کی وکالت کی۔

1.5 اطالوی نشاۃ ثانیہ کے اہم مورخین (Important Historians of the Italian Renaissance)

اطالوی نشاۃ ثانیہ کے دوران دانشوران کی ایک بڑی تعداد تاریخ نویسی کی مشق میں مصروف تھے اور ماہرین تعلیم کی اس سے بھی زیادہ وسیع برادری نے اس میدان میں گہری پیشہ ورانہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ بقول ایرک کوچر کے 1415 سے 1615 کے عرصے میں کل 645 الگ الگ مصنفین نے ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام کیا جو اس دور میں تاریخ کے زمرے میں آتے تھے۔ ان تاریخی کاموں کے عملانے کے

پیچھے بہت سارے مقاصد کار فرما تھے، جیسے کہ خاندانی یا شہری تاریخی وراثت کا تحفظ، حب الوطنی اور پیشہ ورانہ اقداروں کا احساس۔ مندرجہ ذیل بحث میں ہم اس قدیم دور کے کئی ممتاز انسانیت پسندانہ مورخین کی زندگیوں اور کاموں کا جائزہ لیں گے۔

1.5.1 لیونارڈو برونی (Leonardo Bruni, c.1370–1444)

برونی کو ایک سر کردہ انسانیت پسند مورخ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، جس نے یہ امتیاز بنیادی طور پر اپنے قابل ذکر کام، ''فلورنٹائن کے لوگوں کی تاریخ'' (44–1442) کو قلمبند کرنے سے حاصل کیا۔ تاریخ نویسی کے دائرے میں برونی کے کارنامے واقعی غیر معمولی تھے۔ ان کے خیال میں تاریخ نے عناصر کے امتزاج کا مطالبہ کیا: ایک طویل اور باہم مربوط بیانیہ، ایک مخصوص واقعہ کا ایک سببی تجزیہ اور مختلف معاملات پر فیصلے کا عوامی اظہار۔ ان کی شراکت نے انسانی تاریخی تحریر کی رفتار کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے پہلے کاموں میں، برونی نے بڑے پیمانے پر کلاسیکی ذرائع کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ خاص طور پر 'ڈائیلاگ فار پیئر پاولو ورجیریو' (1401)، 'سیسرو نووس' (نیو سیسرو: 1415)، 'کمنٹری' (1419) اور 'ڈیل بیلو اٹالیکو' (1441) ان تحریروں کو اکثر مستند تاریخوں کے بجائے تراجم کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ تاہم یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ خود تاریخ کو ترجمے کی ایک شکل سمجھتے تھے، جس میں آزادی کے ساتھ بہت سے ذرائع استعمال کیے گئے تھے۔ ان کی تاریخی تحریروں کو 'مرکب تصور سازی' یا 'ڈیکسٹول مونٹیج' سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے تاریخ کو ایک ادبی صنف کے طور پر شمار کیا جسے بیانیہ کے طور پر بہترین انداز میں پیش کیا گیا اور جس کا مقصد علمی اور حب الوطنی تھا۔ وہ پہلا مؤرخ تھا جس نے انسانی تاریخ کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا: قدیم، درمیانی اور جدید دور۔ اس خیال کی ابتدا پیٹرارک سے ہوئی تھی، جس نے کلاسیکی اور اس کے بعد کے دور میں تفریق کیا۔ لیکن یہ برونی ہی تھا جس نے اسے ایک تاریخی شکل اور سیاق و سباق دیا۔

1.5.2 فلاویو بیونڈو (Flavio Biondo, 1392–1463)

بیونڈو ایک مورخ اور نوادرات (antiquarian) دونوں کے طور پر مشہور ہیں۔ اس کے زمانے میں مورخین کو ماہرین تعلیم کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جنہوں نے بنیادی طور پر سیاسی معاملات پر مبنی بیان بازی کی تاریخ کی ایک مخصوص شکل تیار کی۔ اس کے برعکس، نوادرات کو ایسے افراد کے طور پر شمار کیا جاتا تھا جنہوں نے بنیادی طور پر ماضی کے غیر ادبی آثار کو اکٹھا کیا اور عام طور پر اپنے تحریروں کو غیر معمولی اور غیر تنقیدی انداز میں تحریر کیا۔ بیونڈو نے مہارت کے ساتھ ان دونوں علمی کاموں کو اپنی تحریروں میں جوڑ دیا، جس سے رومن نوادرات میں ایک سنجیدہ علمی تحقیق کا آغاز ہوا۔

اپنے مشہور کام 'تاریخ' میں برونی نے 'تاریخی تعمیر نو کا قیاساتی ماڈل' قائم کیا، ایک ایسا تصور جس کو بیونڈو نے بھی کافی حمایت کی۔ بیونڈو کی ادبی شراکتیں تین قابل ذکر جلدوں پر محیط ہیں: *Roma Instaurata*، *Roma Triumphans* اور *Italia Illustrata*۔ یہ کتابیں 1474 میں شائع ہوئیں۔ پہلی دو جلدیں قدیم رومی فن تعمیر اور ادب سے وابستہ تھیں جس نے ایک صدی سے زائد عرصے تک کلاسک کاموں کے طور پر پہچان حاصل کی۔

تیسری جلد جو بیونڈو کے 18 اطالوی صوبوں کے وسیع سفر پر مبنی ہے، جدید اٹلی کی جغرافیہ اور تاریخ کا وسیع احاطہ کرتی ہے۔ بیونڈو کی تحریر کردہ ایک اور اہم تصنیف تھی *Decades of History from the Deterioration of the Roman Empire (1439–1453)*۔ یہ کتاب 1483 میں شائع ہوئی۔ اس کام میں بیونڈو نے یورپی تاریخ کی تگنا تقسیم کی تائید کی ہے۔ ان جلدوں میں، بیونڈو نے مستقل طور پر ماضی کی قدامت (the pastness of the past) کے تصور پر زور دیا۔ خیالوں اور افسانوں سے سچائی کو الگ کرنے کی وکالت کی اور اس بات پر زور دیا کہ قدیم نوادرات کو مذہبی تعظیم کی اشیاء کے بجائے تاریخی دستاویزات کے طور پر سمجھا جانا چاہیے۔

1.5.3 لوریزو والا (Lorenzo Valla, 1407–1457)

لوریزو والا وہ ایک بہت اہم اطالوی دانشور تھا جس نے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اس میں دو اہم شراکتیں کیں۔ سب سے پہلے اس نے تحریروں کی جانچ اور تنقید کا ایک طریقہ مرتب کیا۔ دوسرا اس نے تاریخ اس انداز میں لکھی جو زیادہ حقیقت پسندانہ تھی۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف *Discourse on the Forgery of the Alleged Donation of Constantine* (1440) تھی۔ اس میں لوریزو نے متن کی کھوج، تنقید اور تشریح پر زور دیا ہے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے 'کلاسیکی علمیات' کو قدیم متون سے آگے بڑھایا جس میں ماضی کے تمام پہلوؤں کو شامل کیا گیا جن سے اب ہم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لوریزو والا نے ایک منفرد انداز میں تاریخ کی تحریر میں حقیقت پسندی کو لایا۔ اس نے بادشاہ اور دربار کے بارے میں اپنی کہانیوں میں مزاح نگاروں لائی اور اس میں ایک قائل کرنے والی زبان کا استعمال کیا اور کہا "میں لوگوں کو یہ نہیں بتا رہا ہوں کہ انہیں کیا سوچنا چاہیے، بلکہ وہ اصل میں کیا سوچتے ہیں۔" ان کا ماننا تھا کہ تاریخ لکھنے کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ حقیقت کیا ہے، نہ کہ اس پر غیر ضروری بحث۔ اگرچہ اس نے اب بھی پرانے رومی مورخین کے کچھ طریقوں اور قائل تحریری اصولوں پر عمل کیا، تب بھی اُس نے لکھنے کا ایک مخصوص طریقہ ایجاد کیا اور یہ واضح کیا کہ تاریخ کو بھی جائز تفصیلات اور حقیقی ماحول کے دائرہ میں رکھا جانا چاہیے۔ نشاۃ ثانیہ کے فلسفے کی انسان پرستی اور انفرادیت پسندی سے لوریزو والا نے فلسفے کو مزید وسعت دی۔ اس نے اس کے لیے فلولوجیکل کے تنقید کے ذریعہ کا استعمال کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ مختلف ثقافتوں کی اپنی خاص خصوصیات ہوتی ہیں اور تاریخ لکھنے کا سلسلہ روکا نہیں جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے قدیم تحریروں کے متن کی سمجھ اور تشریح بہت ضروری ہے۔

1.5.4 نکولو میکیاویلی (Niccolò Machiavelli, 1469–1527)

نکولو میکیاویلی 16ویں صدی کے اوائل میں ایک اہم اطالوی (فلورنٹائن) سیاست دان، مورخ اور سیاسی فلسفی تھے۔ ان کا مشہور سیاسی مضمون 'دی پرنس' (*The Prince*) ہے۔ یہ کتاب سیاسی حقیقت پسندی کے لیے بہت مشہور ہوئی۔ اس نے دوسری کتابیں بھی لکھیں جیسے کہ *Discourses on Livy* جو ابتدائی رومی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ فلورنس کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس

نے اپنی تحریروں میں الوہی کارسازی کے بدلے میں انسانی جذبات اور خواہشات پر زور دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ لوگ تاریخ سے سبق سیکھ سکتے ہیں اور اس کے اسباق کو ہر کسی کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

1.5.5 فرانسکو گسیارڈنی (Francesco Guicciardini, 1483–1540)

فرانسیسکو گسیارڈنی میکیاولی کا ہم عصر ہی نہیں بلکہ اس کے خیالات کا مخالف تھا۔ وہ اپنی نسل کے مورخوں میں سے ایک تھا جس نے اطالوی ریاستوں کے زوال کا مشاہدہ کیا اور لکھا کہ اٹلی پر فرانسیسی حملے (16 ویں صدی) کی وجہ سے اٹلی بہت سیاسی افراتفری کا شکار ہو گیا۔ 1561 شائع ہونے والی ان کی سب سے مشہور کتاب 'ہسٹری آف اٹلی' کو نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔ اس کتاب میں اُس نے ذرائع کا محتاط جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں 1494 کے فرانسیسی حملے سے لے کر پوپ کلیمنٹ ہفتم کی 1534 میں موت تک کے واقعات درج ہے۔ اس کے شائع ہونے کے فوراً بعد، لوگوں نے اس کا موازنہ قدیم روم کے عظیم مورخین سے کیا، جو کہ نشاۃ ثانیہ کے ایک مورخ کی بہترین تعریف تھی۔ اسے اطالوی انسانیت پسندانہ تاریخ لکھنے کی بہترین مثال کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔

میکیاولی کی طرح گسیارڈنی کا خیال تھا کہ مستقبل کی پیشین گوئی کرنا ممکن ہے کیونکہ دنیا ہمیشہ سے ایک غیر مغیر رہی ہے۔ تاہم اس کا یہ بھی ماننا تھا کہ مستقبل میں جس طرح سے واقعات رونما ہوں گے وہ اس قدر متنوع، فریبی اور غیر یقینی ہوں گے کہ عقلمند لوگ بھی اس کا درست اندازہ نہیں لگا سکیں گے۔ گسیارڈنی کی سوچ میں تاریخیت کے بارے میں کچھ سوالات تھے۔ اس کے عالمگیر انسانی فطرت کا وجود اور گردشی تاریخ ہمیشہ ایک سوالیہ تھے۔

وہ اس بارے میں بھی فکر مند تھے کہ آیا تاریخ قیمتی سبق فراہم کر سکتی ہے۔ اپنے وقت کے بہت سے انسانیت پسند مورخین کے برعکس، گسیارڈنی نے اپنے تاریخی تحریروں میں حکمرانوں کو ظالم کرداروں کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی تحریروں کی خصوصیت اس بات میں مضمر تھی کہ خالی ایک ماخذ کے بدلے اُس نے متعدد ذرائع کو استعمال میں لایا۔ ان کا مقصد تاریخی واقعات کے لیے ایک عقلی اور جامع سیاق و سباق فراہم کرنا تھا تاکہ ان کی بہتر وضاحت ہو سکے۔ انہوں نے تاریخی تصورات اور طریقوں میں اہم تبدیلیاں لائیں، حالانکہ وہ مؤرخ کے طور پر انسانی سوچ کے طریقے کی پیروی کرتے تھے۔

1.6 تاریخ نویسی کا کارٹیشین مکتب فکر (Cartesian School of Historiography)

تاریخ نویسی کا کارٹیشین مکتب فکر، تاریخی مطالعات کا ایک نیا مکتب فکر تھا جو 17 ویں صدی کے دوسرے حصے میں ابھرا۔ اس مکتب کے مورخین نے تحریری یادستاویزی ماخذ کی کھوج اور تنقید پر بہت زور دیا۔ فرانسیسی کلیسائی مورخ ٹلیمونٹ (Tillemont, 1637–1688) نے کرسچن چرچ کی تاریخ لکھی، اس روایت کے وہ نامور مورخ تھے۔ اپنی دوسری کتاب *The History of the Roman Emperors* میں اس نے بہت سارے حکمرانوں کے بارے میں لکھے گئے متضاد دعوؤں میں ہم آہنگی لانے کی کوشش کی۔ مزید برآں اس نے اپنی داستان میں تاریخی واقعات کی صداقت پر بہت زور دیا۔ اس طرح یہ یورپ میں اس نوعیت کا پہلا تاریخی کام تھا۔

متعدد مؤرخین اور فلسفیوں نے کارٹیشین اسکول کے مورخین کے نقطہ نظریہ اور طریقہ کار کی مخالفت کی، گیامبٹیسٹا وِکو (Giambattista Vico, 1668–1744)ایک بااثر اطالوی فلسفی اور مورخ تھا۔ وہ ویکو نیپلز یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔اُس کی پیدائش بھی نیپلز میں ہوئی تھی۔ان کی معروف کتاب ”La Scienza Nuova“ (The New Science) 1725 میں شائع ہوئی۔اس نے تاریخ نویسی میں ایک اہم تبدیلی کی نشاندہی کی۔اُس نے لکھا کہ یورپ کے مورخین ماضی کو کس طرح دیکھتے تھے۔وہ یورپ کا پہلا مفکر تھا جس نے تاریخ کو باقاعدہ ایک سائنس کے مضمون کے طور پر پیش کیا اور اس کو موضوع بات کا درجہ دے دیا۔

ویکو کو جدید یورپی تاریخ کے فلسفے کے بانی کے طور پر دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس نے عہد وسطیٰ کی روایات کو توڑ دیا۔اس نے تاریخ کو سمجھنے کے لیے زیادہ سیکولر نقطہ نظر سے کام لیا۔آگسٹین کے برعکس جس نے تاریخ کو صرف الوہی نظریہ سے دیکھا۔ویکو نے اس کو دونوں الوہی اور انسانی پہلوؤں سے احاطہ کیا۔اس کا خیال تھا کہ انسانی تاریخ ایک مخصوص عمل ہے جو نہ الوہی عنصر بلکہ انسانی فطرت اور استدلال کی وجہ سے وجود میں آئی۔ویکو کے مطابق، خدا نے انسانی ترقی کی نگرانی کی اور تاریخ اس ترقی کی کہانی تھی۔ویکو نے کہا کہ انسانیت آہستہ آہستہ زیادہ مہذب ہوتی گئی اور خدا کی مدد سے بربریت پر قابو پالیا۔اس نے تاریخ کے فطری قوانین کو تلاش کرنے کی بھی کوشش کی، جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ انسانی فطرت میں الوہی ہاتھ ہے۔اگرچہ ویکو کی بنیادی توجہ انسانوں پر تھی،اس نے تاریخ کے اپنے فلسفہ میں الٰہی اور انسانی نظریات کو ملایا۔اُس نے اس بات کا بھی مطالعہ کیا کہ انسانی تہذیبوں کا آغاز، ارتقا اور اداروں کی تعمیر کب اور کیونکر ہوئی۔اسی وجہ سے اُس کی تاریخ کو سماجی تاریخ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔واقعی ویکو کے خیالات سماجیات اور تاریخ کو جوڑتے ہیں۔ویکو نے انسانی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کا ایک نیا طریقہ نکالا۔

- وہ، الوہی دور (divine age) کو انسانی تاریخ کا پہلا دور مانتا ہے۔اس دور میں حکومتی نظام مذہب پر مبنی تھا، خاندان ایک اہم سماجی ادارہ تھا۔البتہ اس دور میں انسانی سوچ ناپختہ تھی۔وہ صحیح اور غلط میں فرق نہیں کرپاتے اور حیوانیت جیسے نقصان دہ کام کرتے تھے۔لوگ استدلال کی صلاحیتوں سے کافی دور تھے۔
- دوسرا دور جسے بہادروں کا دور (heros' age) کہا جاتا ہے،اس دور میں لوگ گاؤں سے شہر منتقل ہو گئے، جس سے نئے نئے شہر وجود میں آئے۔بھلے ہی اُن کی تعلیم اصلی تعلیم نہیں تھی۔
- تیسرا دور انسانی یا تہذیب یافتہ دور (مردوں کا دور) تھا جو انسانی استدلال کی مکمل ترقی اور عقلی علم کے بدولت ایک نمایاں دور بن گیا تھا۔البتہ اس دور میں بھی علمی عقل کی کمی تھی۔

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ تاریخ کو تقسیم کرنے کا ویکو کا طریقہ بنیادی طور پر یورپی معاشروں پر مرکوز تھا اور غیر یورپی ممالک کے دائرے سے بالکل باہر تھا۔ویکو کے بعد بہت سے دوسرے مفکرین نے کارٹیشن کے خیالات پر سوال اٹھائے۔ان میں سے کچھ مفکرین میں ڈیوڈ ہیوم (David Hume) شامل تھے، جو اسکاٹ لینڈ میں 18ویں صدی کے فلسفی، ماہر اقتصادیات اور مورخ تھے۔اس فہرست میں برطانوی روشن خیال فلسفی جان لاک (John Locke) اور جارج برکلے (George Berkeley) بھی شامل تھے۔برکلے

اور لاک دونوں نے فلسفے میں اہم شراکت کی اور لاک نے سیاسی فلسفے پر بھی اثر ڈالا۔ ہیوم جس نے سکاٹش روشن خیالی، فلسفہ، معاشیات اور تاریخ کے ارتقاء میں ایک اہم کردار کا کام کیا۔ اس نے 'انگلینڈ کی تاریخ' نام سے ایک کتاب لکھی جس میں لاک نے جولیس سیزر کے زمانے سے لے کر 1688 کے انگریزی انقلاب تک کا تاریخی احاطہ کیا۔ اسی طرح سے ہیوم کی قابل ذکر شراکت یہ تھی کہ اس نے سیاسی اور عسکری تاریخ کے ساتھ فکری اور سائنسی تاریخ کا آغاز کیا۔ دوسرے مورخین کے لیے علمی کشش کی وجہ بن گئی۔ حالانکہ مورخین نے اس پر پہلے ہی توجہ مرکوز کی تھی۔

1.7 اطالوی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کی حدود

(Limitations of the Italian Renaissance Historiography)

جدید تاریخ نویسی کا آغاز اطالوی انسانیت پسند تاریخ نویسی سے ہوا، لیکن ان کے نقطہ نظر میں کچھ حدود یں تھیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

- مورخین کی ایک حد بندی یہ تھی کہ وہ کیا لکھ سکتے تھے، کیونکہ نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی میں 'مواد کا بحران' تھا۔ انسانیت پرست مورخین صرف سیاسی اور عسکری موضوعات کا مطالعہ کر رہے تھے، جبکہ اس میدان میں کوئی کام ہی نہیں ہوا تھا۔ نتیجتاً برونی نے فلورنس کے مینوفیکچرنگ اور بینکنگ کے شعبوں کا اپنی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح میکیاولی اپنی تاریخ میں جنگوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مزید برآں انسانیت پرست تاریخ نویسی میں اکثر ملحقہ علمی کاموں کو نظر انداز کیا گیا جب کہ وہ سوانحی تحریروں، نوادرات اور مقدس تاریخی مضامین سے آراستہ تھیں۔
- اس دور میں زیادہ تر مورخین صرف ایک اہم ماخذ پر بھروسہ کرتے تھے۔ وہ ہر اس بات پر یقین رکھتے تھے جو کسی مخصوص مورخ نے لکھا تھا۔ یہ صرف گسیارڈنی کی وجہ سے ممکن ہو پایا کہ مورخین نے تاریخ لکھنے کے لیے ایک سے زائد ذرائع کا استعمال شروع کیا۔
- نشاۃ ثانیہ کے دور میں مورخین 'کیوں'، 'کب' اور 'کہاں' کے سوالوں میں الجھے ہوئے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ سب کچھ اضافیت (relativism) پر مبنی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ انسانی فطرت بڑی حد تک ناقابل تغیر ہے۔ مزید برآں 'لکیری تبدیلی'، 'گردشی تاریخ' کا حصہ نہیں مانا جاتا تھا۔ لہٰذا نشاۃ ثانیہ کے دوران انسانی تاریخ کا احاطہ اِسی جیسی حد بندیوں سے دوچار تھی۔
- اگرچہ انسانیت پسندوں نے لامذہبیت، حقیقت پسندی اور انفرادیت کے موضوعات کو زیر غور لایا۔ ان کا عالمی نظریہ اب بھی عہد وسطیٰ کے تصورات سے ملتا جلتا تھا۔ مورخین کی اکثریت نے اِسی جیسے عقیدے کو تاریخ بیان بازی کا ایک حصہ سمجھا اور اس عقیدے میں مادہ سے زیادہ شکل، حقائق، گرائمر اور تجرباتی تحقیق جیسے قدروں کو ہی اپنایا۔
- مؤرخین نے امیروں اور طاقتور ہستیوں اور خاندانوں کی تاریخ کو ایک مثبت انداز میں پیش کیا اور اپنی تحریروں کو حکومتی مفادات کے زمرے کے اندر ہی زیر بحث لایا۔
- آخر میں اٹلی کی انسانیت پسند تاریخ نویسی بہت ساری محدودات کا شکار ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے تاریخ نویسی نامکمل رہ گئی تھی۔

1.8 اطالوی نشاۃ ثانیہ سے آگے (Beyond the Italian Renaissance)

انسانیت پسندانہ تاریخ نویسی کا آغاز اٹلی سے ہوا اور بعد میں یورپ میں پھیل گیا۔ 1480 اور 1490 کی دہائیوں میں، کچھ با اثر فرانسیسی مفکرین نے تاریخ کے اس نئے اطالوی انداز کو اپنا لیا۔ رابرٹ گیگوئن (Robert Gaguin, 1433–1501) نے 1488 میں اطالوی نقطہ نظر کا استعمال کرتے ہوئے فرانس کی تاریخ کے بارے میں لکھا۔ تھامس مور (1478-1535) نے 1513 میں رچرڈ III کی تاریخ لکھی، جو ممکنہ طور پر انگلینڈ میں انسانیت پسند تاریخ نویسی کی پہلی مثال تھی اور وہ اطالوی انسانیت پسند نظریات سے بھی متاثر تھی۔ 1501 میں اطالوی دانشور پولیڈور ورگل (Polydore Vergil, 1470–1555) انگلینڈ آئے اور انگلینڈ کی ایک تاریخ لکھی، جو 1534 میں شائع ہوئی۔ اس کا نقطہ نظر برونی کی طرح تنقیدی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تاریخ کا ایک تعلیمی مقصد تھا، کیونکہ اس نے لوگوں کو پیروی کرنے کی مثالیں فراہم کیں، غلط کاموں کی حوصلہ شکنی کی اور اسے عوامی تنقید کے سامنے لایا اور یہاں تک کہ اس خیال کو چیلنج کیا کہ انگریز ٹروجن سے آئے تھے۔ سپین میں جوآن لوئس ویویس (Yuan Luis Vives, 1492–1540) جو مشہور انسانیت پرست مورخ ہیں، نے تاریخ کی تمام اقسام کی قدر اور ان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انہیں اپنے انسائیکلوپیڈیا میں شامل کیا۔ انسانیت پرست دانشورانہ روایت جرمنی اور مشرقی یورپ کے کچھ حصوں میں بھی پھیل گئی، اور یہ یورپی آباد کاروں کی آمد کے ساتھ بحر اوقیانوس (Atlantic) کے پار بھی چلی گئی۔

1.9 فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی (The French Renaissance Historiography)

سولہویں صدی کے دوران فرانس میں ایک اہم پیشرفت ہوئی جس نے تاریخ نویسی کو قانون کے شعبے سے جوڑ دیا۔ تازہ تاریخی تصورات پیش کرتے ہوئے، فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی نے اس عرصے کے دوران اطالوی انسانیت پرست تاریخ نویسی کی کچھ خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ماضی کی تعریف اور ماضی کے واقعات کو زیادہ صحیح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جدید تاریخ نویسی کی ترقی کے لیے حالات غیر موزوں تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے مفکرین نے خود شعوری طور پر قدیم ماضی کا حوالہ دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عہد وسطیٰ کو نظر انداز کرکے اور ان کی تذلیل کرتے ہوئے، وہ اکثر زمانہ قدیم کو زندہ کرنے کے حوالے سے سوچتے تھے۔ سولہویں صدی کے فرانسیسی قانونی انسانیت پرستوں نے اسلاف کے غیر متنازعہ اختیار، شرافت اور برتری پر سوال اٹھاتے ہوئے باریکیوں کو متعارف کرایا۔ لوریزو والا، ایک اطالوی انسان دوست، نے قانونی انسانیت کے ابتدائی دنوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس نے رومی قانون پر تحقیق کی، جس کا مقصد عہد وسطیٰ کے اثرات کو دور کرنا اور اسے اس کی اصل شکل میں بحال کرنا تھا۔ اس تحریک نے رومی قانون کو اس کی خالص اور غیر ملاوٹ والی حالت میں واپس لانے کی کوشش کی۔ کئی فرانسیسی دانشوران، جن میں گلاؤمی بوڈے (Guillaume Bude)، اینڈریا السیاٹو (Andrea Alciato)، لوئس لے روئے (Louis Le Roy)، جیکس کجاس (Jacques Cujas)، فرانکوئس بوڈین (Francois Baudouin)، فرانکوئس ہاٹمین (Francois Hotman)، جین بوڈین (Jean Baudouin)، اور اتینے پاشر (Etienne Pasquier) شامل ہیں، نے اس کوشش میں اہم تعاون کیا۔ انہوں نے قدیم یونانی اور رومی قوانین کی اصل

زبان اور مواد کو سمجھنے اور ان کا اپنی ہم عصر ریاستوں کے قوانین سے موازنہ کرنے کے لیے تندہی سے کام کیا۔ ان میں سے کچھ معزز مورخین بھی تھے۔ باؤڈین رومی قانون کے سب سے بڑے مؤرخ کے طور پر سامنے آیا جب کہ پاسکوئیر کا کام، 'فرانس پر تحقیق' (1560 (Researches on France, تھی۔ یہ کتاب سیاست، قانون، مذہب اور چرچ جیسے موضوعات کا آئینہ تھی۔ ان دانشوران نے قدیم اور جدید معاشروں میں قانون کے مختلف کرداروں کا جائزہ لیا۔ ان کا استدلال تھا کہ فرانس رومن حکمرانی کے تحت نہیں ہے اور فرانسیسی بادشاہت کی تعمیر رومی قانون کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ نتیجتاً، وہ رومی قانون کو جدید حکومتوں کے لیے غیر متعلق سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی زور دے کر کہا کہ قوانین وقت کے ساتھ ساتھ اور مختلف خطوں میں ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ تمام قوانین تاریخی حالات اور لوگوں کے بدلتے ہوئے رسم و رواج اور حالات سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس تحریک نے مخصوص تاریخی سیاق و سباق میں قانون، ثقافت اور انفرادیت پر زور دیا اور اطالوی انسانیت کے وسیع اصولوں کے اندر ہی اپنی تحریروں کو شکل دے دی۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں، تاریخ اور قانون میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئی۔ جیسے ثبوت، شہادت، دلیل، گواہی اور گواہ ان کی پائیدار اصطلاحات تھیں۔ اس دوران مورخین نے بھی ''منصف'' جیسا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ فرانسیسی 'تاریخی اسکول آف لاء' نے جدید تاریخی سوچ میں اہم شراکت کی۔ ان خیالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے، آیئے سولہویں صدی کے فرانس کے تین اہم فلسفیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

1.9.1 جین بودن (Jean Bodin, 1530–1596)

ایک مشہور فرانسیسی مفکر، وکیل اور مصنف جین بوڈین نے اپنی زندگی کے دوران تاریخی طریقہ کار میں اہم شراکت کی۔ 1566 میں اس نے *Methodus ad Facilem Historiarum Cognitionem* شائع کی، جو اس میدان میں ایک قابل ذکر تصنیف ہے۔ بوڈین نے 1576 میں اپنی کتاب 'The Republic' اور 'Art History' (فنی تاریخ) کو منظر عام پر لایا جس سے اس کو پورے یورپ میں پہچان حاصل ہوگئی۔ اپنی تحریروں میں بوڈین نے بظاہر مخالف مکاتب فکر جیسے افلاطون کے آئیڈیلزم اور ارسطو کے تجربات، آفاقی اصول، انفرادی مخصوص نظریات، فلسفہ اور الہیات، استنباطی اور دلکش استدلال، انسانیت اور قانون جیسے مختلف مضامین کی ہم آہنگی کو ممکن بنایا۔ اس حوالے سے ان کا موازنہ بیکن اور ویکو جیسے بعد کے عظیم مفکرین سے کیا جا سکتا ہے۔ بوڈین نے تاریخ نویسی کو علم کی سب سے اہم اور اعلیٰ شاخ کا درجہ دیا۔ ان کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

- ماضی میں ایک عقیدہ تھا کہ تاریخ دائروں یا گردش میں دہرائی جاتی ہے اور لوگوں کا خیال تھا کہ انجیل میں پائی جانے والی دانیالؑ کی پیشین گوئی کی وجہ سے انسانیت کمزور پڑ رہی تھی، تاہم بوڈین نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ ماضی بعید میں، نام نہاد عہد زریں میں، لوگ کھیتوں اور جنگلوں میں جنگلی جانوروں کی طرح رہتے تھے، صرف وہی چیز رکھتے تھے جو وہ طاقت یا جرم کے ذریعے لے سکتے تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ، وہ زیادہ مہذب ہوگئے، جس کی وجہ سے آج کا ایک منظم معاشرہ وجود میں آیا۔ بوڈین وقت کے ساتھ ترقی پر یقین رکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ سنہری دور سے بدتر حالت میں جانے کا خیال مضحکہ خیز تھا۔ اس نے یہ بھی دلیل دی کہ قدیم زمانے میں ہر کوئی تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ کچھ جاہل اور ظالم تھے۔ اس نے سوال کیا کہ گھڑیوں اور پرنٹنگ کے بغیر

وقت کو اس کے اپنے وقت سے زیادہ ترقی یافتہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے جس میں وہ چیزیں موجود تھیں۔ اس نے آب و ہوا کو بھی انسانی ترقی کا حصہ بنایا۔ اُس نے زوال کے تصور کو مسترد کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا اپنا وقت ماضی سے کمتر نہیں تھا۔ اگرچہ اس کا ترقی کا خیال شاید بعد کے مفکرین کی طرح جرات مندانہ نہیں تھا۔

- ماضی میں بوڈن ابتدائی انسانوں کے الفاظ کے استعمال کے طریقے سے متفق نہیں تھے اور دلیل دیتے تھے کہ یہ کسی ایسے شخص کے لیے بہت مشکل کام ہے جو تفریح اور سچ کہنے کے لیے لکھتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مورخین کو غیر جانبدار رہنے کے لیے اپنے ملک کے بارے میں لکھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ تاریخی ذرائع کا فیصلہ کرنے کے لیے، انہوں نے ابتدائی نشاۃ ثانیہ کے دوران تیار کردہ طریقوں کو استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔
- بوڈین نے حقیقت پر مبنی انسانی، قدرتی، الٰہی جیسی تاریخی مضامین کو زیر بحث لایا۔ بعد میں Vico نے اپنے تاریخی نظریات میں ان مضامین پر مزید تفصیلی توسیع کی۔
- بوڈین نے مورخین کو مشورہ دیا کہ وہ ان اقوام کی تاریخوں کو مد نظر رکھیں جو گریکو رومن محور کا حصہ نہیں تھیں۔ انہوں نے امریکہ، ایشیا اور افریقہ کی تاریخوں کی بھی قدر کی۔ غیر یورپی علاقوں کے فاتحین، تاجروں اور مسافروں سے حاصل شدہ علم کو بھی تاریخ نویسی کا حصہ بنایا۔
- جب بوڈین نے کہا کہ ہمیں قدیم تحریروں کا مطالعہ ان کے زمانے کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھتے ہوئے کرنا چاہیے اور انہیں آج کے معیارات سے پرکھنا نہیں چاہیے، تو وہ تاریخیت کے ابتدائی ورژن کو فروغ دے رہے تھے۔ وہ ایک "رواداری تاریخی ازم" پر یقین رکھتے تھے جس کے لیے چیزوں کو سمجھنے کے لیے ایک مخصوص سیاق و سباق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے اختراعی نظریات کے باوجود بوڈین نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی میں اصول پسندی کی کمی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخ کی اہمیت معاشرے اور اس کے شہریوں کی اخلاقیات کو فروغ دینے میں مدد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

1.9.2 رینے ڈیکارٹس (Rene Descartes, 1596–1650)

رینے ڈیکارٹس (Rene Descartes, 1596–1650) ایک فرانسیسی مفکر اور ماہر طبعیات تھے۔ اُس کو جدید فلسفے کا بانی مانا جاتا ہے۔ باوجود اس کے بہت سارے مورخین اُس کی سوچ کو منفی انداز میں لیتے ہیں۔ بقول ڈیکارٹس تاریخ تب تک مکمل اور صحیح نہیں ہو سکتی ہے جب تک ماضی کے واقعات کو اُن کے اصل پس منظر میں نہیں دیکھا جائے گا۔ اسی طرح تاریخ نویسی میں حقیقت پسندی کا فقدان اس لیے ممکن نہیں کیونکہ ماضی کے واقعات مبالغہ آمیز کہانیوں پر مبنی ہیں۔ یہی وجوہات کی بناء پر وہ تاریخ کو علم کا ایک قابل اعتماد شعبہ نہیں سمجھتا تھا۔ تاریخ پر ڈیکارٹس کی تنقید کو "تاریخی شکوک وشبہات" ('Historical Skepticism') کی اصطلاح میں دیکھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اُس کی تاریخی سوچ قدیم یونانی فلسفیوں کی سوچ سے الگ نہیں تھی۔ بقول اُس کے تاریخ ہمیں ماضی میں ہونے والی چیزوں کے بارے میں یقینی اور بلاشبہ علم نہیں دے سکتی۔

1.9.3 لاپوپلینیئر (La Popeliniere, 1541–1608)

سولھویں صدی میں ایک فرانسیسی مصنف لاپوپلینیری نے فرانس میں جدید تاریخی فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔اس نے 1571 میں ''فرانس کی تاریخ'' (*The History of France*) شائع کرکے ساتھی ہیوگینٹ پروٹسٹنٹ (Huguenot Protestants) کو کافی پریشان کیا، جن سے اس کا تعلق تھا۔''تاریخ کی تاریخ'' (*History of Histories*) میں لاپوپلینیری نے متعلقہ فریقوں کی طرف سے خطرات کا سامنا کرنے کے باوجود پرفیکٹ ہسٹری کا آئیڈیا (Idea of Perfect History) دیا اور ''فرانس کی نئی تاریخ کا خاکہ'' (*Outline for a New History of France*) بھی معروضیت کے ساتھ پیش کیا۔ان کا خیال تھا کہ ایک مورخ کو بے خوف، غیر متعصبانہ اور آنے والی نسلوں کے مسائل کو سنوارنے کے لیے لکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے کام منصفانہ طریقے سے انجام لائے۔

لاپوپلینیئر کی معروضیت اس حقیقت سے نمایاں ہوتی ہے کہ اُس نے اپنے ذاتی عقیدے کو تاریخ کے زمرے میں نہیں لایا، بلکہ مذہبی تنازعات سے منسلک جتنی بھی خرابیاں تھی، اُن کو غیر متعصبانہ طریقے سے مذمت کی، جیسا کہ آگ زنی، لوٹ مار، موت اور عصمت دری وغیرہ۔اس نے تاریخ کو مذہبی اثرات سے پاک کرنے اور تاریخی تحریر کو غیر جانبدار بنانے کی بھرپور وکالت کی، جو کہ تاریخ میں مذہبی تعصبات کے خلاف ایک سخت احتجاج تھا۔

اسی طرح سے لاپوپلینیر نے قدیم مورخین کے اختیار کو مسترد کر دیا۔اس نے رومن مورخین پر تنقید کی کہ وہ حکمرانوں پر بہت زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں اور اُن کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔اس نے یونانی مورخین کو اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا کیونکہ انہوں نے سطحی علوم کے بنیادوں پر مقامی تاریخ لکھیں۔ان کا خیال تھا کہ ایک کامیاب مورخ کے لیے حقیقت کو پرکھنا ضروری ہے اور ساتھ ہی اس کا غیر متعصبانہ رویہ تاریخ نویسی کے لیے لازمی ہے۔اُن کو عینی شاہدین کے بیانات پر انحصار کرنا چاہیے۔ حالانکہ ''کامل تاریخ'' (perfect history) کو لکھنا تب بھی ناممکن ہے۔ایک مورخ کی کامیابی کا راز اس بات پر مضمر ہے کہ تاریخی واقعات کو کتنی مرتبہ پڑھے، پرکھے اور تحریر کرے اور وہ کس حد تک اپنے ہدف کو مکمل کر پائے۔

1.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

نشاۃ ثانیہ نئی سوچ کا دور تھا جو اٹلی میں 14 ویں صدی میں ابھرا اور 17 ویں صدی کے اوائل تک جاری رہا۔اس دوران لوگوں نے قدیم روم کے نظریات، اداروں اور ثقافت کی تعریف کی اور اس کا جشن منایا۔اس تحریک نے فن میں نمایاں پیش رفت کی، جیسے کہ مصوری، مجسمہ سازی، فن تعمیر، ادب اور تاریخ۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران ایک خاص قسم کی تاریخ لکھنے کو "انسانیت پرست ہسٹوریو گرافی" کہا جاتا ہے۔پہلے پہل مورخین اپنی معلومات کے لیے رومن متن پر انحصار کرتے تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ، انہوں نے مختلف کتابوں حتیٰ کہ قدیم نمونے کو بطور ماخذ استعمال کرنا شروع کیا۔تاریخ کے بارے میں یہ نقطہ نظر Flavio Biondo کے کاموں میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ

خاص طور پر Guicciardini کی تحریروں میں قابل ذکر ہے، جس نے اسے اپنا طریقہ بنایا۔ متن کی تنقید بھی اسی عملی تحریک کا حصہ تھی۔اس سے مورخین کو اپنی معلومات کی درستگی کو یقینی بنانے میں مدد ملی۔لوریزو والا (Lorenzo Valla)، جس نے تاریخی تکنیک کی ترقی میں بہت زیادہ تعاون کیا، نے تاریخ کے مطالعہ کا ایک نیا طریقہ شروع کیا۔انجیلو پولیزیانو(Angelo Poliziano)نے بھی اپنے پیروکاروں کے اسی جیسے نقطہ نظر کو آگے بڑھایا اور اُس نے کہا کہ کسی کام کی قدیم ترین صورت(version)سب سے زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہے۔سولہویں صدی کی دہائی کے وسط تک، لوگوں نے 'اصل ماخذ'(original source)کے خیال کی قدر کرنا شروع کر دی۔ نشاۃ ثانیہ تحریک تمام خطوں کی الگ الگ تاریخ اور نظریات کا مجسمہ تھا، جس کے نتیجے میں سوچ کے نئے طریقے پیدا ہوئے۔ مورخین نے نوادرات اور دانشوروں نے عمومیات پر مخصوص تفصیلات کو ترجیح دے کر، تاریخی درستگی اور معروضیت پر زور دے کر تاریخی حقائق سے پردہ اٹھایا اور مختلف اوقات و مقامات کے درمیان امتیاز پیدا کیا۔اس عرصے میں، مستوی ارتقا(linear progress)کا تصور ابھرا جس نے عہد وسطیٰ کی گردشی تاریخ(cyclical History)کے نظریے کو چنوتی دی۔مزید برآں انسانی ترقی کا لکھنا ممکن ہو پایا جس نے انسانی معاملات میں الوہی غلبے کی جگہ لی۔انسانیت پرستی، لامذہبیت، انفرادیت اور حقیقت پسندی جیسے نئے نظریات آہستہ آہستہ ابھرنے لگے۔

اگرچہ نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی نے تمام جدید تاریخی تصورات کی پیش بندی نہیں کی، لیکن اس نے اس سمت میں کافی اہم پیشرفت کی۔کچھ عہد وسطیٰ کے نظریات، جیسے گردشی تاریخ، اور انسانی(human)اور الوہی(divine) رشتے کو الگ الگ طریقے سے دیکھنے پر زور دیا گیا۔حالانکہ تاریخی معروضیت کو فروغ حاصل ہوا، لیکن ابھی تک اس کے حصول کے طریقے ناکافی تھے۔

1.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

نشاۃ ثانیہ	:	یورپی تاریخ میں 15ویں صدی میں پنپنے والا ایک نیا علمی دور جس میں جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کو مقبولیت حاصل ہوئی۔
تحریک اصلاح	:	یورپی تاریخ میں پوپ اور چرچ کی اجارہ داری کے خلاف ایک نئی تحریک جس کا مقصد مذہب کو ایک ذاتی مسئلہ بنانا اور چرچ کے غلبے کو کمزور کرنا تھا۔

1.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

1.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. نشاۃ ثانیہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟
2. انسانیت پرست تاریخ نویسی پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. قدیم تواریخ کیا ہیں؟
4. پیٹرارک کا نظریہ انسان دوستی کی وضاحت کریں۔

5. نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی میں Flavio Biondo کی شراکت کے بارے میں لکھیے۔
6. نکولو میکیاولی کے بارے میں ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
7. Francesco Guicciardini کے خیالات کا جائزہ لیں۔
8. رینے ڈیکارٹس کا تاریخی شکوک کیا ہے؟
9. فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی میں لا پو پلینیری کا کیا تعاون ہے؟
10. اٹلی سے یورپ کے مختلف حصوں میں انسانیت پسند تاریخ نویسی کے پھیلاؤ کی وضاحت کریں۔

1.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مکار ٹیشین، سکول آف ہسٹوریو گرافی کی مختصر وضاحت کریں۔
2. اطالوی نشاۃ ثانیہ کے مورخین لیونارڈو بروِنی اور لوریزو والا کے اہم خیالات کیا تھے؟
3. جین بوڈین کی تاریخ نویسی کے اہم نکات کیا ہیں؟
4. فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کے کسی دو تاریخی فلسفیوں کی شراکت کے بارے میں لکھیے۔
5. تاریخ نویسی میں فرانسیسی قانونی انسانی ماہرین کی شراکت کی وضاحت کریں۔

1.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اطالوی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیں۔
2. اطالوی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کی حدود کیا تھیں؟
3. فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کے بارے میں لکھیے۔

1.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Burke, Peter, *The Renaissance Sense of the Past*, St. Martin Press, New York, 1969.
2. Cochrane, Eric, *Historians and Historiography in the Italian Renaissance*, The University of Chicago Press, London, 1981.
3. Nair, Ashu J. and Srotoswini Borah, *History and Historiography: From Ancient to Modern World*, Rohan Vij, Delhi, 2018.
4. Sreedharan, E., *A Textbook of Historiography, 500 B.C. to A.D. 2000*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
5. Upadhyay, Shashi Bhushan, *Historiography in the Modern World: Western and Indian Perspectives*, Oxford University Press, Delhi, 2016.

اکائی 2۔روشن خیالی کی وراثت

(Legacy of the Enlightenment)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 روشن خیالی کیا ہے؟

2.3 روشن خیال تاریخ نویسی

2.3.1 مونٹیسکوئیو

2.3.2 والٹیئر

2.3.3 ڈیوڈ ہیوم

2.3.4 ڈیڈروٹ اور رینل

2.3.5 جین ڈی ایلمبرٹ

2.3.6 ٹورگٹ

2.3.7 ولیم رابرٹسن

2.3.8 کیتھرین میکالے

2.3.9 ایڈورڈ گبن

2.3.10 کنڈورسیٹ

2.4 روشن خیال تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات

2.5 اکتسابی نتائج

2.6 کلیدی الفاظ

2.7 نمونہ امتحانی سوالات

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

روشن خیالی، جو مغربی فکری تاریخ کا ایک اہم دور ہے، نے جدید سوچ کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ روشن خیال مفکرین نے روایتی نظریات کو چیلنج کیا اور اہم سوالات کے جوابات خود فراہم کیے۔ اگرچہ ان میں اختلافات تھے لیکن ان میں مشترکات بھی تھیں۔ یہ تحریک یورپ، شمالی امریکہ اور اس سے آگے تک پہنچی اور ان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ تقریباً تین صدیوں تک، تیز رفتار تبدیلیوں جیسے انقلابات، صنعت کاری، غیر صنعت کاری، نوآبادیات اور ڈی کالونائزیشن پر اثرانداز رہی۔ آج بھی مابعد جدیدیت کی مخالفت کے باوجود اس کا اثر برقرار ہے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- روشن خیالی اور تاریخی فلسفہ کی ترقی پر اس کے اثرات۔
- روشن خیالی کی تاریخ نویسی اور اس کی حامیوں۔
- روشن خیالی کی ثقافت اور فلسفہ۔
- روشن خیالی کے مورخین اور ان کی تاریخ نویسی۔
- روشن خیالی کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات۔

2.2 روشن خیالی کیا ہے؟ (What is Enlightenment?)

لفظ 'روشن خیالی' کے مختلف معنی ہیں اور یہ 17ویں صدی کے آخر سے 18ویں صدی کے آخر تک فکر کے مختلف ادوار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کچھ لوگ اس کی ابتدا بیکن اور ڈیکارٹس جیسے مفکرین سے کرتے ہیں۔ دوسرے اسے انگریزی انقلاب (1688)، امریکی انقلاب (1776) اور فرانسیسی انقلاب (1789) جیسے اہم واقعات سے جوڑتے ہیں۔ تاہم، زیادہ تر علماء اسے 18ویں صدی سے جوڑتے ہیں اور لاک، نیوٹن اور بیل کو اس کے ابتدائی حامی مانتے ہیں۔

18ویں صدی میں، یورپ نے ایک اہم تحریک کا ظہور دیکھا جسے روشن خیالی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ابتدائی طور پر، یہ زیادہ تر یورپ، خاص طور پر فرانس تک محدود تھی، لیکن آخر کار یہ یورپ اور امریکہ میں حامیوں اور ناقدین کے ساتھ ایک عالمی تحریک بن گئی۔ روشن خیالی کی خصوصیات میں آزادانہ سوچ اور مختلف عقائد اور اداروں کے اعتراض شامل تھے۔ استدلال سے وابستگی اس کا بنیادی خیال تھا۔ روشن خیالی کے مفکرین کا خیال تھا کہ بنیادی سطح پر انسانی فطرت مستقل رہتی ہے اور قدرتی قانون سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگوں اور معاشرے میں تبدیلیاں بیرونی عوامل کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ہر جگہ انسانی فطرت کی یکسانیت پر زور دیتے ہوئے، انہوں نے تمام افراد کے

درمیان فطری مساوات کے تصور کو فروغ دیا۔ اگرچہ لوگوں میں بہت سے اختلافات تھے، لیکن یہ تفریق اندرونی نہیں بلکہ بیرونی اثرات کا نتیجہ تھا، جنہیں تعامل، تجارت، اصلاح اور تعلیم کے ذریعے تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ یورپ میں روشن خیالی کے دانشوروں کا مقصد روایتی اور مذہبی عقائد سے الگ ہو کر عقل اور جدید سائنس پر مبنی ایک نیا معاشرہ قائم کرنا تھا۔ جو لوگ اس آئیڈیل پر پورا نہیں اترتے تھے ان کو پسماندہ یا ترقی یافتہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

2.3 روشن خیال تاریخ نویسی (Enlightenment Historiography)

روشن خیالی تاریخ کا ایک اہم دور تھا۔ اس کے اہم موضوعات میں سے ایک خود تاریخ تھی، جس میں اس کے بہت سے فلسفیوں کو دلچسپی تھی۔ زیادہ تر روشن خیال مورخین کو ''فلسفی مورخین'' کے نام سے جانا جاتا تھا کیونکہ وہ اخلاقی اسباق اور تعلیمی تبلیغ پر زور دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فلسفہ اور تاریخ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ والٹیئر (Voltaire) نے ایک بار کہا تھا ''تاریخ کو فلسفیوں سے لکھوانا چاہیے'' اور گبن (Gibbon) نے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ بہت اچھا ہوگا اگر تمام مورخین فلسفی ہوں۔

روشن خیالی کے دوران، مورخین نے غیر یورپی اقوام کے بارے میں معلومات شامل کرنا شروع کیں، خاص طور پر ایشیا اور امریکہ سے، جس نے تاریخ کے مطالعہ کو مزید متنوع بنا دیا۔ ان کے پاس ذرائع استعمال کرنے اور تاریخی کہانیاں سنانے کے مختلف انداز تھے، لیکن وہ سب تاریخ کے کائناتی نظریہ پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انفرادی ممالک یا قومیں بلکہ پوری دنیا کی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔ بہت سے روشن خیال مورخین نے غیر یورپی لوگوں کے استحصال اور ظلم کی مخالفت کی اور ان کا خیال تھا کہ عالمی تجارت اُن کو آزاد اور خوشحال بنا سکتی ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر یورپ پر تھی۔ اس حصے میں ہم اُن مورخین اور مفکرین کا ذکر کریں گے جنہوں نے تاریخ نویسی کی ترقی میں وقتاً فوقتاً شراکت کی۔

2.3.1 مونٹیسکو یو (Montesquieu,1689–1755)

فرانسیسی مفکر مونٹیسکو یو نے مختلف ممالک اور ثقافتوں کے درمیان فرق کو تسلیم کیا اور الگ الگ سیاسی اور سماجی حالات کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بہت سے کام تاریخ کے بارے میں انتہائی متعین نظریہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ مختلف ممالک اور ثقافتوں کی سیاست اور معاشرے کیسے کام کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ تاریخ زیادہ تر ایک طے شدہ راستے پر چلتی ہے، جو کہ اداروں اور ماحول نہ کہ افراد اور مواقع سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کا تاریخ پر کوئی بڑا اثر نہیں ہے۔ اس نے الوہی منصوبوں یا مخصوص لوگوں کے بدلے میں تاریخی واقعات کی سیکولر اور آفاقی وجوہات پر توجہ مرکوز کی۔

17ویں صدی میں انگریزی خانہ جنگی کے دوران مونٹیسکو یو نے انگلینڈ میں ہونے والے واقعات کا مطالعہ کیا اور 1725 میں *The Politics* شائع کی۔ اس کی نظر میں نہ ہی حکمران اور لوگ اور نہ ہی اُن کی ہوشیاری بلکہ مخصوص حالات و واقعات ہی تاریخ نویسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اپنی کتاب ''رومیوں کی عظمت اور زوال کے اسباب پر غور'' (*Considerations on the Causes of*

1734–*the Grandeur and Decadence of the Romans*) میں اس نے واقعات کی تشکیل میں سماجی، معاشی اور ادارہ جاتی عوامل کی اہمیت پر زور دیا۔ اُس نے دلیل دی کہ رہنما ابتدائی طور پر جمہوریہ ادارے قائم کرتے ہیں اور بعد میں ان ہی اداروں کو اپنا ترجمان بناتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر بادشاہ سیزر اقتدار میں نہ آتا تو بھی بنیادی عوامل کی وجہ رومی جمہوریہ کا خاتمہ ہوتا۔ اسی وجہ سے آفاقی، اخلاقی اور جسمانی عوامل حکومت پر مختلف شکلوں پر اثرانداز ہوتے ہیں، اُس کا ماننا تھا کہ دنیا میں تین قسم کا حکومتی ڈھانچہ موجود تھا۔ ایک تھا آمرانہ طرز (dictatorship) جس کا سرچشمہ 'خوف' تھا۔ دوسرا جمہوری (Republican) جس کا سرچشمہ 'فضیلت' تھا اور تیسرا بادشاہت (Monarchy) جس کا سرچشمہ 'عزت' تھا۔ ہر قسم کی حکومت مخصوص خطوں کے سائز کے لیے موزوں تھی: درمیانے درجے کے علاقوں میں بادشاہتیں، چھوٹے علاقوں میں جمہوریہ اور بڑے علاقوں میں ظالم حکومتیں (tyrannical) قائم تھیں۔

مونٹیسکو ئیو کی سوچ میں تاریخ نویسی پر آب وہوا کا بڑا اثر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سرد موسم میں رہنے والے لوگ مضبوط، زندہ دل، پُراعتماد، ایماندار اور پُرسکون ہوتے ہیں اور گرم آب وہوا والے اکثر کمزور، حساس، غیر متوقع، غیر مستحکم، متضاد اور خوفزدہ ہوتے ہیں۔ گرم علاقے انسانی آزادی کو بھی محدود کرتے ہیں۔ باوجود مخالفت وہ آب وہوا کے نظریہ کی وجہ سے غلامی کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ گرم آب وہوا ایک خاص قسم کی حکومت (استبداد) اور سماجی حالت (غلامی) کی طرف لے جاتی ہے۔ اس نے گھریلو غلامی جیسے کثرت ازدواج اور لونڈی کو بھی گرم موسموں سے جوڑ دیا ہے۔ اگرچہ اس نے اخلاقی طور پر تعداد ازدواج کی مخالفت کی، لیکن اُس نے زور دیا کہ قدرتی قوانین انسانی حقوق پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اُس نے خطہ کے نظریہ کو بھی آب وہوا کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ زرخیز زمینیں استبداد اور غلامی کو فروغ دیتی ہیں، جبکہ بنجر زمینیں جمہوریت کی حمایت کرتی ہیں۔ حقیقتاً وہ انسانی آزادی کا خیر خواہ تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ''قوانین کی عمومی روح'' (general spirit of laws) مذہب، رسوم ورواج، ماضی کے واقعات اور ان ہی جیسے عوامل سے تشکیل پاتی ہے، حالانکہ جغرافیہ اور آب وہوا کا نظریہ ہمیشہ تاریخ نویسی پر غالب دیتے ہیں۔

2.3.2 والٹیئر (Voltaire, 1694–1778)

Francois-Marie Arouet جسے والٹیئر بھی کہا جاتا ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی فلسفی اور مورخ تھا۔ وہ روشن خیالی کے دور میں ایک اہم شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ انہوں نے 'تاریخ کا فلسفہ' (Philosophy of History) کی اصطلاح تیار کی، جس نے تنقیدی ثقافتی تاریخ کو وجود میں لایا جس کی وجہ سے تاریخ نویسی میں توہمات اور مذہبی عقائد کے بدلے میں عقلی نقطہ نظر نے جگہ لے لی۔ مذہبی نظریات کے مقابلے میں اخلاقی اسباق کو تاریخ نویسی کے ڈھانچے میں ڈالا۔ مزید برآں والٹیئر نے ایک الگ، مشترکہ یورپی تہذیب کی ترقی اور وجود کا خاکہ پیش کیا جو قدیم کلاسیکی وراثت کے نشاۃ ثانیہ سے علیحدگی تھی۔ ان کی تحریری پیداوار کا ایک بڑا حصہ تاریخ سے متعلق تھا۔ ان کے کچھ اہم تاریخی کاموں میں مندرجہ ذیل کام شامل ہیں۔

1. *History of Charles XII* (1731)
2. *The Age of Louis XIV* (1751–53)

3. *Essays on the Manners and Spirits of Nations* (1756)

4. *History of the Russian Empire under the Peter the Great* (1759-63) اور

5. ''فلسفہ تاریخ'' (*Philosophy of History*, 1765)

آپ ان کتابوں اور ان کی مشہور ''فلسفیانہ لغت'' (1764) کو پڑھ کر ان کے تاریخی عقائد اور طریقوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ نہ کہ افسانے سچے حقائق کو بیان کرتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی آراء کی تاریخ زیادہ تر انسانی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ تمام تاریخ کی بنیاد پردیش اور ان کی اپنے بچوں کی دی ہوئی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ اس دی ہوئی تعلیم میں سچائی کے بدلے میں مبالغہ آرائی آجاتی ہے۔ اسی وجہ سے قدیم روایتیں مضحکہ خیز دکھائی جاتی ہیں۔

والٹیئر، مونٹیسکو کے قانونی اور آب وہوا کے نظریے سے متفق نہیں تھے۔ اس نے مونٹیسکو یو کی حکومتوں کی درجہ بندی پر بھی اس لیے سوال اٹھایا کیونکہ مونٹیسکو نے ایشیائی حکومتوں کو منفی انداز میں پیش کیا تھا والٹیئر کا اپنا طریقہ ایک رجحان کی وضاحت کرنے میں کافی حد تک انتخابی تھا۔ ان کی 'فلسفیانہ تاریخ' درج ذیل خصوصیات کی حامل تھی۔

1. یہ سیاسی یا خاندانی تاریخ کے مقابلے میں خالی ایک ثقافتی تاریخ ہے، جس میں لوگوں کے باہمی رشتے پر توجہ دی گئی ہے۔ اس میں والٹیئر نے ماضی سے سبق سیکھنے پر زور دیا ہے اور اس میں والٹیئر نے ماضی کے حکمرانوں کی مظالمانہ اور غیر انسانی پالیسیوں کی مخالفت کی ہے۔ وہ تجویز کرتا ہے کہ مورخین کو کسی قوم کے حقوق، اس کے اہم گروہوں، قوانین اور رسوم ورواج کا باریک بینی سے مطالعہ کرنا چاہیے اور یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کیسے بدلے ہیں۔

2. والٹیئر کی تاریخ عصری دور اور اس کے ذرائع پر انحصار کرتی ہے۔ اُس کا یقین تھا کہ تاریخ کو روشن خیالی کی اقدار جیسے عقل، آزادی، امن اور انسانیت کو فروغ دینا چاہیے۔ اُس نے ماضی کو دو ادوار میں تقسیم کیا: شاندار (fabulous) اور تاریخی (historical)۔ شاندار دور میں، لوگوں نے اپنی تاریخ کو کہانیوں اور افسانوں کے ذریعے محفوظ کیا جو تاریخی معیارات پر نہیں اُترتے تھے۔ لہٰذا کسی ثقافت کی بنیاد صرف روایات پر نہیں رکھی جاسکتی ہے۔ اس تاریخی دور کا آغاز بمشکل چار ہزار سال سے زیادہ کا تھا، لیکن اس میں بھی، ابتدائی تاریخیں خالصتاً قیاس پر مبنی تھیں۔ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ حقیقی تاریخی دستاویزات صرف 16 ویں صدی کے وسط میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے ساتھ ہی قابل اعتماد بنیں، جو حقیقی تاریخ کا آغاز ہے۔

3. تاریخ ایک امکانی سائنس ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہر چیز کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔ یہ یقین کے بدلے امکانی قدروں پر زور دیتا ہے۔ تاہم وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اگر کسی خاص واقعہ کے متعدد عینی شاہدین ہیں تو اس پر یقین کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ واقعہ بھی منطق کی حدود میں ہونا چاہیے۔ اسی طرح اگر بہت سے لوگ مردوں کے زندہ ہونے کے کی تصدیق کریں تو اس پر یقین کرنا اس لیے مشکل ہے کیونکہ ''جو چیز فطرت کے معمول کے خلاف ہے، اس پر یقین نہیں کرنا چاہیے''

4. والٹیئر نے اپنی تحریروں میں غیر یورپی اقوام اور ان کی خصوصی تہذیبوں کا احترام کیا ہے۔ انہوں نے مونٹیسکوئیو کے اس خیال سے اختلاف کیا کہ ایشیائی ممالک پر مطلق العنان حکمران تھے۔ اس نے 'مشرقی استبداد' کے تصور پر بھی تنقید کی اور روایتی مذاہب کی اس لیے تعریف کی کیونکہ وہ سچائیوں کو محفوظ رکھتے تھے۔ جنہیں سرکاری عیسائیت نے ہدف کیا تھا۔ اس نے قدیم فارسیوں کے مذاہب کو اس لیے سراہا، کیونکہ اُن میں لافانی روحوں اور اعلیٰ قدروں کا اظہار تھا۔ انہوں نے قدیم چینیوں کی دانشمندانہ اور سادہ تہذیب کی بھی تائید کی۔ اسی طرح سے انہوں نے قدیم ہندوستانیوں کی اخلاقی، اصولی، عالمگیری اور مذہبی اقدار کی قدر کی۔ قدیم عرب قومیں بھی والٹیئر کی نظر میں قابل ستائش تھے۔

5. اٹھارویں صدی میں والٹیئر تاریخ خاص کر مذہبی تاریخ کے بارے میں مضبوط رائے رکھتے تھے۔ وہ یہودی- مسیحی روایت پر تنقید کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عہد وسطیٰ میں بربریت اور توہم پرستی اور جدید دور میں پر تشدد تنازعات کو مذہب ہی نے جنم دیا تھا۔ اس لیے اُس نے عہد وسطیٰ کی صلیبی جنگوں اور یورپ میں مذہبی جنگوں کی بہت تنقید کی۔ وہ انہیں جنونی اور وحشیانہ سمجھتے تھے۔ والٹیئر نے امریکہ کی یورپی نو آبادیاتی کی بھی مخالفت کی۔ وہ انہیں یورپی بربریت کی باقیات سمجھتے تھے۔ وہ ان کا اقتصادی استحصال اور ثقافتی تکبر کا حصہ سمجھتے تھے۔ البتہ انہوں نے چین کو ایک عظیم اور آزاد ثقافت کی مثال کے طور پر اشارہ کیا۔

6. والٹیئر کا خیال تھا کہ غیر معمولی افراد اپنی ذہانت اور عمل کے ذریعے سے تاریخ کے دھارے کو بدل سکتے ہیں۔ اس نے روشن خیالی کے اصولوں کی بنیاد پر ایک شخص کی ذہانت اور قابلیت کا اندازہ کیا۔

7. والٹیئر قدیم ایشیائی معاشروں کی تعریف کے باوجود یوروسینٹرک نقطہ نظر کا حامل تھا۔ اُس نے یورپی تاریخ کو سب سے اہم قرار دیا۔ اصل میں اس کا مضمون یورپ کے عروج کی روشن خیالی کی ایک داستان ہے۔ اپنی کتاب ”Age of Louis XIV“ میں اس نے بنی نوع انسان کی تاریخ کو تمام یورپی تناظر میں چار عہدوں میں تقسیم کیا۔ اگرچہ اس نے قدیم ایشیائی تہذیبوں کی تعریف کی، لیکن اس نے انہیں غیر مغیر قرار دیا۔ وہ عصری یورپ کو اس لیے برتر سمجھتے تھے کیونکہ اس نے روشن خیالی کی تحریک کو اپنایا۔ اس کا یہ ماننا تھا کہ ”جب ہم کسی بھی مہذب ایشیائی لوگوں سے اپنا موازنہ کرتے ہیں، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم سے پہلے آئے، لیکن ہم ان سے آگے نکل گئے۔“

8. اٹھارویں صدی میں، والٹیئر کا معیار کے بارے میں دوسروں کے مقابلے میں ایک مختلف نقطہ نظر تھا۔ اختلافات کے بجائے اس نے قدیم ایشیائی اقدار جیسے خدا پرستی، توحید پرستی اور عقلیت پسندی کو انہوں نے روشن خیالی سے منسوب کیا۔ ایک طرف سے انہوں نے یہودیوں کی تنقید کی، لیکن دوسری طرف سے انہوں نے قدیم چینیوں، عربوں اور ہندوستانی تہذیبوں کی بہت تعریف کی۔ اس نے غیر یورپی تاریخ کی اس لیے تعریف نہیں کی کیونکہ اس کو یہودی- مسیحی مذہبی اسٹیبلشمنٹ نے اپنے مفادات کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا۔ صحیفائی روایت کی سخت مخالفت کی وجہ سے وہ اکثر عیسائی دور کو 'بد تمیز دور' کہتا تھا۔

9. والٹیئر کا فلسفہ عالمگیریت پر مبنی تھا، یہ نظریہ کہ ہندوستان سے لے کر یورپ تک تمام مہذب قومیں آفاقی سچائیوں کا اشتراک کرتی ہیں۔

اس کا خیال تھا کہ انسانی فطرت پوری تاریخ میں مستقل رہتی ہے۔تاہم،اس نے مہذب اور غیر مہذب معاشروں میں فرق کیا۔مہذب معاشروں میں مشرقی اوریورپ کے وہ لوگ شامل تھے،جن میں مؤخرالذکر نے پہلے سے فکری روایات کھینچی تھیں۔بد قسمتی سے،اس نے دنیا کے بہت سے حصوں،جیسے افریقہ اور امریکہ کے ساتھ ساتھ یورپی تاریخ کے بعض ادوار کو غیر معقولیت کی حالت میں چھوڑ دیا۔

2.3.3 ڈیوڈ ہیوم (David Hume,1711–1776)

ڈیوڈ ہیوم ایک مشہور برطانوی فلسفی اور مورخ تھے۔وہ اپنی زندگی کے دوران اپنی تاریخی تحریروں سے زیادہ اپنے تاریخی فلسفے کے لیے جانا جاتا تھا۔1762–1754 کے درمیان انہوں نے انگلینڈ کی تاریخ لکھی جو چھ جلدوں پر مشتمیل تھی،جس میں جولیس سیزر کے برطانوی جزائر پر حملے سے لے کر1688 کے انقلاب تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیوم نے اپنی تاریخ الٹی لکھی،سترہویں صدی کے اسٹیورٹس سے شروع ہو کر،ٹیوڈرز میں چلے گئے اور آخر میں رومن دور اور نشاۃ ثانیہ میں واپس آگئے۔برطانیہ پر توجہ مرکوز کرنے کے باوجود،ان کی تاریخ کا وسیع تر تناظر یورپی تھا۔انہوں نے برطانوی تاریخ کے بارے میں غیر جانبدارانہ نظریہ پیش کرنے کے لیے لبرل(وگ)اور قدامت پسند(ٹوری)جماعتوں اوران کی نظریوں کی تنقید کی۔ ان کے نظریوں کو فرانسیسی سیاست دانوں،روشن خیالی مفکرین اور روشن خیال دانشوروں نے بہت سراہا۔

والٹیئر کے مقابلے میں ہیوم کو سیاسی تاریخ کا زیادہ مضبوط جذبہ تھا،لیکن والٹیئر کی طرح ہی اس کی توجہ اپنے عصری دور پر تھی۔اس نے ماقبل جدید دور میں خاصی دلچسپی نہیں دکھائی۔ان کا خیال تھا کہ تاریخ کے تین اہم فائدے ہیں جیسا کہ تفریح،تعلیم اور خوبی۔ہیوم نے اپنی تاریخ کے لیے بنیادی طور پر ثانوی ذرائع پر انحصار کیا،جو کہ عین مطابق حقائق کے ساتھ نوادرات کے جنون کو مسترد کرتے تھے۔

تاریخی ہم رشتگی کے باوجود ہیوم نے یکسانیت کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھا۔وہ یکساں انسانی فطرت پر یقین رکھتے ہوئے لکھا کہ انسانوں کے اعمال،قومیں اور زمانے بالکل یکساں تھے۔اُس زمانے کی تاریخ نویسی کا بنیادی مقصد انسانی اور عالمگیر اصولوں کو فروغ دینا تھا۔ان کا خیال تھا کہ تاریخ کو سائنسی اور قانونی اصولوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔اس نے کرداروں،تعصبات اور آراء کی جداگانیت تو کیا،لیکن اس نے جدید تاریخ میں بھی اس کے برعکس کوئی مکمل طور پر منفرد چیز نہیں دیکھی۔

ہیوم نے دوسرے روشن خیال مورخین کی طرح سیکولر اصولوں کو عمل میں لایا۔اس نے 'معجزاتی' عنصر کو مکمل طور پر مسترد کر دیا اور 'حیرت انگیزی' کے عنصر کو باریک بنی سے جانچ پڑتال کیا۔اس کی جستجو یہ تھی کہ تاریخ ہمیشہ حقائق اور حالات کے مطابق ہونی چاہیے اور 'نامعلوم کو عقل کے ساتھ فتح کیا جائے'۔اس نے ترقی یا زوال کے نظریوں حمایت نہیں کی کیونکہ دونوں ہی انسانی تاریخ کا حصہ ہیں۔بلکہ وہ ایک چکراتی تحریک پر یقین رکھتا تھا،جس میں ترقی اور زوال ایک دوسرے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔اس معاملے پر ان کے خیالات والٹیئر، ٹرگوٹ،کانٹ اور کنڈورسیٹ جیسے روشن خیال مفکرین سے مختلف ہیں،جن کا خیال تھا کہ ایک خاص عمر تاریخی ترقی کا عروج ہے۔ہیوم کے تاریخی کاموں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہمیشہ دو تاریخیں لکھی جاتی ہیں: ایک 'انسانی حالات کی عمومی تبدیلی' اور دوسری 'انسانی نفسیات اور انسانی

حالت کے اسرار' کے بارے میں۔

2.3.4 ڈیڈروٹ اور رینل (Diderot (1713–1784), and Raynal (1713–1796))

ڈینس ڈیڈروٹ ایک فرانسیسی فلسفی جس کو سائنس اور مادیت پرستی پر پختہ یقین تھا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر چیز غیر فعال یا فعال بنیادی طور پر انسانی سوچ (matter that thinks) اور حساسیت (matter-endowed with a sensitivity) کا نتیجہ ہے۔ اس نے تاریخ کو عزم اور پختگی کے عینک سے دیکھا۔ اس کا ماننا تھا کہ تمام واقعات کی جسمانی وجوہات ہوتی ہیں اور انسانی اعمال ہمارے قابو سے باہر قدرتی قوتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس نے استبداد اور غلامی کی سخت مخالفت کی، یہاں تک کہ یہ بھی تجویز کیا کہ تبدیلی کے لیے بعض اوقات تشدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ان کی نمایاں شراکت 1770 کی دہائی میں لکھی گئی رینل کے حجم سے ملتی ہے، جہاں انہوں نے تاریخی تبدیلی اور اپنے زیادہ بنیاد پرست نظریات میں اپنی دلچسپی ظاہر کی۔

فرانسیسی فلسفی اور مورخ Guillaume Thomas Francois Raynal نے 1771 میں ایک مشہور کتاب *A Philosophical and Political History of the Commerce and Settlements of the Europeans in the Two Indies* کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے کالونیوں میں سامراجی طاقتوں کے ظالمانہ اقدامات کی بہت تنقید کی، جس وجہ سے یہ عوام میں کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں مزید نظر ثانی کر کے رینل نے اسے دوبارہ (1774–1780) لکھی۔ اس میں ڈینس ڈیڈروٹ کا تعاون بہت زیادہ اور نمایاں تھا۔ حالانکہ والٹیر نے اس کی سخت الفاظ میں مخالفت کی۔ باوجود اس کے اس کتاب کی کشش کے پیچھے جمہوری قدروں کو فروغ دینا تھا۔ 18ویں صدی میں اسے سامراج مخالف تحریر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اس میں فرانسیسی اور دوسرے ممالک کی استعماری (colonialism) اور سامراجی پالیسیوں کی بہت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ Raynal نے دکھایا کہ دنیاوی اختلافات اور تقسیم ان ہی جیسے پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔ یہ کتاب کئی ایڈیشنوں سے گزری اور مختلف یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

یہ کتاب غلامی اور انسانی جبر کے خلاف ایک آواز تھی۔ ڈیڈروٹ نے برطانوی جمہوریت کی حمایت کی لیکن اُن کی استعماری پالیسی کی انتہائی مخالفت کی اور اُن کو بنگال کے قحط کا ذمہ دار ٹھہرایا، جس کی وجہ سے لاکھوں اموات ہوئیں۔ اُن کی پالیسیوں کی وجہ سے عوامی زندگی میں بدعنوانی ہوئی اور استبداد کو تقویت ملی۔ کتاب نے خبردار کیا کہ یہ جابرانہ پالیسیاں بالآخر کالونیوں میں تشدد کا باعث تھی۔ اس کتاب نے 1790 کی دہائی میں سینٹ ڈومینگو میں ہونے والی بغاوت کو بہت متاثر کیا، جس کی وجہ سے ہیٹی (Haiti) کی آزاد ریاست قائم ہوئی۔ آزادی کی تحریک کی علامت کے طور پر جزیرے پر رینل کے مجسمے اور پینٹنگز کھڑی کی گئیں۔

2.3.5 جین ڈی ایلمبرٹ (Jean d'Alembert,1717–1783)

Jean-Baptiste le Rond d'Alembert ایک فرانسیسی فلسفی، ریاضی دان، ماہر طبیعیات اور فرانسیسی روشن خیالی کی ایک نمایاں شخصیت تھی۔ انہوں نے ڈینس ڈیڈروٹ کے ساتھ انسائیکلوپیڈیا کی تدوین پر کام کیا، جو روشن خیالی کے دور کا ایک اہم

منصوبہ تھا۔ ڈی ایلمبرٹ نے انسانی ذہن کو تین فیکلٹیوں میں تقسیم کیا: یادداشت (memory)، استدلال (reason) اور تخیل(imagination)۔ان کے خیال میں ان فیکلٹیز نے انسانی علم کے تین وسیع شعبوں کی بنیاد ڈالی۔ یہ تینوں انسانی خصوصیات اُس کی تاریخ کا منبع تھا۔البتہ اُس نے ان فیکلٹیز میں یادداشت کو سب سے کم طاقتور سمجھا۔ اُس کے خیال میں تاریخ یادداشت 'فلسفہ' استدلال اور اعلیٰ فنون تخیل سے منسلک تھے۔اس وجہ سے وہ تاریخ کو انسانی علوم کا ایک کمزور ترین جزُ مانتا تھا، حالانکہ اُس کا موقف خود تاریخ کے خلاف نہیں تھا کیونکہ اس نے فلسفیوں کو خود معلومات فراہم کیں۔اس کے لیے تاریخ کا بنیادی مقصد فلسفیوں کی انسانیت پسندی کا درس تھا تاکہ وہ حقائق کو جوڑ توڑ کر پیش کر سکیں۔

مزید برآں اس نے مشورہ دیا کہ فلسفیوں کے ایک گروہ کو ایک صدی بعد جمع ہونا چاہیے تاکہ وہ "غیر متعلقہ" سچائیوں سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ناپسندیدگی کے باوجود ڈی ایلمبرٹ کے منصوبے میں کچھ بصیرت انگیز تاریخی نکات تھے:

(a) اس نے تاریخ سائنس اور آرٹ کے درمیان فرق کیا اور تاریخ کو انسانی علوم کے نچلے درجے میں جگہ دی۔ حالانکہ نشاۃ ثانیہ کے بعد تاریخی علم نے سائنس اور آرٹ کے ساتھ ساتھ ایک اپنی منفرد پہچان قائم کی۔

(b) اس نے تاریخی دانشورانہ روایت میں قدیم/نوادرات (antiquarian) اور علمی دانشورانہ روایت(erudite) کو شامل کیا، جو کہ اہم تھا، کیونکہ انہیں پہلے الگ الگ مضامین کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور تاریخ کو اکثر کم اہم سمجھا جاتا تھا۔

(c) اس نے امکان اور یقین کے عناصر کو الگ کیا اور تاریخ کو بعد کے زمرے میں رکھا۔ ڈیکارٹس کی طرح اس کا یقین تھا کہ جیومیٹری ہی حقیقی معنوں میں واحد علمی ماڈل ہے۔دوسرے علوم صرف اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کا قول تھا کہ مورخین کو اپنی حدود کو پہچاننا چاہیے، ضرورت سے زیادہ یقین سے بچنا چاہیے اور غلط یقین سے پرہیز کرنا چاہیے۔

2.3.6 ٹورگٹ (Turgot, 1727–1781)

این رابرٹ جیکس ٹرگوٹ، ایک فرانسیسی ماہر اقتصادیات، نے تاریخی فکر میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے ایک منظم انداز میں ترقی کی بات کی اور کہا کہ ترقی کسی بھی ثقافت کا ایک مستقل حصہ ہے، اگرچہ یہ مختلف اوقات میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔اس کا خیال تھا کہ ثقافت کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کتنے شاندار افراد پیدا کرتی ہے اور اس کے علم میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ٹرگوٹ کے خیالات نے بعد کے مفکرین جیسے کامٹے، مارکس اور اسپینسر کو متاثر کیا، جنہوں نے انسانی ترقی کے قوانین کی کھوج کی۔ مونٹیسکو کی طرح ٹورگوٹ نے وضاحت کی کہ انسانی معاشرہ تین اہم مراحل سے گزرا ہے: شکار (hunting)، چراگاہی (pasture) اور زراعت (agriculture)، لیکن ٹرگوٹ نے انہیں ترتیب وار ترقی کی بنیاد پر منظم کیا جو بذات خود اُس کی تاریخ نویسی کی ایک خاص خصوصیت تھی۔

(a) **شکار(hunting):** انسانی ترقی کے ابتدائی مراحل میں، بنیادی جبلتیں غالب تھیں اور لوگ زیادہ نہیں سوچتے تھے۔خواہش، خوف، خوشی اور طاقت کی خواہش جیسے جذبات نے ان کے اعمال کو کنٹرول کیا تھا۔علم محدود اور اکثر ناقابل اعتبار تھا اور صرف چند نسلوں پر محیط

تھا۔ خوراک کی تلاش کرنے والے لوگوں کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے ٹور گوٹ نے اس دور کو "استدلال اور تاریخ کی خاموشی" (Silence of Reason and History) کہا اور یہ وحشیانہ دور کہلایا۔

(b) **چراگاہی (pastoral):** اگلا مرحلہ چرواہی کا تھا، جس کے دوران لوگ 'زیادہ امیر ہونے لگے اور جائیداد کے خیال کو بہتر طور پر سمجھنے لگے'۔ لوگ لڑائیوں، ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور عظمت کے جھوٹے تصورات کے درمیان ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چلے گئے۔ تاہم، ان ثقافتوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے، مشترکات کا کوئی تعلق نہیں بن سکا اور تحریر کی عدم موجودگی کی وجہ سے، کوئی ریکارڈ برقرار نہیں رکھا جا سکا۔

(c) **زراعت (agricultural):** اس کے بعد زراعت آئی، جہاں لوگ آباد ہوئے، زائد خوراک پیدا کی، شہر بنائے، لکھائی ایجاد کی، فکری طور پر ترقی کی، عسکری طور پر ترقی کی، محنت کی تقسیم ہوئی اور عورتوں کی محکومیت سمیت عدم مساوات متعارف کرائی گئی۔ تاہم، اس مرحلے نے حکومت کی مختلف شکلوں کے بارے میں بھی گہری تحقیق کی۔ مزید برآں، شہری زندگی کے استحکام نے ٹورگٹ کے خیال میں ایک انوکھی چیز کو جنم دیا: جسے "جینیئس" کہا گیا۔

ٹورگٹ نے اپنی تحریروں میں 'ترقی' (progress) اور 'عقلمندی' (genius) کے تصور پر خاصہ زور دیا جو انسانی معاشرے پر لاگو ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ترقی اختراع، نئے خیالات کے حصول اور جمع شدہ علم کے تحفظ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے قدرتی دنیا اور انسانی دنیا میں فرق دیکھا۔ قدرتی دنیا میں، چیزیں ترقی اور زوال کے چکراتی انداز کی پیروی کرتی ہیں، لیکن انسانی دنیا میں، مسلسل تبدیلی اور ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ تجربات کا یہ مسلسل ذخیرہ نسل در نسل اختراعات اور نئے اور دیرپا خیالات کی تخلیق پر مبنی ہے۔ ٹورگٹ کو یقین تھا کہ جدید سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اس کے پیچھے ہٹنے یا رکنے کا امکان نہیں ہے۔ باوجود انسانی مشکلات کے پوری نسل انسانی آہستہ آہستہ ترقی اور کمال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے پچھلی نسلوں کے تجربات اور ذاتی صلاحیتوں کو استعمال میں لایا۔ اسی کی بدولت نسل انسانی چکراتی انداز (cyclical pattern of growth) کی ترقی سے نکل کر خطی اور اجتماعی ترقی (linear and collective advancement) کے راستے پر گامزن ہوئی۔

پوری تاریخ میں شاندار افراد، جنہیں تور گوٹ نے 'عقل مند' (genius) کہا، معاشرے کو آگے لے جاتے ہیں۔ انہوں نے اہم واقعات اور تجربات کو ریکارڈ کر کے انہیں قیمتی علم میں بدل دیا۔ ان 'عقلمندوں' نے ترقی کے لیے ثالث (mediator) کے طور پر کام کیا۔ ذہانت ہر قوم میں پائی جاتی ہے لیکن جب ان کا مشکل وقت آتا ہے تو ان کی ترقی کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ہنر مند افراد کی حفاظت اور مدد کریں، جس سے وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں۔ جینیئس مختلف اقوام میں مختلف شرح ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ تاہم مصنف کا خیال ہے کہ تبدیلی ناگزیر ہے، اس کا سرچشمہ انسانی ذہن ہے، اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی شرح اور اقسام میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

2.3.7 ولیم رابرٹسن (William Robertson, 1721–1793)

ولیم رابرٹسن سکاٹش روشن خیالی میں ایک قابل ذکر شخصیت تھے۔ وہ ایڈم سمتھ اور ایڈم فرگوسن جیسے مشہور مفکرین کے ہم سفر تھے۔ وہ 18ویں صدی کا ایک ممتاز برطانوی مورخ تھا، جو اپنے کاسموپولیٹن (cosmopolitan) نقطہ نظر کے لیے جانا جاتا ہے۔ رابرٹسن نے ابتدا میں انفرادی قوموں کی تاریخوں کے بارے میں لکھا لیکن بعد میں اپنی توجہ عالمی تاریخوں تک بڑھادی۔ انہوں نے ہندوستان، سکاٹ لینڈ اور امریکہ کی تاریخوں پر کئی جلدیں تصنیف کیں۔ رابرٹسن کا تاریخی تناظر "تاریخی ترقی کے اسٹیڈیل تھیوری" (Stage-wise or, Stadial Theory) سے متاثر تھا، جس کی جڑیں جرمن فقیہ سیموئیل پوفینڈورف (1632–1694) کے نظریہ سے ملتا جلتا تھا۔ اس نظریہ نے "فطرت کی حالت" (State of Nature) کو "تہذیب کی حالت" (State of Civilization) میں منتقل کیا۔ سکاٹ لینڈ کے مفکر کامس (1696-1782) نے اسٹیڈیل تھیوری کو بہتر بنایا۔

ایڈم فرگوسن، جان ملر اور ایڈم اسمتھ رابرٹسن جیسے مفکرین نے اسٹیڈیل تھیوری کو مزید ترقی دی، جس میں معاشی بنیادوں پر نوع انسان کی تاریخ کو جن حصوں میں بانٹا گیا ہے، اس کا پہلا مرحلہ 'وحشیانہ' (barbaric)، دوسرا 'خانہ بدوش' (nomadic)، تیسرا 'زراعت' (farming) اور چوتھا 'تجارت' (commercial)۔ ہر مرحلے کا تعلق معاش کے مخصوص طریقوں اور الگ الگ سماجی خصوصیات سے تھا۔

اپنی کتاب *History of Scotland* (1759) میں رابرٹسن نے سکاٹ لینڈ کے ماضی کو چار مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ انہوں نے مختصراً پہلے تین مراحل کا احاطہ کیا اور جدید دور پر توجہ مرکوز کی۔ اسے سولہویں صدی میں خاص طور پر دلچسپی تھی کیونکہ یہ جدید ریاست، سول سوسائٹی اور بین الثقافتی تجارت کے عروج کے روشن خیالی کے بیانیے کے ساتھ منسلک تھی۔ اُس نے پچھلے "مسیحی ہزار سالہ" (Christian Millennium) تاریخ کو توہم پرست اور وحشیانہ قرار دیا۔ اسے "آفت اور مصیبت زدہ" کی علامت کے طور پر بیان کیا۔ اس نے سولہویں صدی کو ایک اہم دور کے طور پر دیکھا جب انفرادی تشدد، عقلی مفاد اور قومی پالیسی خطی ترقی کی علامت تھی۔

اپنے اہم کام The *History of the Reign of Charles-V* میں، رابرٹسن نے رومن سلطنت کے زوال سے لے کر ہیبسبرگ سلطنت کی بنیاد تک یورپ میں جاگیردارانہ معاشرے کے ابھرنے اور زوال کی تلاش کی۔ اس نے اپنی *History of America*, 1777–1796 میں اپنے چار مراحل کے ترقیاتی ماڈل کو امریکی ہندوستانیوں پر لاگو کیا، جس میں انہیں ترقی کے مختلف مراحل میں دکھایا گیا ہے۔ وہ انکا کی تہذیب کے قریب سمجھتے تھے لیکن زیادہ تر امریکی قبائل کو 'وحشی' حالت میں دیکھتے تھے۔

رابرٹسن کا تاریخی تناظر یورپی اخلاقی نظریات سے متاثر تھا۔ انہوں نے مقامی آبادیوں کے خلاف ہونے والے مظالم کو مسترد کرتے ہوئے انہیں یورپیوں اور مقامی امریکیوں کے درمیان ثقافتی فرق سے منسوب کیا۔ اس نے حکومت اور چرچ کو معاف کرتے ہوئے نجی متلاشیوں کو موردالزام ٹھہرایا۔ مجموعی طور پر، رابرٹسن کے نقطہ نظر نے "مہذب (Civilized)" یورپی معاشروں کو تہذیب کا آلہ زینہ

قرار دیا جو انسانی فطرت اور اہلیت کی آفاقیت میں روشن خیالی کے عقائد کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

رابرٹسن کی آخری تصنیف *An Historical Disquisition Concerning the Knowledge of Ancient India*, 1791 ان کے کھلے ذہن اور نرم مزاجی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندوستان کی بھرپور تاریخ اور ثقافتی کامیابیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے مطابق سولہویں صدی میں جب جدید دنیا نے پہلی بار یورپ سے رابطہ قائم کیا، ہندوستان پہلے ہی سے ایک انتہائی ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ تھا، جو بغیر کسی جبر کے بین الاقوامی تجارت میں شامل ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ نقطہ نظر اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان سے متعلق نظریہ سے متصادم رکھتا ہے۔

2.3.8 کیتھرین میکالے (Catherine Macaulay, 1731–1791)

کیتھرین میکالے برطانیہ کی پہلی خاتون مورخ تھیں۔ وہ ڈیوڈ ہیوم کی قدامت پسند تاریخ سے متفق نہیں تھیں۔ 1763 سے 1783 تک، اس نے انگلینڈ کی اپنی کامیاب آٹھ جلدوں کی تاریخ لکھی۔ اس نے آزادی اور آزادی کے لیے امریکی لڑائی کی بھرپور حمایت کی۔ اس نے ایڈمنڈ برک کو ان کے جنس پرستانہ خیالات پر بھی تنقید کا نشانہ بنایا، یہ دلیل دی کہ اخلاقی فضیلت اور طاقت، جو برک کے خیال میں صرف مردوں کے لیے ہے، خواتین حاصل کرسکتی ہیں اور یہ کہ ان کی سمجھی جانے والی کمزوری قدرتی نہیں بلکہ مائل کردہ ہے۔ اس کا ماننا تھا کہ خواتین میں کمزوری موروثی نہیں بلکہ معاشرتی ہے۔ اپنی آخری اہم کتاب "لیٹرز آن ایجوکیشن" (*Letters on Education*,1790) میں اس نے واضح طور پر اپنے حقوق نسواں کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے دلیل دی کہ اکثر خواتین کے کردار سے جڑی خامیاں ان کی جنس میں نہیں بلکہ ان کی پرورش اور تعلیم میں ہوتی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ مرد اور عورت دونوں تعلیم کی بدولت محب وطن اور آزادی کے چیمپئن بن سکتے ہیں۔

بقول میکالے انگلینڈ کی سچی کہانی انگریزوں کی جاگیردارانہ اور بادشاہی نظام کے خلاف اور آزادی اور انصاف رائے کے قیام کے لیے ایک جدوجہد کے گرد گھومتی ہے۔ ایک سیاسی تاریخ نویس کی حیثیت سے اس نے انگریزی رسوم ورواج، طریقوں، یا سماجی رویے کا خود مطالعہ نہیں کیا، جو روشن خیالی کی تاریخ نویسی سے ایک اہم رخصت تھی۔ تاہم دوسرے روشن خیال مفکرین کے برعکس اُس نے انسانی آزادی اور حقوق کے لیے باضابطہ وکالت کی ہے۔ اس نے خواتین کو "مردانہ" بننے کی ترغیب دی، یعنی مردوں کی طرح طاقتور اور بہادر بننا۔ اس کی مثال دینے کے لیے اس نے کئی سیاسی خواتین کو 'قہرمانوں' (Heroines) کے طور پر پیش کیا کیونکہ اُن میں کلاسیکی رومی طرز پر 'مردانہ' خوبیاں موجود تھیں۔

2.3.9 ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon, 1737–1794)

روشن خیالی کے دور کے عظیم ترین مورخین میں سے ایک ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) تھا۔ اگرچہ اس نے تاریخ کے بارے میں بڑے خیالات کی تجویز نہیں کی تھی، لیکن حقائق کے بارے میں ان کی ناقابل یقین معلومات، خوبصورت تحریری انداز اور

دلچسپ فوٹ نوٹ بے مثال تھے۔ان کی سب سے مشہور تصنیف *The History of the Decline and Fall of the Roman Empire* (1776–1788) کو اب تک کی بہترین تاریخی تحریروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب تیرہ صدیوں پر مشتمل یورپ سے ایشیا تک وسیع ایک بہت بڑے خطے پر محیط ہے۔ یہ بنیادی طور پر رومی، باز نطینی خطے اور شمالی قبائل کے لوگوں پر مرکوز ہے۔ روشن خیالی کی بہت سی دوسری تاریخوں کی طرح یہ بتاتی ہے کہ کس طرح جدید یورپ نے ترقی کی اور دنیا کے دیگر حصوں کے مقابلے میں اپنی برتری کو اجاگر کیا۔ گبن نے یورپ کو ایک متحدہ جمہوریہ کے طور پر دیکھا جس میں ایک انتہائی مہذب اور تعلیم یافتہ آبادی تھی، جو اپنی مجموعی خوشی اور جدید فنون، قوانین اور آداب کے لیے مشہور تھی، جو باقی انسانیت سے برتر تھی۔

تاریخی طریقہ کار میں گبن کی اہم شراکت ان کی "فلسفیانہ تاریخ" اور نوادرات کا امتزاج تھا، جس نے تاریخ لکھنے کا طریقہ بدل دیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، نشاۃ ثانیہ کے دوران، قدیم ماضی کے ساتھ ایک بڑھتا ہوا جذبہ تھا، جس کی وجہ سے "مثالی" تاریخ اور نوادرات دونوں کی ترقی ہوئی۔ تاہم، یہ دونوں نقطہ نظر تیزی سے مختلف ہوگئے۔ جبکہ مورخین نے فخریہ انداز میں حکمرانوں، شہزادوں، رئیسوں اور مقتدر اور بااثر افراد کی تاریخ قلمبند کی۔ وہی پر نوادرات کے ماہرین نے مذہبی جذبے سے ماضی کے 'حقائق' کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ مزید برآں اگرچہ روشن خیالی کی تاریخ سیاسی اور سفارتی مسائل پر مرکوز تھی، نوادرات کی تاریخ سماجی اور ثقافتی موضوعات پر مبنی تھی۔ اس نے مورخین اور نوادرات کے مفکرین کے درمیان خلیج بڑھادی، جس کے اندر فلسفیانہ تاریخ دانوں نے اپنی جگہ بنا دیا۔ تحریروں میں گبن نے ان مخالف نظریات کو ایک ساتھ لایا اور تاریخ بیان کرنے کا ایک زیادہ جامع طریقہ ایجاد کیا۔

گبن نے ادب کے مطالعہ پر اپنے مضمون *Essay on the Study of Literature* (1761) میں ڈی ایلمبرٹ کی علمی درجہ بندی کو مسترد کر دیا۔ اُس نے تاریخ کو یادداشت کے دائرے میں منتقل کرنے کے خیال پر سخت اعتراض کیا۔ اگرچہ اس نے تسلیم کیا کہ 'فطری فلسفہ اور ریاضی اب تخت کے قبضے میں ہیں'، اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ 'ان کا دور حکومت بھی مختصر ہے اور ان کا زوال قریب آرہا ہے۔ گبن کے مطابق ماضی کے لوگوں کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے ہمیں دنیا کو یونانیوں اور رومیوں کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس نے تاریخ کے ساتھ منسلک ہونے کے اصول بتائے۔ سب سے پہلے اس نے تاریخی حقائق کی کثرت پر زور دیا۔ تاہم ان کے اسباب ہمیشہ ان کے اثرات کے متناسب ہونے چاہئیں۔ کسی فرد کے رویے کی بنیاد پر پورے دور کے بارے میں وسیع نتائج اخذ کرنا غلطی ہوگی۔ متعدد واقعات کو جوڑنے اور سبب اور اثر کے تعلقات قائم کرنے کے لیے، ایک جامع تقابلی تجزیہ ضروری ہے۔ اپنی کتاب رومی سلطنت کے عروج زوال میں گبن نے اپنے موضوع کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

1. دوسری صدی سے چھٹی صدی کے اوائل تک۔
2. قسطنطنیہ میں مقیم مشرقی رومی سلطنت کے شہنشاہ جسٹینین (565-483) کی حکمرانی سے لے کر 800 میں رومیوں کے شہنشاہ شارلمین کی تاجپوشی تک۔
3. نویں اور پندرھویں صدی میں ترک حملوں سے لے کر مشرقی رومی سلطنت کے خاتمے تک۔

ابتدائی طور پر اس کام کا مقصد قدیم مغربی دنیا کے 'زوال اور گراوٹ کو دستاویز کرنا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، اس نے وسیع تر موضوعات کا احاطہ کیا، جس میں یورپ سے چین تک بسے ہوئے خانہ بدوش لوگوں کی تاریخ اور یورپ میں چرچ کا ارتقاء شامل ہے۔ اس نے 'بربریت اور مذہب کی فتح' اور سلطنت کے زوال اور گراوٹ دونوں کو تلاش کیا۔ جیسا کہ پوکاک نے نوٹ کیا، سلطنت کے زوال کی تاریخ ہونے کا مطلب چرچ کے عروج کی تاریخ ہے۔ گبن نے ایک کافر ہونے کے باوجود ایک ممتاز مذہبی مورخ کی طرح تاریخ لکھی۔ الہیات اور اس فلسفے کا مطالعہ کیا جس نے اس کی بنیاد رکھی۔ گبن کی تاریخ کو کئی وجوہات کی بنا پر تعریف اور تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس نے عیسائیت اور یہودیت کے بارے میں منفی تبصرے کیے۔ اس نے مشرقی رومن (بازنطینی Byzantine) سلطنت میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس نے قدیم یونانی اور رومن معاشروں میں غلاموں کی بڑی تعداد پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی۔ مزید برآں، کچھ لوگوں نے اس کے یورو سینٹرک نقطہ نظر اور قدامت پسند سماجی اور سیاسی خیالات پر تنقید کی ہے۔

2.3.10 کنڈورسیٹ (Condorcet, 1743–1794)

کنڈورسیٹ، ایک فرانسیسی ریاضی دان، روشن خیالی کے آخری مفکرین میں سے تھے۔ ان کی تحریروں میں اٹھارویں صدی کے مختلف فلسفیانہ نظریات کا امتزاج تھا۔ وہ واحد فلسفی تھے جس نے 1789 کے فرانسیسی انقلاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ 'تمام شہریوں کی مکمل مساوات' اور لوگوں کے فطری حقوق پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ ان کے عقائد کی جڑیں جمہوریت اور ریپبلکنزم میں گہری تھیں۔ وہ فرانسیسی انقلاب کے بعد گیرونڈین (Girondins) کا پرجوش حامی بن گئے۔ اس نے 1793–1794 میں اسکیچ فار اے ہسٹوریکل پکچر آف دی پروگریس آف دی ہیومن مائنڈ (*Sketch for a Historical Picture of the Progress of the Human Mind*) تحریر کی۔ وہ اُس وقت جیکوبنز (Jacobins) کی قید میں تھا جہاں پر اس کی موت واقع ہوئی۔ اس کام میں انہوں نے انسانی تاریخ کی ایک وسیع تصویر پینٹ کی جو دس مراحل میں رونما ہوئی، جس کا آغاز ما قبل تاریخ (Prehistoric Culture) کے معاشروں سے شروع ہو کر مستقبل کے معاشرے (future society) پر اختتام پذیر ہوئی اور جو عقلی، سائنسی اور مکمل روشن خیالی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسانیت نے بے شمار چیلنجز پر قابو پالیا ہے اور اس سے ملحقہ ترقی لا محدود ہے، جو کہ صرف اور صرف انسانی کوششوں سے چلی ہے جس میں کوئی الوہی مداخلت نہیں ہے۔

اُس کا یقین تھا کہ انسانی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ انسانی نسل کا دو حصوں میں تقسیم ہونا تھا۔ 'علیحدگی' ایک استدلال کے خلاف اور دوسرا اس کے حق میں۔ اس تقسیم کا اکثر بے ایمان مذہبی رہنماؤں نے استحصال کیا جنہوں نے غلامی اور اندھی فرمانبرداری کی بدعتوں کو فروغ دیا۔ فلسفہ اور توہم پرستی کے درمیان کشمکش اس وقت شروع ہوئی جب قدیم یونان میں فلسفہ اور تہذیب کا ظہور ہوا۔ اس دوران ترقی تو ہوئی، لیکن عیسائیت کا عروج اور توہم پرستی نے سائنس اور فلسفہ دونوں کو زوال پذیر کیا۔ ابتدائی جدید دور میں پرنٹنگ کی ایجاد، جس نے کتابیں زیادہ وسیع پیمانے پر دستیاب کرائیں اور پادریوں سے کنٹرول ہٹا دیا، اس مسئلے کو حل کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ دور، جسے نویں مرحلے کے نام سے جانا جاتا ہے، گلیلیو، بیکن اور ڈیکارٹس کے دور سے روشن خیالی اور فرانسیسی انقلاب تک پھیلا ہوا تھا اور اس نے عقلی سوچ کو

مؤثر طریقے سے پھیلایا۔ اس نے پیشین گوئی کی کہ قوموں کی مساوات کا سلسلہ انقلاب فرانس اور اس کے آئین کے بعد سے ہی شروع ہوا تھا۔ نتیجتاً ہر معاشرے کے اندر مساوات ترقی کرے گی اور انسانیت مجموعی طور پر بہتر ہو جائے گی۔

انہوں نے نوآبادیاتی سرزمینوں (colonial territories) میں پر تشدد یورپی مداخلت کی بھی تنقید کی، جو مقامی لوگوں کے لیے بہت نقصان دہ تھی۔ انہوں نے کہا ''اگر آپ افریقہ اور ایشیا میں ہمارے اعمال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو ہمارے غیر منصفانہ کاروباری طریقے، ہماری دھوکہ دہی، مختلف رنگوں اور عقائد کے لوگوں کے ساتھ ہمارا ظلم، ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے میں ہمارا تکبر نظر آئے گا۔ انہیں ہمارے طرز زندگی میں تبدیل کرنے کی جارحانہ کوششیں، جن کی قیادت اکثر ہمارے پادری کرتے ہیں جو ہمارے اعلیٰ علم سے متاثر ابتدائی احترام اور خیر سگالی میں خلل ڈالتے ہیں۔'' لیکن اس کا خیال تھا کہ ایک وقت آئے گا جب آزادی، علم اور عقل پر مبنی یورپی تحریک افریقہ اور ایشیا تک پھیل جائے گی اور آخر میں تینوں خطوں کے لوگوں میں برابری اور ہم آہنگی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ عقلمندی اور حسن سلوک سے جابرانہ حکومتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بہت سے علماء لکیری ترقی (linear progress) کے خیال سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ خدا نے دنیا کو ایک خاص دن پر بنایا اور یہ قیامت کے دن ختم ہو جائے گی اور جب اچھائی برائی پر فتح پائے گی۔ اس کی نظر میں وہ انسانی ترقی کا دس مرحلہ کا ماڈل من مانی کا نمونہ ہے۔ ان کے اندر آپسی روابط کی کمی ہے۔

2.4 روشن خیال تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات

(Important Features of the Enlightenment Historiography)

روشن خیالی کی تاریخ نویسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی سے بہت حد تک آگے تھی۔ اس سے پہلے مورخین' سیاست اور حکمرانوں کے بارے میں لکھتے تھے۔ انہوں نے حقائق کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی تشریح پر توجہ دی۔ انہوں نے معاشرے اور ثقافت کو دیکھ کر تاریخ لکھنے کا ایک نیا انداز شروع کیا۔ انہوں نے مختلف تہذیبوں سے وابسطہ سے متعلق سیاسی اور تجارتی اداروں کا بغور مطالعہ کیا۔ انہوں نے حال کو ماضی کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ روشن خیال مورخین اپنے نقطہ نظر میں مذہبی نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی تاریخ کے پیچھے کوئی الوہی قوت نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہ ایک ترقی پسند اور عالمگیر تاریخ پر یقین رکھتے تھے۔ اب آیئے روشن خیالی کی تاریخ نویسی کی چند اہم خصوصیات کے بارے میں مختصراً بات کرتے ہیں۔

1. سترہویں صدی سے، نشاۃ ثانیہ کے بعد کے مفکرین اس بات پر بحث کر رہے ہیں کہ قدیم یا جدید دور بہتر ہے۔ یہ بحث 1680-1720 کے درمیان نمایاں تھی اور فرانس اور یورپ کے فکری منظر نامے پر اس کا بڑا اثر تھا۔ نتیجتاً مورخین میں ''تہذیب'' (Civilization) اور ''ثقافت'' (Culture) پر خوب بحث ہوئی تھی۔ جین بودن (Jean Bodin) نے سوال اٹھایا تھا کہ کیا قدیم اخلاق علم کے لحاظ سے بہتر تھا۔ اُن کا ماننا تھا کہ جدید دور اس لیے بہتر تھا کیونکہ اس میں عقل اور علم نہ کہ افسانوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ اُن کی نظر میں (a) قدیم مورخین نے اپنی تاریخوں میں کہانیاں بنائیں (b) قدیم تاریخ جدید دور کے لیے بے ربط تھی (c) قدیم تحقیق کے طریقے جدید کے مقابلے میں پرانے تھے اور (d) قدیم تاریخی تحریروں میں قصّہ اور افسانے شامل تھے۔ 18ویں صدی

کے وسط تک زیادہ تر لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ ماڈرنسٹ درست تھے۔

2. روشنائی کی تحریک چکراتی(Cyclical) تاریخ سے لکیری (Linear) تاریخ کی طرف ایک مکمل شفٹ تھا۔ یہ تبدیلی اس لیے آئی کیونکہ لوگوں نے جان بوجھ کر قدیم دور کو موجودہ سے جوڑنا بند کر دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پر یقین کرنے لگے۔ ترقی کا یہ نیا خیال ''عمومی اسباب'' کے تصور پر مبنی تھا جو انسانی کردار کی تشکیل میں نمایاں تھے۔ اس سے معاشرے کے ترقی کے مراحل آسان، اعلیٰ اور بہتر ہوں گے۔ ٹورگٹ نے اس کے تین مراحل تجویز کیے، کنڈورسیٹ نے دس مراحل اور سکاٹش روشن خیال مفکرین نے چار مراحل تجویز کیے۔

3. جدید دور میں ترقی کا نظریہ سب سے اہم مانا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت ماضی میں بہتر ہوئی اور بہتر ہو رہی تھی اور مستقبل میں بھی بہتر ہوتی رہے گی۔ اس مثبت تبدیلی کی وجہ سے علم بہتر ہوتا جا رہا تھا، لوگوں کی زندگی بھی بہتر ہو رہی ہے۔ جمہوری قدرتیں اور آزادیٔ رائے فروغ پا رہے ہیں۔ 18ویں صدی میں برطانیہ میں سکاٹش روشن خیال مفکرین اور جرمنی میں لیسنگ، کانٹ اور ہرڈر جیسے فلسفیوں کے ساتھ ساتھ فرانس میں ٹورگوٹ اور کنڈورسیٹ نے تقریباً یکساں طریقے سے آزادیٔ رائے کی ترجمانی کی۔ حالانکہ کچھ روشن خیال ہونے والے ترقی کے اثرات سے پُرامید کچھ لوگ اب بھی سوچتے تھے کہ حالات خراب نہیں تھے۔ ترقی کا خیال واقعی 19ویں صدی کی صنعت کاری انقلاب سے شروع ہوا جس نے بعد میں بہت سے یورپی ممالک کو زیادہ امیر بنا دیا۔ اس قسم کی ترقی کا آغاز روشن خیالی کے بعد کے سالوں میں شروع ہوا تھا۔

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

روشن خیالی تاریخ کا ایک اہم وقت تھا جس نے ماضی کو سمجھنے پر بہت زور دیا۔ اس نے تاریخ کے مطالعہ کو مذہبی عقائد سے ہٹ کر سائنسی نقطہ نظر کی طرف منتقل کرنے میں مدد کی۔ اس تبدیلی نے لوگوں کو تاریخی واقعات اور حقائق کو زیادہ معروضی طور پر جانچنے کا موقع دیا۔ روشن خیالی کے دوران، مورخین نے تاریخ لکھنے کے طریقے میں اہم شراکت کی۔ مثال کے طور پر، Montesquieu نے ان طویل المدتی عوامل پر روشنی ڈالی جو تاریخ کو تشکیل دیتے ہیں، جیسے کہ آب و ہوا اور جغرافیہ۔ والٹیئر نے تاریخ میں ثقافتی نقطہ نظر کا اضافہ کیا، بادشاہوں کے اعمال پر کم اور معاشروں کی ثقافت پر زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے عقل و استدلال کی اہمیت پر بھی زور دیا اور مشرقی ثقافتوں کی تعریف کی۔ سمتھ، فرگوسن اور رابرٹسن جیسے مفکرین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ معاشروں کی ترقی میں معیشتوں کا مرکزی کردار ہے۔ Turgot اور Condorcet انسانیت کی مسلسل ترقی پر یقین رکھتے تھے۔ ہیوم نے مونٹیسکوئیو کے عزم پر تنقید کی اور 'غیر ارادی نتائج' کے تصور کی حمایت کی۔ آخر میں، گبن نے فلسفے کو تاریخی روایت کے ساتھ ملایا، جس نے جدید تاریخی تحریر میں اہم کردار ادا کیا۔

2.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

عہد روشن خیالی (Age of Enlightenment) : اٹھارویں صدی میں، یورپ نے ایک اہم تحریک کا ظہور دیکھا

جسے روشن خیالی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یورپ مرکوز نظریہ (Eurocentric Ideology) : ایک ایسا نظریہ جس نے یورپی تاریخ کو سب سے اہم قرار دیا۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. روشن خیالی سے کیا مراد ہے؟
2. روشن خیالی کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیں۔
3. Montesquieu کے مطابق 'موسمیاتی تعین' کیا ہے؟
4. تورگوٹ کے تاریخی ترقی کے تصور پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. تاریخی ترقی کے سٹیڈیل یا سٹیج وار تھیوری سے آپ کی کیا مراد ہے؟
6. والٹیئر کے مطابق ' تاریخ کا فلسفہ ' کیا ہے؟
7. ڈی ایلمبرٹ کی تاریخی دانشورانہ روایت کی وضاحت کریں۔
8. ولیم رابرٹسن کے 'تاریخی ترقی کے چار مراحل کے ماڈل' کے بارے میں لکھیے۔
9. کیتھرین میکالے پر ایک نوٹ لکھیے۔
10. کنڈورسیٹ کی تجویز کردہ تاریخ کے غایاتی منصوبے (دس مرحلے) کی وضاحت کریں۔

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تاریخ نویسی میں مونٹیسکویو کی شراکت کے بارے میں مختصراً لکھیے۔
2. والٹیئر کے تاریخی نظریات اور طریقوں کا جائزہ لیں۔
3. ڈیوڈ ہیوم پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
4. تاریخ نویسی میں Diderot کی کیا شراکت ہے؟
5. انسانی معاشروں کی ترقی کے ٹرگوٹ کے تین مراحل کی وضاحت کریں۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. والٹیئر کی تجویز کردہ 'فلسفیانہ تاریخ' کی خصوصیات کی وضاحت کریں۔
2. 'گبن کی فلسفیانہ تاریخ اور علمی روایت کی ترکیب نے جدید تاریخ نویسی کی ترقی میں بہت زیادہ اضافہ کیا'۔ تبصرہ کریں۔
3. روشن خیالی کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات کی وضاحت کریں۔

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Karen O'Brien, *Narratives of Enlightenment: Cosmopolitan History from Voltaire to Gibbon*, Cambridge University Press, Cambridge, 1997.
2. Nair, Ashu J. and Srotoswini Borah, *History and Historiography: From Ancient to Modern World*, Rohan Vij, Delhi, 2018.
3. Pocock, J.G.A., *Barbarism and Religion*, Cambridge University Press, Cambridge, 1999.
4. Sankar Muthu, *Enlightenment against Empire*, Princeton University Press, Princeton, 2003.
5. Sreedharan, E., *A Textbook of Historiography, 500 B.C. to A.D. 2000*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
6. Upadhyay, Shashi Bhushan, *Historiography in the Modern World: Western and Indian Perspectives*, Oxford University Press, Delhi, 2016.

اکائی 3۔ نظریہ اثباتیت اور رانکے

(Positivism and Ranke)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 اثباتیت پسندی

3.2.1 اثباتیت کے اہم خصوصیات

3.3 رانکے: حیات اور ابتدائی کیریئر

3.4 رانکے کی تصنیفات اور ان کی نوعیت

3.5 رانکے کا فلسفہ تاریخ

3.6 رانکے کی فلسفہ تاریک کی تنقید

3.7 اکتسابی نتائج

3.8 کلیدی الفاظ

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

اثباتیت پسندی (Positivism) ایک نمایاں فلسفیانہ تحریک ہے جو انیسویں صدی کے دوران منظر عام پر آئی اور مجموعی طور پر سماجی سائنس کے دائرے کے ساتھ ساتھ تاریخی تحریر کے مخصوص حلقے پر بھی گہرے نقوش چھوڑ گئی۔ اس فلسفے کا ماہر رانکے تھا جن کی ادبی کوششوں اور فلسفیانہ نقطہ نظر نے عالمی سطح پر ایک تازہ روایت کو پیدا کیا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- فلسفہ اثباتیت کے بنیادی اصولوں اور ارتقاء سے واقف ہوں گے۔
- فلسفہ اثباتیت کے دائرے پر رانکے کے اثرات کو سمجھیں گے۔
- رانکے کی ادبی کوششوں اور فلسفیانہ نقطہ نظر کو عالمی سطح کے تناظر میں سمجھیں گے۔
- فلسفہ اثباتیت کے جوہر کو سمجھنے اور اس میں رانکے کی نمایاں شراکت کو تسلیم کریں گے۔

3.2 اَثباتیت پسندی (Positivism)

اَثباتیت اور تاریخ کی تحریر دو باہم جڑے ہوئے تصورات ہیں جنہوں نے تاریخ نویسی یعنی تاریخ کے مطالعہ اور تحریر کے میدان کو تشکیل دیا۔ اثباتیت ایک فلسفیانہ نقطہ نظر ہے جو انیسویں صدی میں منظر عام پر آیا۔ یہ دنیا کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تجرباتی ثبوتوں اور سائنسی طریقہ کار کے استعمال پر زور دیتا ہے۔ تاریخ کے تناظر میں اثباتیت نے مؤرخین کو متاثر کیا تاکہ وہ اپنی تحقیق، تجزیہ کو کیسے دیکھے۔ اثباتیت پسند مؤرخین نے تاریخی تحقیقات پر سائنسی طریقہ کار کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد طبعی علوم کی طرح ہی علم تاریخ کو سخت اور معروضی نظم ضبط کے طور پر قائم کرنا تھا۔ نظریہ اثباتیت حقائق پر مبنی اعداد و شمار (factual data) کے جمع کرنے، مقداری تجزیہ (quantitative analysis) کے استعمال اور قابل مشاہدہ مظاہر (observable phenomena) پر زور دیتی ہے۔ اس نظریہ سے متاثر مؤرخین نے تعصب اور ذاتی تشریح سے پاک، ایک منظم اور قابل تصدیق انداز میں تاریخی حقائق کو ظاہر اور پیش کرنے کی کوشش کی۔ تاریخ کے بارے میں مثبت نقطہ نظر کی روایتی سمجھ تین بنیادی روایات کے امتزاج سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

- فرانس کے ممتاز دانشور، آگسٹ کامتے (August Comte) کا فلسفہ اثباتیت اس نقطہ نظر کی بنیاد ہے۔ کامتے کے فلسفیانہ نقطہ نظر نے دنیا کو سمجھنے کے لیے تجرباتی اور اور سائنسی بنیادوں کو سامنے لایا اور اس کے اطلاق کو سماجی تحقیقت کے دائرے تک بڑھایا۔
- تجرباتی روایت جس کا تعلق کی مفکرین کے ایک سلسلے سے ہے، نے برطانوی فلسفیانہ اور تاریخی گفتگو کے اندر اس کی سب سے گہری گونج پائی۔ اس روایت کے اندر، تجرباتی ثبوت اور تجرباتی طریقہ کار پر تلفظ سب سے اہم تھا، جسنے تاریخ کی مطالعہ میں سخت تجرباتی تجزیہ کے لیے ایک رجحان کو فروغ دیا۔

- ممتاز جرمن مؤرخ لیوپولڈ وون رانکے(Leopold von Ranke)سے متأثر تاریخی روایت نے تاریخ پر اثباتیت نقطہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ رانکے کے طرقہ کار کے اصولوں نے معروضیت (objectivity)، پیچیدہ دستاویزاتی تحقیق (meticulous archival research) اور تاریخی واقعات کی قابل اعتماد نمائندگی (faithful representation of historical events) پر زور دیا۔ یعنی "wie es eigentlick gewesen" یا "جیسا کہ یہ حقیقت میں ہوا ہے"۔ اس روایت نے بنیادی مأخذ کی سخت جائزہ اور قیاس آرائیوں یا تخیلاتی داستانوں سے اجتناب کو فروغ دے کر تاریخی علمیت کے معیار کو بلند کیا۔ یہ تینوں روایات سے اس کی بنیاد بنتی ہیں، جسے اب ہم عام طور پر اثباتیت پسندی کے طور پر پہنچانتے ہیں، جو تجرباتی تحقیقات(empirical investigation)، سائنسی ضابطے کی پاندی(scientific rigor)اور تاریخی حقائق کو انتہائی وثوق (utmost fidelity) کے ساتھ نمائندگی کرنے کے عزم کو اہمیت دیتا ہے۔ ایک فرانسیسی مفکر، آگست کومتے(August Comte, 1857–1798)نے نظریہ اثباتیت پسندی بیان کیا ہے۔ اس نے روشن خیالی کی روایت (Enlightenment) tradition کی پیروی کی جو عالمگیریت پر یقین رکھتی تھی۔ روشن خیالی کے مفکرین کا خیال تھا کہ جو ایک معاشرے پر نافذ ہوتا ہے وہ باقی سب کے لیے درست ہے۔ اسی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ ایسے عالمگیر قوانین کی تشکیل ممکن ہے جو پوری دنیا کے لیے درست ہوں۔ کامتے نے بھی اس عالمی اصول کی حمایت کی لیکن وہ اس انفرادیت(individualism)کے خلاف تھے جس کی تبلیغ رومانیت پسند (Romanticists) کر رہے تھے۔ کومتے، سینٹ ہنری سائمن(Saint Henri Simon)کا شاگرد تھا، جو 1814 سے 1824 تک ایک یوٹوپیائی سوشلسٹ تھا۔

سینٹ سائمن کے علاوہ ان پر جان لاک (John Locke 1632–1704)، ڈیوڈ ہیوم (David Hume 1711–1776) اور امینوُل کانٹ (Immanual Kant, 1724–1804) کے دیگر اثرات تھے۔ یہ تمام اثرات اس کے اپنے فلسفے کے نظام کی تشکیل میں داخل ہوگئے۔ ان کی شائع کردہ اہم کتابیں، *The Course of Positive Philosophy* اور *Politics* تھیں جو 1830 سے 1842 تک چھ جلدوں میں شائع ہوگئی۔ اُن کی پہلی کتاب میں اس نے تاریخ کے بارے میں اپنے نظریاتی نمونہ(theoretical model)کی وضاحت کی۔ کامتے کے مطابق، تین مراحل کے ذریعے تمام تصورات اور علم کی یکے بعد دیگرے ترقی ہوئی۔ یہ مراحل زمانی ترتیب(chronological sequence)میں ہیں: 'تھیولوجِکَل یا فرضی' (theological or, fictitious)، 'مابعد الطبیعاتی یا تجریدی'(metaphysical or, abstract)اور 'سائنسی یا مثبت' (Scientific or, Positive)۔ ان تین مرحلوں میں سے پہلا مرحلہ وہ ہے جس سے انسانی ذہن لازمی طور پر گزرتا ہے۔ دوسرا مرحلہ عبوری (transitional) ہے اور تیسرا مرحلہ انسانی فہم کی حتمی (final)اور 'مقررہ اور یقینی حالت' (fixed and definite stage)ہے۔ کومتے تاریخ میں فکر کے اس ارتقاء اور بچپن سے جوانی تک فرد کی نشو نما کے درمیان ایک متوازی(parallel)بھی دیکھتا ہے۔ ان کے مطابق پہلے دو مراحل اب گزر گئے جب کہ تیسرا مرحلہ یعنی مثبت مرحلہ اُبھر چکا تھا۔

کومتے کا خیال تھا کہ مثبت مرحلے پر سائنس اور صنعت کا غلبہ ہے۔ کیونکہ اس دور میں سائنس دانوں نے ماہر الہیات (theologians)اور پادریوں کی جگہ لے لی ہے اور صنعت کاروں بشمول تاجروں، مینیجروں اور فائنانسرز نے جنگجوؤں کی جگہ لے لی ہے۔ کومتے سائنس کی مکمل بالادستی پر یقین رکھتے تھے۔ مثبت مرحلے میں مختلف مظاہر کے قوانین (the law of various phenomena) کی تلاش ہوتی ہے۔ کومتے کہتا ہے کہ 'استدلال اور مشاہدہ' (Reasoning and observation) اپنی جیسے قوانین کی پیداوار ہیں۔ بالآخر تمام الگ تھلگ مظاہر اور واقعات کا تعلق بعض عمومی قانین سے ہونا چاہیئے۔ کومتے کے لیے مثبت نظام اس صورت میں کمال حاصل کرلے گا اگر یہ تمام مظاہر کو کسی ایک عمومی حقیقت کے خاص پہلوؤں کے طور پر پیش کر سکے جیسے کشش ثقل (gravitation) میں ہے۔

لفظ 'تجربیّت' (Empiricism) یونانی لفظ 'ایمپیریا' (empeiria) سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے 'تجربہ' (experience)۔ فلسفہ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام علم کی بنیاد تجربے پر ہے اور صرف تجربہ ہی دنیا کے تمام علم کا جواز ہے۔ تجربیّت پسندوں (Empiricists) کے نزدیک روایت (tradition)، قیاس (speculation)، نظریاتی استدلال (theoretical reasoning) یا تخیل (imagination) کے ذریعے حاصل کیا جانے والا علم، علم کی صحیح شکل نہیں ہے۔ لہٰذا، مذہبی نظاموں (religious systems)، مابعد الطبیعاتی قیاس آرائیوں (metaphysical speculations)، اخلاقی تبلیغات (moral preachings) اور فن و ادب (art and literature) سے حاصل ہونے والا علم قابل تصدیق (verifiable) نہیں ہیں اور اس لیے قابل اعتبار (reliable) نہیں ہیں۔ تجربیّت پسندوں کا خیال ہے کہ علم کی واحد جائز شکل وہ ہے جس کی سچائی کی تصدیق کی جاسکے۔ تجربیّت کار (Empiricist) اور اثباتیت پسند (Positivist) دونوں اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ صرف قابل مشاہدہ دنیا (observable world) ہی حقیقی علم کا ذریعہ فراہم کرسکتی ہے۔ اس میں متن کو جسمانی یا مادی اشیاء (physical objects) کے طور پر شامل کیا جاتا ہے جو علم کا حصہ بن سکتے ہیں۔ وہ علم کے مابعد الطبیعاتی (metaphysical)، ناقابل مشاہدہ (unobservable) اور ناقابل تصدیق (unverifiable) طریقوں کو مسترد کرتے ہیں۔

برطانیہ میں ایک بہت مضبوط تجربیّت کی روایت (Empiricist) موجود تھی۔ سولہویں صدی میں فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا خیال تھا کہ دنیا کی درست تصویر صرف مشاہدہ اعداد و شمار کے جمع کرنے (collection of observed data) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس نے سائنسی بنیادوں پر فلسفیانہ تحقیقات (philosophical inquiries) کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ سترہویں صدی میں، جان لاک (John Locke) سرکردہ تجربیّت کار (Empiricist Philosopher) فلسفی تھا۔ برطانیہ کے دیگر اہم تجربیّت کار فلسفی جارج برکلے (George Berkeley, 1685–1753)، ڈیوڈ ہیوم (David Hume, 1711–1776) اور جان اسٹُورٹ مل (John Stuart Mill, 1806–1873) تھے۔ تجرباتی نظریات کا خیال ہے کہ ہمارے حواس یعنی آنکھیں، کان، ناک وغیرہ دنیا کی چیزوں اور واقعات کے آئینے کے طور پر کام کرتے

ہیں۔ان ہی تاثرات کی بنیاد پر ہم دنیا کو سمجھتے ہیں اور چیزوں اور واقعات کے درمیان تعلق قائم کرتے ہیں۔ دنیا اپنی تمام تفصیلات میں اس سے مطابقت رکھتی ہے کہ ہم اسے زبان میں کیسے بیان کرتے ہیں۔اس طرح جب ہم آلو کہتے ہیں تو یہ فطرت میں ایک خاص مادی چیز کی بالکل نشاندہی کرتا ہے۔

تجربیّت (empiricism) کی بنیادی اصول یہ ہے کہ علم بنیادی طور پر حسی تجربے (sensory experience) اور مشاہدے (observation) سے حاصل ہوتا ہے۔ تجربیّت پرستی (empiricism) ایک فلسفیانہ اور علمی نقطہ نظر (philosophical and epistemological) ہے جو علم کے حصول کی بنیاد کے طور پر ہمارے حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے ثبوت کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل تجربیّت (empiricism) کے کچھ اہم اصول ہیں:

- تجربیّت پسندوں (empiricists) کا کہنا ہے کہ تمام علم حسی تجربات (sensory experiences) سے شروع ہوتا ہے، جیسے دیکھنا، سننا، چھونا، چکھنا اور سونگھنا۔ یہ تجربات وہ خام اعداد و شمار (Raw Data) فراہم کرتے ہیں جس سے ہم دنیا کے بارے میں اپنی سمجھ پیدا کرتے ہیں۔
- تجربیّت پسندوں (empiricists) کا خیال ہے کہ تجرباتی یا قابل مشاہدہ (empirical or observable) ثبوت علم سب سے قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ وہ تجریدی استدلال یا قیاس آرائیوں (abstract reasoning or speculation) کے مقابلے ٹھوس، قابل مشاہدہ حقائق اور تجربات کو ترجیح دیتے ہیں۔
- تجربیّت پرستی (empiricism) میں اکثر آمادہ استدلال (inductive reasoning) شامل ہوتا ہے، جو مخصوص مشاہدات سے عمومی نتائج اخذ کرنے کا عمل ہے۔ ایک رجحان کے متعدد واقعات کا مشاہدہ کرکے، تجربہ کار عام اصول یا قوانین (general principles or laws) وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
- تجربیت پسند (empiricists) عام طور پر ترجیحی علم کے تصور کو مسترد کرتے ہیں، جو کہ وہ علم ہے جو حسی تجربے سے آزاد ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ جن تصورات اور سچائیوں (concepts and truths) کو حسی تجربے سے نہیں دیکھا جاسکتا انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے یا مسترد کر دینا چاہئے۔
- بہت سے تجربیّت پسند (empiricists) سائنسی طریقہ (scientific method) کو علم حاصل کرنے کا سب سے قابل اعتماد طریقہ قرار دیتے ہیں۔ تجرباتی شواہد کی بنیاد پر منظم مشاہدہ (systematic observation)، تجربہ اور مفروضوں اور نظریات کی تشکیل شامل ہے۔
- تجربیّت پسندوں (empiricists) کا خیال ہے کہ نظریات اور مفروضے (theories and hypotheses) تجرباتی جانچ اور تصدیق کے تابع ہونے چاہئیں۔ اگر کسی دعوے کو مشاہدے اور تجربات کے ذریعے جانچ یا تصدیق نہیں کی جاسکتی ہے، تو اسے اکثر غیر معتبر یا غیر سائنسی (unreliable or unscientific) سمجھا جاتا ہے۔

- تجربیّت پسندوں (empiricists) کے نزدیک مؤرخین کو ماضی کے بارے میں ان شواہد پر بھروسہ رکھنا چاہئے جو معاصرین نے اپنے حسی تاثرات کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش کیے ہیں اور اگر مؤرخین ان ماخذات کو باریک بینی سے دیکھیں تو وہ ماضی کی صحیح تصویر پیش کر سکتے ہیں۔

تاریخ نگاری کے مثبت نقطہ نظر (Positivist Approach) کے کئی مضمرات تھے۔ سب سے پہلے، اس نے دستاویزاتی تحقیق (archival research) اور بنیادی ماخذ کے معائنہ پر زور دیا۔ اثباتیت پسند مؤرخین (Positivist Historians) کا خیال تھا کہ ماضی کی اصل دستاویزات اور نمونوں کا تجزیہ کر کے تاریخی حقائق کو قائم کیا جاسکتا ہے۔ تجرباتی شواہد پر اس توجہ نے تاریخی داستانوں اور دلائل کے لیے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا، اثباتیت پسندی (Positivism) نے زیادہ معروضی (objective) اور الگ الگ تحریری انداز کی حوصلہ افزائی کی۔ اثباتیت پسند مؤرخین (Positivist Historians) کا مقصد تاریخی واقعات اور عمل کو غیر جانبدارانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرنا، ذاتی تعصبات اور موضوعی تشریحات (personal biases and subjective interpretations) سے گریز کرنا ہے۔ قیاس آرائی یا موضوعی رائے (speculative or subjective opinions) پیش کرنے کے بجائے حقائق اور ثبوت پیش کرنے پر زور دیا گیا۔ تیسرا، اثباتیت (positivism) نے تاریخی بیانیات کی ساخت اور تنظیم کو متاثر کیا۔ اثباتیت پسند مؤرخین (positivist historians) نے اکثر تاریخ کو ایک خطی اور ترقی پسند ترقی (linear and progressive development) کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی، جس میں وجہ تعلقات (relationships) اور معروضی عوامل (objective factors) جیسے معاشی، سیاسی اور سماجی قوتوں کے اثرات پر زور دیا گیا۔ اس نقطہ نظر کا مقصد تاریخی تبدیلی کو قابو کرنے والے نمونوں اور قوانین کی نشاندہی کرنا اور تاریخ کو ایک معروضی سائنس (objective science) کے طور پر پیش کرنا تھا۔

3.2.1 اثباتیت کے اہم خصوصیات (Important Features of Positivism)

اثباتیت کے مندرجہ ذیل اہم خصوصیات ہیں:

- تجربیّت یا تجربہ پسندی (Empiricism): اثباتیت پسندی (positivism) علم اور تفہیم کی بنیاد کے طور پر تجرباتی شواہد (empirical evidence) پر بہت زیادہ زور دیتی ہے۔ یہ اعداد و شمار جمع کرنے (to gather data) اور دنیا کے بارے میں دعووں کی توثیق کرنے کے لیے مشاہدے (observation)، تجربہ (experimentation)، اور حسی تجربے (sensory experience) کے استعمال کی وکالت کرتا ہے۔
- سائنسی طریقہ کار (Scientific Method): اثباتیت پسند (positivists) تحقیقات کے تمام شعبوں بشمول سماجی علوم پر سائنسی طریقوں کے اطلاق کی وکالت کرتے ہیں ۔ ان کا ماننا ہے کہ سائنسی طریقہ کار، منظم مشاہدے (systematic observation)، مفروضے کی جانچ (hypothesis testing)، اور نقل کرنے پر اپنی توجہ کے ساتھ، علم حاصل کرنے کا

سب سے قابل اعتماد ذریعہ فراہم کرتا ہے۔

- معروضیت (Objectivity): اثباتیت پسند (positivists) اپنی تحقیقات میں معروضیت (objectivity) کے لیے کوشش کرتے ہیں ، جس کا مقصد ذاتی تعصبات (personal biases) اور موضوعی تشریحات (subjective interpretations) کو ختم کرنا ہے۔ وہ آفاقی قوانین (universal laws) اور عمومیات (generalisations) قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا مختلف سیاق وسباق میں معروضی (objectively) طور پر اطلاق کیا جاسکتا ہے۔
- تصدیق اور غلط فہمی (Verification and Falsifiability): اثباتیت پسند (positivists) تجرباتی ثبوت (empirical evidence) کے ذریعے علمی دعووں کی تصدیق کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ مفروضوں (hypotheses) کی تشکیل کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جن کا تجربہ کیا جاسکتا ہے اور ممکنہ طور پر غلط ثابت کیا جاسکتا ہے۔ سائنسی نظریات (scientific theories) اور وضاحتیں صرف اسی صورت میں درست سمجھی جاتی ہیں جب ان کی تجرباتی طور پر تصدیق یا غلط ثابت ہو جائیں۔
- مابعد الطبیعاتی مخالف موقف (Anti-Metaphysical Stance): مابعد الطبیعاتی یا قیاسی استدلال (metaphysical or, speculative reasoning) کو علم کے جائز ذریعہ کے طور پر اثباتیت پسندی (positivism) مسترد کرتی ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ علم کی بنیاد تجریدی یا مافوق الفطرت تصورات (abstract or supernatural concepts) کی بجائے صرف قابل مشاہدہ حقائق (observable facts) اور منطقی استدلال (logical reasoning) پر ہونی چاہیے۔

3.3 رانکے: حیات اور ابتدائی کیریئر (Ranke: Life and Early Career)

لیوپولڈ وان رانکے (Leopold von Ranke, 1795–1886) ایک ممتاز جرمن مؤرخ اور جدید تاریخ نویسی کی ترقی میں سب سے زیادہ بااثر شخصیات میں سے ایک تھا۔ 21 دسمبر 1795 کو تُورِنگن (Thuringia) کے وِیاہ (Wiehe) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تاریخ میں ابتدائی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنی پوری زندگی اپنے اس شوق کو اپنایا جس سے اس میدان پر دیرپا اثر پڑے۔

جہاں تک اس کے آباواجداد کا تعلق ہے، وہ آزادانہ طور پر تعلیم یافتہ لوگ تھے اور ماسوائے رانکے کے والد کے سب پادری تھے۔ ان کے والد گوٹلوب ازائیل (Gottlob Isreal)، جس نے لیپزگ یونیورسٹی (University of Leipzig) میں قانون کو اپنا مضمون بنایا، لیکن بعد میں اسے اپنے انتخاب پر افسوس ہوا اور اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے لیوپولڈ (Leopold) کو پادری بننے کی ترغیب دی۔ لٰہذا، لیوپولڈ نے کلاسیکی سلسلے کے ساتھ لیپزگ میں علم الٰہیات کی تعلیم لی۔ اور ایک بار فرینکفرٹ کے چرچ میں اپنے بھائی کے حکم سے تبلیغ کی۔ جب کہ اس کا ایک بھائی درحقیقت پادری بن گیا، تو لیوپولڈ اور باقی تین بھائی جو پادری سے مختلف تھے پروفیسر بن گئے۔ تاریخی تحقیقات رانکے نے فن تاریخ میں ایک قابل ذکر مثال قائم کی۔ اس نے ادینا کی تاریخ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور نوے سال کی عمر تک اسی ذہنی جوش کے ساتھ جاری رکھا۔

وہ انقلابی ماحول کے جنگی اور سیاسی ہنگامہ آرائی کے دور میں پیدا ہوئے۔ اسی سال جمہوریہ فرانس کی فوج نے جرمنی پر اپنا کامیاب حملہ شروع کیا اور اسی سال پُروشیا (Prussia) نے خفیہ معاہدے کے ذریعے راین ندی کا بایاں کنارہ فرانس کے حوالے کر دیا۔ یہ پرانی جرمن سلطنت کے خاتمے اور نیپولین بوناپارٹ کے جاگیر دارانہ یوروپ کی سیاسی تعمیر نو کا آغاز تھا۔ جب رانکے چھوٹا تھا اس نے فرانسیسی حملہ آوروں کے فوجی مارچ کو اسکول کے دروازے سے گزرتے دیکھا۔ اس نے جینا (Jena) اور ہاؤبڈاٹ (Haubstadt) میں فرانسیسیوں کی دور دراز توپوں کی آواز سنی۔ اس کا پڑھنے اور لکھنے کا سبق اسپینش جزیرہ (Spanish Island) کا نیپولین پُلیٹن تھا۔ "باغی" (insurgent) کا لفظ سب سے پہلے اس کے ذخیرہ الفاظ میں ہسپانوی (اسپَینش) بغاوت کی پیش کش کے شائع شدہ اکاؤنٹ سے آیا تھا جسے یوروپ کی آزادی کے خاطر روس اور پرشیا کی بڑی تحریک کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ جب ماسکو سے عظیم الشان فوج نے جرمنی میں داخلہ شروع کیا تو پسپائی کی خبر آئی۔ اس وقت نوجوان رانکے ٹَسِٹَس کا اَگریکولا (the Agricola of Tacitus) پڑھ رہا تھا۔ رانکے خود کہتے ہیں کہ "کلوئسٹر (cloister) کی دیوار کے اندر اور کلاسیکی علوم کے درمیان، جدید دنیا سب سے پہلے میرے ذہن میں آئی۔" نیپولین کی جنگوں کے بعد یہ تاریخی اثر ورسوخ تھیں جس نے رانکے کو جدید تاریخ کے دروازے تک پہنچایا۔

رانکے نے اپنا تعلیمی سفر لیپزِگ یونیورسٹی سے شروع کیا، جہاں اس نے الٰہیات اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ حالانکہ ان کا حقیقی جذبہ تاریخی تحقیق میں تھا۔ اس نے جلد ہی اپنی توجہ تاریخ کے مطالعہ پر مرکوز کر دی۔ اس نے برلن یونیورسٹی میں اپنی تعلیم جاری رکھا، جہاں اس نے اپنے آپ کو اس وقت کے فکری اور ثقافتی ماحول میں غرق کر دیا۔ 1824 میں رانکے نے اپنا بنیادی تصنیف "دی ہسٹری آف لیٹن اند ٹیوٹونک نیشنس فرام 1494 ٹو 1514" (*The History of the Latin and Teutonic Nations from 1494 to 1514*) شائع کیا۔ اس کتاب نے بڑے پیمانے پر توجہ حاصل کی اور ایک سخت اور پیچیدہ مورّخ کے طور پر اپنی وقار قائم کی۔ اس میں، اس نے بنیادی ماخذ پر انحصار کرنے اور تاریخی واقعات کو پیش کرنے کی اہمیت پر زور دیا جیسا کہ وہ واقعتاً پیش آیا اور اس طرح اس نے اپنے فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھی۔

باضابطہ تحقیق اور معروضیت کے لیے رانکے کی لگن نے انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کر دیا۔ انہوں نے مورّخین کو ماضی کے بارے میں زیادہ درست اور باریک بینی سے سمجھ فراہم کرنے کے لیے اصل دستاویزات، خطوط اور دیگر بنیادی ذرائع کو دیکھنے کی وکالت کی۔ تاریخی تحقیقات کی بنیاد کے طور پر بنیادی ماخذ اور تجرباتی شواہد پر ان کا زور دینا ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ اپنے پورے کیریئر کے دوران رانکے نے 1825 سے 1871 تک برلن یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کے ساتھ ساتھ مختلف تعلیمی عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے متعدد طلباء کو تربیت دی جو خود بااثر مورّخین بنیں اور اپنے طریقہ کار کے اصولوں کو پورے یوروپ میں اور اس کے باہر پھیلا دیں۔

رانکے کا اثر اس کی علمی شراکت سے آگے بڑھا۔ اس کے فلسفہ تاریخ نے تاریخ نویسی سے افراد اور ان کے محرکات کے تجزیے کی طرف مبذول کر کے تاریخ سازی کے میدان کو تبدیل کر دیا۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات کو تشکیل دینے والے سیاق وسباق کے عوامل پر زور

دیا۔ یہ نقطہ نظر جسے اکثر ”رانکیَن طریقہ کار“ (Rankean Method) کے نام سے جانا جاتا ہے، جو تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ رانکے کے تصنیفات اور خیالات نے مؤرخین کی نسلوں کو متاثر کیا اور اس کا اثر دنیا بھر میں تاریخ کے علمی ترقی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے فلسفے نے تاریخ کو ایک سخت گیر تعلیمی نظم و ضبط (rigorous academic discipline) کے طور پر قائم کرنے میں مدد کی، جس نے تاریخ نویسی کے اندر مختلف مکاتب فکر کے ظہور کی راہ ہموار کی۔

3.4 رانکے کی تصنیفات اور ان کی نوعیت (Ranke's Works and Nature of Writing)

لیوپولڈ وان رانکے ایک قابل مصنف تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کے دوران متعدد تاریخی کام پیش کیے۔ ان کی پہلی کتاب فرینکفرٹ میں لکھی گئی تھی، جہاں انہیں 1818 میں فرینکفرٹ جمنازیَم یا کلاسیکی اسکول (Frankfurt Gymnasium or Classical School) میں پڑھانے کے لیے استاد کی حیثیت سے پڑھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ یہ کتاب 1824 میں شائع ہوئی، جب رانکے انیتس سال کے تھے۔ یہ رانکے کی تحریروں کے مطالعے کا بہترین تعارف ہے، جیسا کہ مصنف نے خود بعد کی زندگی میں کہا تھا کہ یہ جدید تاریخ کا پیش خیمہ ہے اور مصنف کے بعد کے بیشتر تصانیف کی تیاری پر مشتمل ہے۔ تاریخی تنقید سے متعلق ان کے اصول و نظریات واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں اور اس کتاب کو جرمنی میں اب بھی رانکے کے طریقہ کار کی بہترین عمومی نمائش کے طور پر شمار کیا جاتا ہے۔

ان کی کتاب *History of the Latin and Teutonic Nations* کافی مشہور رہی ہے۔ اس کتاب کا آغاز رانکے کے چند دلیرانہ اور دلکش سطروں میں خاکہ نگاری سے ہوتا ہے۔ ان سطروں میں ان عظیم حقائق کو بیان کیا گیا ہے جو لاطینی اور ٹیوٹونک اقوام کے لازمی اتحاد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایک طرف، اطالوی، فرانسیسی اور ہسپانوی اور دوسرے طرف، جرمن، انگلش اور اسکنڈنَوین تھے۔ رانکے کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چھ افراد داخلی تاریخ کے ایک ہی مراحل سے گزرے ہیں اور سب کے سب ایک ہی بیرونی تجربے کے عظیم دھارے سے گزرے ہیں۔ یوروپین تاریخ کی اہم معاون ندیوں کو عظیم جدید دھارے میں ایک ساتھ بہتا دیکھا جاتا ہے جو ایک نئی دنیا میں ہو رہا تھا۔ اس میں تین مربوط واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلا نقل مکانی (the migrations)، دوسرا صلیبی جنگیں (the Crusades)، جو نارمنوں (Normas) کے ذریعہ شروع کی گئیں، جنہوں نے اٹلی پر ٹیوٹونک حملے کو ختم کیا اور تیسرا، نئے ممالک کی نوآبادیات (the colonization of new countries)۔ رانکے کے مطابق یہ تین عظیم حقائق وقت اور لوگوں دونوں کو جوڑتے ہیں۔ 'اگر میں کہہ سکتا ہوں تو وہ یہ ہیں کہ اس بے مثال اتحاد کی تین عظیم سانسیں ہیں۔' نتیجہ خیز جدوجہد جدید تاریخ کی سب سے بڑی دلچسپی ہے۔ رانکے کی تعارفی تصانیف 1494 سے 1514 تک کے مختصر عرصے کا احاطہ کرتا ہے۔ جدید سیاسی تاریخ کا آغاز چارلس ہشتم کے اٹلی پر فرانسیسی حملے سے ہوتا ہے اور اٹلی سے فرانسیسیوں کو نکالنے پر ختم ہوتا ہے۔

کتاب کے ضمیموں میں رانکے نے ابتدائی جدید تاریخ کی ادبی بنیادوں کا جائزہ لیا۔ اس نے دو نمائندہ اطالوی مؤرخین میکیاولی (Machiavelli) اور گسیارڈینی (Guicciardini) دو جرمن مؤرخین اور ایک ہسپانوی اور ایک فرانسیسی اتھارٹی کے تصانیف

پر بہت غور کیا۔ ہر معاملے میں رانکے کا مقصد یہ تھا کہ مصنف کے بیانات کس حد تک اصلی اور قابل اعتماد ہیں۔ رانکے میکیاولی کے کردار کو ثابت کرنے والے پہلے دانشوران میں سے ایک تھے۔ دوسری طرف، وہ گیکیارڈینی کو بے نقاب کرنے والا پہلا شخص تھا جس کی تاریخ کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی اور اسے رومانوی اثر سے لکھا گیا تھا۔ رانکے کی پہلی کتاب ایک فوری کامیابی تھی۔ رانکے کو 1825 میں برلن یونیورسٹی میں بلایا گیا تھا، حالانکہ 1836 تک اسے مکمل پروفیسر نہیں بنایا گیا تھا۔ فرینکفرٹ میں اس نے صرف چھپی ہوئی کتابیں استعمال کی تھیں۔ برلن میں جوہانس وون ملر (Johannes von Miller) کی پیروی کرتے ہوئے، وہ چالیس فولیو جلدوں میں وینشین سفیروں کے مخطوطہ کے تعلقات پر آیا۔ وہ اصل نہیں بلکہ نقلیں تھیں۔ ایک زمانے میں شہزادوں اور رئیسوں کا فیشن تھا کہ وہ اپنی ذاتی کتب خانوں کے لیے سرکاری کاغزات اور سفارتی خط و کتابت کی کاپیاں محفوظ کر لیتے تھے۔ وینیشین ڈسپیچ ہمیشہ قیمتی تھے، کیونکہ وہ بہترین اور مکمل تھے۔ وینس میں یوروپ کا بہترین سفارتی نظام تھا۔ جو اپنے سفیروں کو روم، میڈرڈ، پیرس، ویانا اور قسطنطنیہ میں گردش کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ وہ اعلی عدالتوں اور تجارتی مراکز میں نمائندے رکھتے تھے۔ اسے ہر پندرہ دن میں سفارتی رپورٹس کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ سینیٹ کو پڑھ کر سنائی جاتی تھیں، جس میں کئی ایسے سفارت کار موجود تھے جو برسوں کے تجربے کے بعد غیر ملکی خدمات سے ریٹائر ہوئے تھے۔ نتیجتا، وینس کے سفیروں نے اپنے مشاہدات اور فیصلوں کے درستگی کے لیے بہت تکلیف اٹھائی تھی، ورنہ وہ ہوم گورنمنٹ کی بدنامی کا شکار ہو جاتے۔

جدید یوروپی تاریخ کے اس نئے ماخذ کا احترام کرتے ہوئے جسے رانکے نے برلن کی شاہی کتب خانہ میں دوبارہ دریافت کیا تھا۔ اس نے کہا، "تاریخ کے اس عظیم دور میں جو بھی واقعہ ہو جس کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو، یہاں اسے عموما احتیاط سے تیار کردہ رپورٹیں ملیں گی۔ مسئلہ کو حل کرنے میں مدد کرنے کے لیے تقریبا ہمیشہ موزوں ہے۔" رانکے نے چالیس فولیو والے سارے جلدوں کے پورے برلن مجموعہ پر نظر دوڑائی، جس کے بعد گوتھا میں ایک درجن مزید جلدیں ملیں، جس میں سے ایک اس نے اپنے لیے حاصل کیا تھا۔ اس طرح کے مواد کے ذخیرہ کی بنیاد پر، رانکے نے جدید یوروپی ریاستوں کے مورخ کے طور پر اپنے عظیم کیریئر میں قدم رکھا۔ 1827 میں ان کی *Princes and Peoples of Southern Europe in the Sixteenth and Seventeenth Centuries* شائع ہوئی، جو عثمانی ترکوں اور ہسپانوی بادشاہت سے متعلق پہلی جلد تھی۔ 1827 سے 1831 تک اسے غیر ملکی آرکائیوز ن کے مطالعہ کے لیے چار سال کی چھٹی کی اجازت دی گئی۔ اس نے ویانا، روم، فلورنس اور وینس کی کتب خانوں کا دورہ کیا جہاں ہر جگہ جدید یوروپی تاریخ کے لیے تازہ اور قیمتی مواد دریافتیں کیں۔ اٹلی میں رانکے کی تحقیق کا موازنہ نئی دینا کے ہمبولٹ (Humboldt) کے مشاہدات سے کیا گیا ہے۔ کتب خانوں اور آرکائیوز مورخ کے لیے وہی چاہت رکھتا ہے جو نیچرل سائنس کے طالب علموں کے لیے لیباریٹری اور فطرت رکھتی ہیں۔ اطلاوی زبان میں رانکے کی تصانیف، خاص طور پر وینیشین آرکائیوز، جدید تاریخ کے مطالعہ میں ایک عہد کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس سے پہلے مورخین طباعت شدہ کتابوں اور دوسرے لوگوں کی رائے سے مطمئن تھے۔ رانکے سیاسی معاملات کو سمجھنے معلومات کے لیے اُن کے ابتدائی ذرائع (primary sources)، ریاستی کاغذات (state papers)، سفارتی خط و کتابت (diplomatic correspondence) اور اصل دستایزات (original documents) تک گئے۔ آرکائیوز میں اس

طرح کی افواہوں کے بارے میں، رانکے نے ایک بار کہا تھا: "اسے کسی قسم کی ترس کی ضرورت نہیں ہے جو خود کو ان بظاہر خشک مطالعہ میں مصروف رکھتا ہے اور ان کی خاطر بہت سے خوشگوار دنوں کی خوشی سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ مردہ کاغذات ہیں، لیکن وہ زندگی کی یادیں جو آہستہ آہستہ ذہن کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ اٹھتی ہیں۔" رانکے نے تاریخ میں ماضی کی لافانیت کو دیکھا۔

رانکے کے اطالوی مطالعات کا سب سے قابل ذکر نتیجہ ان کی مشہور تصنیف ''ہسٹری آف دی پوپس آف روم ان چرچ اینڈ ایسٹیٹ اِن دی سِکسٹینتھ اینڈ سوینٹینتھ سنچریز'' (*History of the Popes of Rome in Church and State in the Sixteenth and Seventeenth Centuries*) ہے۔ اس کتاب کو رانکے کا شاہکار سمجھا جاتا تھا۔ اس تصنیف نے ایک طاقتور فکری ڈھانچہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تفصیلی بیانیہ (detailed narrative) اور عام موضوع (general theme) سے متعلق سوانحی خاکہ (biographical sketch) زور دیا ہے۔ رانکے نے اپنے موقف کا اعلان کیا اور اس کا خیال تھا کہ اس کی غیر جانبداری کو تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ ایک جرمن پروٹسٹنٹ تھا اور اس طرح وہ پوپ کے دفاع کے لیے کسی بھی قسم کے جھکاؤ سے پاک تھا جس کی اہمیت پروٹسٹنٹ سے اس خوف کو دور کر دیتی ہے جو حملے کو متاثر کر سکتا ہے۔ مؤرخین کی خود کی تنقید اور اس کے برعکس موقف بیان کرنے کے عزم نے غیر معمولی حد تک انصاف حاصل کیا۔ پوپ کے سوانحی خاکے اکثر شاندار ہوتے ہیں۔ ایک عیب رومی اور پوپ کے مأخذ کی محدود تعداد ہے جسے اس نے استعمال کیا۔

رانکے فطرتاً سیاست کے معاملے میں قدامت پسند تھے۔ 1828 سے 1836 تک وہ اور سیوگنی (Savigny) نے 'Historische-politische Zeitschrift' کی تدوین کی، جو اس دور کے لبرل اور جمہوری جذبے کے واضح طور پر مخالف تھی۔ رانکے کا تعلق ایک سیاسی رد عمل کے دور سے تھا۔ محتاط سیاستدان فرانس کی طرف سے جنم لینے والے انقلابی جذبے سے بے اعتمادی سے منہ موڑ رہے تھے۔ دانشور پر زور دیا گیا کہ وہ ایک شاندار ماضی کے علم کو زندہ کر کے موجودہ معاشرے کی بنیادوں کو مضبوط کریں۔ یہ تاریخی مطالعہ کے لیے سب سے زیادہ سازگار دور تھا، لیکن مقبول طریقوں سے سیاسی ترقی کے لیے نہیں۔ قدامت پسند طریقوں کے ذریعے دانشوروں اور سیاستدانوں نے جرمنی کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی امید ظاہر کی۔

نہ صرف جرمنی بلکہ جدید یوروپ پر امن اور سائنسی تعمیر نو کے اس عمل میں رانکے دل و جان سے داخل ہوئے۔ وہ نمایاں طور پر ایسے شخص تھے جس نے جرمنی کے نوجوان نسل کو اس تاریخی مواد کو استعمال کرنے کا طریقہ سکھایا جسے پرٹز (Pertz) نے جمع اور شائع کرنا شروع کیا تھا۔ رانکے نے ابتدائی طور پر برلن یونیورسٹی میں ایک تاریخی مدرسہ قائم کیا، یا جیسا کہ اس وقت اسے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے اصل ذرائع کے تنقیدی استعمال کے لیے تاریخی مشقیں (historical exercises) کہا جاتا تھا۔ جب کہ اس کا اپنا کام جدید میدان میں کئی سالوں سے تھا۔ اس نے اپنے طلباء کو عہد وسطیٰ کے دور کو ترجیح دی، جہاں مواد کو بہتر طریقے سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اعلیٰ درجے کے طالب علموں کی ایک چھوٹی سی کمپنی ہفتے میں ایک بار رانکے کی اپنی کتب خانہ میں ملتی تھی اور ان کی ہدایت پر، تنقیدی طریقہ کو لاگو کرنا سیکھتی تھی۔ یہ

تاریخ میں مشہور رانکے مکتبہ فکر (Ranke School) کی ابتداء تھی۔

جدید تاریخ کے لیے رانکے کی اہم سرگرمی جاری رہی۔ 1839 سے 1847 تک چھ جلدوں میں ان کی "ہسٹری آف جرمنی اِن دی پیریڈ آف دی ریفارمیشن" (*History of Germany in the Period of the Reformation*) شائع ہوئی۔ اس عظیم کام کے لیے تازہ مواد فرینکفرٹ میں 1414 سے 1613 تک جرمن ڈائیٹ کی پروسیڈنگس میں چھیانوے فولیو جلدوں میں ملا۔ تقریباً یہ دستاویزات بھی وینس کے سفیروں کے تعلقات کی طرح اہم ثابت ہوئے۔ رانکے نے اپنی جرمن تاریخ کے لیے ریکارڈ اور رپورٹس کے چونسٹھ فولیو جلدوں کو استعمال کیا۔ قابل ذکر آزادی کے ساتھ، فرینکفرٹ کے حکام نے رانکے کو اجازت دی کہ وہ اپنی لائبریری میں استعمال کرنے کے لیے اس عظیم مجموعہ سے منتخب شدہ دستاویزات برلن لے جائے۔ اس کے علاوہ، ان کی تاریخی تحقیق کے لیے دیگر میونسپل آرکائیوز جیسے ویمار کے رکارڈس (records at Weimar) کھولے گئے تھے۔ اسی طرح پروشیا، اور سیکسنی کے شاہی آرکائیوز (the archives of Prussia and Saxony) بھی اس کی خدمت میں رکھے گئے تھے۔ اس سخاوت سے رانکے نے اپنے کام کے لیے بالکل نئے مواد کا ایک وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا۔ معلومات کے تازہ ماٰخذ سے حاصل کی گئی نئی شراکتیں تاریخ لکھنے کے لیے ہمیشہ رانکے کا مقصد تھا۔ ان کے نزدیک ان چیزوں سے جن کو لوگ پہلے سے ہی جانتے ہیں ان سے تعلق نہ رکھنا بھی ان کا مقصد تھا۔ ان خیالات نے نہ صرف یوروپی تاریخ میں رانکے کی شراکتوں کو بلکہ ان کے طلباء کی شراکتوں نے بھی تاریخی سائنس کے دائرہ کار کو وسیع کیا ہے۔

رانکے کی جرمن تاریخ کے بعد ان کی 'پروشئین تاریخ کی نو کتابیں' (*Nine Books of Prussian History*) تھیں، جس کے بعد یہ تصانیف بارہ کتابوں تک چلی گئی۔ یہ خصوصی شراکت جزوی طور پر اس حقیقت کی وجہ سے تھی کہ 1846 میں رانکے کو پرشیا کا مؤرخ بنا دیا گیا۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا جس پر وہ اپنی موت تک فائز رہے اور جس نے بلاشبہ پروشیا کے مزید تعاون کا مشورہ دیا۔ جرمنی سے اصلاحات کے دور میں قومی تاریخ کے خیال کو رانکے نے فرانس اور انگلینڈ تک بڑھایا۔ فرانس کی تاریخ پر ان کی تصنیف فرانسیسی آرکائیوز کے اصل مطالعات پر مبنی ہے۔ اس میں مذہبی جنگوں کے دور اور فرانسیسی مطلق العنانیت (French absolutism) کی مکمل ترقی کو شامل کیا گیا ہے۔

رانکے کی 'ہسٹری آف انگلینڈ' (*History of England*) جس میں اسٹیورٹس اور دونوں انقلابات کے دور کا احاطہ کیا گیا ہے، نو جلدوں میں، 1859 سے 1861 کے سالوں میں شائع ہوا۔ رانکے نے برٹش میوزیم اور لندن کے ریکارڈ آفس کے نوادرات کا خوب استعمال کیا۔ اُس نے ہسٹری آف انگلینڈ میں ایسے حقائق اور کٹوتیوں کو تلاش کیا جو کوئی سابقہ مؤرخ نہیں کر سکا تھا۔ لارڈ ایکٹن (Lord Acton) جسے انگلینڈ میں سب سے زیادہ بڑھا جانے والا آدمی کہا جاتا ہے، انگریزی تاریخی جائزہ کے پہلے نمبر میں شائع ہونے والے، جرمن اسکولز آف ہسٹری پر اپنے شاندار مضمون میں کہتا ہے کہ نثر کے مصنفین میں اکیلے رانکے نے میدان ماری۔ وہ ہر ملک کے لیے ایک شاہکار ہے۔

لیوپولڈ وان رانکے کے ذریعہ انگلینڈ کی تاریخ کی تکمیل یوروپی تاریخ کے ایک عظیم الشان حلقہ کی تکمیل کی نشاندہی کرتی ہے۔انہوں نے جدید دور کی عظیم ریاستوں کا تاریخی جائزہ لیا تھا۔اپنی سترّویں سالگرہ کے موقع پر انہیں اعلی عہدے پر فائز کیا گیا۔اس نے تمام جرمنی کی تعریف اور علمی دنیا کی تعریف کا لطف اٹھایا۔ان کی ڈاکٹری کی ڈگری کی پچاسویں سالگرہ پر ان کی تحریروں کا ایک نیا اور مکمل ایڈیشن منظر عام پر لایا گیا۔اس طرح اُن کو بہت سارے اعزازات سے نوازا گیا۔ریٹائر کے بعد بھی رانکے کی سرگرمی میں کوئی کمی نہیں آئی۔وہ در حقیقت برلن یونیورسٹی میں مزید لیکچر دینے کی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے تھے۔پروشین حکومت کی طرف سے پینشن یافتہ رانکے نے اس دوران یکے بعد دیگرے جرمن تاریخ میں مندرجہ ذیل تصانیف کو منظر عام پر لایا۔

- جرمن ہسٹری فرام دی ریلیجیس پیس ٹو دی تھرٹی ایرَس وار (German History from the Religious Peace to the Thirty Year's War)
- ہسٹری آف والینسٹین (History of Wallenstein)
- آرِجن آف دی سیوین ایرَس وار (Origin of the Seven Years' War)
- ہسٹری آف آسٹریا اینڈ پروشیا بٹوین تھع پیس آف ایکس لا شاپیل اینڈ ہو بَرٹسبرگ (History of Austria and Prussia between the Peace of Aix la Chapella and Hubertsburg)
- دی جرمن اسٹیٹس اینڈ دی لیگ آف پرنسیز (The German States and the League of Princes)
- آرِجن اند بیگنگ آف دی ریولوشنری وارس آف 1791–92 (Origin and Beginning of the Revolutionary Wars of 1791–92)
- میموئرس آف ہارڈینبرگ (Memoirs of Hardenberg) جو کہ میموئر آف میٹرنچ کی طرح نصف صدی تک محفوظ رکھی گئیں۔
- لائف آف فریڈرِک ولیم چہارم (Life of Fredrick William-IV)

ان تحریروں کا آخری نام پروشیا کی تاریخ کو موجودہ بادشاہ کے زمانے تک لاتا ہے۔ایک تاریخ دان کی شراکت کا ایسا شاندار سلسلہ جس نے انسانی زندگی کی مقررہ مدت پوری کر لی تھی،دنیا کے لیے شاندار سے کم نہیں تھی۔

یہ تمام وسیع تصانیف رانکے کی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ان کی تمام پچھلی تحریریں اور تصانیف اس کے آخری ہدف کے لیے ایک سائنسی تیاری تھیں۔رانکے نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا تھا"تاریخ اپنی فطرت میں آفاقی (universal) ہے۔"سچ میں رانکے نے آفاقی تاریخ (universal history) کے سوا کچھ نہیں لکھا۔اس نے انفرادی ممالک،انگلینڈ،فرانس اور جرمنی کے ساتھ علاحدگی کا برتاؤ نہیں کیا،بلکہ انفرادی یوروپی ریاستوں میں عالمی تاریخی خیالات کو ایک خاکہ کے طور پر پیش کیا۔ابیلارڈ (Abelard) کی طرح رانکے کے لیے بھی آفاقی (universal) ہمیشہ خاص ہے۔رانکے کی پہلی کتاب،"لاطینی اور ٹیوٹونک اقوام کی تاریخ" پر واقع آفاقی تاریخ

(universal history) میں اسکی ایک شراکت تھی۔اس لیےان کی زندگی اور تصنیف کے آغاز اور اختتام کے درمیان ایک کامل اتحاد ہے۔ان کا 'ویلتیج چِشتے' (Weltgeschichte) ضرور موجود تھی لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا تھا اس کا فطری ضمیمہ تھا۔

رانکے کی ترقی کو متاثر کرنے والے تمام لوگوں میں بلاشبہ لوتھر (Luther) پہلے نمبر پر تھا۔ اس کے بعد تھوسیڈائڈس (Thucydides) اور نیبور (Niebuhr) تھے۔ایک سے رانکے نے اپنا حاملہ فنکارانہ انداز (pregnant artistic style) اور دوسرے سے اس کا تنقیدی طریقہ (critical method) کا اختیار کیا۔اس نے قدیم تاریخ کے بغور مطالعہ سے حاصل ہونے والے سبق کو جدید تاریخ پر نافذ کیا۔رانکے خود کہتا ہے کہ نیبور (Niebuhr) کا ہسٹری آف روم (*History of Rome*) نے اس کے تاریخی مطالعے پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔اس کے علاوہ رانکے نے نیبور کا تنقیدی طریقہ کار تیار کیا اور اس کے ذریعے کچھ حقائق کو ختم کر دیا۔رانکے نے فرضی اور تخیلاتی (fanciful and imaginative) عمل سے ہٹ کر پوری سچائی (whole truth) کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا۔دوسری طرف انہوں نے تاریخ کے حقائق کو سختی سے تھاما۔اُس نے نہ کوئی خطبہ نہ کوئی اخلاقی درس دیا، نہ ہی کوئی کہانی سنائی بلکہ سادہ تاریخی سچائی (simple historical truth) کو بیان کیا۔اس کا واحد مقصد چیزوں کو بیان کرنا تھا جیسا کہ وہ واقعی ہیں، 'wie es eigentlick gewesen' سچائی اور معروضیت رانکے کے اعلیٰ ترین مقاصد تھے۔ان کے خیال میں تاریخ تفریح یا تدوین کے لیے نہیں بلکہ تعلیم کے لیے ہے۔

3.5 رانکے کا فلسفہ تاریخ (Ranke's Philosophy of History)

رانکے کے فلسفہ تاریخ کا خلاصہ کئی کلیدی اصولوں سے کیا جا سکتا ہے:

- **تجرباتی تحقیق (Empirical Research):** رانکے کا خیال تھا کہ مؤرخین کو اپنے تصنیف کی بنیاد باریک بین تجرباتی تحقیق (meticulous empirical research) پر رکھنا چاہئے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ماضی کو درست طریقے سے سمجھنے کے لیے بنیادی ذرائع جیسے کہ اصل دستاویزات اور عینی شاہدین کے اکاؤنٹس پر انحصار کرنا تھا۔انہوں نے ثانوی تشریحات یا قیاس آرائیوں (secondary interpretations or speculative theories) پر مبنی ثبوت کی اہمیت پر زور دیا۔
- **معروضیت (Objectivity):** رانکے نے تاریخی تحریر میں معروضیت (objectivity) کی اہمیت پر زور دیا۔وہ یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ مؤرخین کو چاہئے کہ وہ اپنے تعصبات یا موضوعی تشریحات (subjective interpretations) کو مسلط کیے بغیر حقائق کو ویسے ہی پیش کریں جیسا کہ وہ ہیں۔اس نقطہ نظر کا مقصد تاریخ کو اخلاقی فیصلوں (moral judgments) اور سیاسی نظریات سے علٰحدہ کرنا اور واقعات کی غیر جانبدارانہ اور غیر جانبدارانہ نمائندگی (unbiased representation) پر توجہ مرکوز کرنا تھا۔
- **انفرادیت (Individuality):** رانکے انفرادی تاریخی اداکاروں (individual historical actors) کی اہمیت پر

یقین رکھتے تھے۔انہوں نے تاریخی واقعات کی تشکیل میں بااثر افراد کے کردار اور ان کے محرکات اور اعمال کو سمجھنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اس نقطہ نظر کو اکثر تاریخ کا "عظیم شخصی نظریہ" (great man theory) کہا جاتا ہے، جہاں انفرادی رہنما اور شخصیات مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔

- **قومی تاریخ (National History):** رانکے نے قومی تاریخوں کو بہت اہمیت دی ہے۔ان کا خیال تھا کہ ہر قوم کا اپنا منفرد تاریخی رفتار اور کردار ہوتا ہے اور انفرادی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ اور سمجھنا بہت ضروری ہے۔ان کی تصنیفات کا قومی تاریخی بیانیے (national historical narratives) کی ترقی پر خاص طور پر جرمنی میں گہرا اثر پڑا۔
- **موجِبیّت اور تاریخ وار (Causality and Chronology):** رانکے نے تاریخی تجزیہ میں موجِبیّت اور تاریخ وار (Causality and Chronology) کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تاریخی واقعات ایک مخصوص تاریخ وارانہ ترتیب (chronological order) میں رونما ہوتے ہیں اور سبب اور اثر کے رشتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔تاریخی عمل کو درست طریقے سے سمجھنے کے لیے ان کے روابط کو سمجھنا ضروری ہے۔

3.6 رانکے کی فلسفہ تاریخ کی تنقید (Criticism of Ranke's Philosophy of History)

رانکے کے فلسفہ تاریخ کا تاریخ نویسی پر خاصہ اثر تھا۔ تجرباتی تحقیق، معروضیت اور انفرادی اداکاروں کے مطالعہ پر ان کے زور نے جدید تاریخی علمیّت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ رانکے کا نقطہ نظر وقت کے ساتھ ساتھ تنقید اور تطہیر کا شکار رہا ہے، لیکن ان کے خیالات تاریخی طریقہ کار کی تشکیل میں اثر انداز رہے ہیں۔اُن کی کامیابیوں کو ان کی زندگی میں ہی تسلیم کیا گیا تھا اور انہیں تاریخ کے میدان میں ان کی شراکت کے لیے متعدد خطاب ملے تھے۔وہ مختلف علمی معاشروں کے رکن کے طور پر منتخب ہوئے اور معزز یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگریاں حاصل کیں ۔اُن کا انتقال 23 مئی 1886 کو برلن، جرمنی میں ہوا۔ تجرباتی تحقیق، معروضیت اور تاریخ نویسی کے میدان میں آج تک بااثر رہنے والے انفرادی اداکاروں کے مطالعہ پر ان کے زور کے ساتھ ان کی میراث تاریخی علمیّت کو تشکیل دیتی ہے۔اگرچہ رانکے کے فلسفہ تاریخ کا تاریخ نویسی پر خاصہ اثر پڑا ہے، لیکن یہ اس کے ناقدین کے بغیر نہیں ہے۔تاریخ کے بارے میں رانکے کے فسلفہ کی کچھ عام تنقیدوں میں شامل ہیں:

- **انتخابی مرکز (Selective Focus):** انفرادی تاریخی اداکاروں (individual historical actors) کے اعمال اور محرکات پر رانکے کا زور سیاسی اشرافیہ اور ممتاز شخصیات پر حد سے زیادہ تنگ توجہ کا باعث تھا۔یہ نقطہ نظر پسماندہ گروہوں، سماجی تحریکوں اور وسیع سماجی قوتوں کے تجربات اور شراکت کو نظر انداز کرتا ہے، جس سے تاریخی عمل کی زیادہ جامع تفہیم محدود ہو جاتی ہے۔
- **سماجی اور ساختی تجزیہ کا فقدان (Lack of Social and Structural Analysis):** ناقدین کا استدلال ہے کہ رانکے کا نقطہ نظر تاریخی واقعات پر سماجی، اقتصادی اور ساختی عوامل کے اثر کو نظر انداز کرتا ہے۔بنیادی طور پر افراد پر توجہ مرکوز کرنے سے، رانکے کا فلسفہ ان بڑے سیاق وسباق کے عوامل کو نظر انداز کرتا ہے جو تاریخی پیشہ رفت کو تشکیل دیتے ہیں، جیسے سماجی طبقات، ثقافتی تبدیلیاں اور اقتصادی قوتیں۔

- **طرفداری اور موضوعیت (Biases and Subjectivity):** رانکے کے معروضیت پر زور دینے کے باوجود، مورخین کے لیے اپنے طرفداری اور موضوعی تشریحات کو مکمل طور پر ختم کیا گیا۔ ناقدین کا استدلال ہے کہ تاریخی بیانیے (historical narratives) مؤرخ کے نقطہ نظر سے موروثی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور رانکے کی معروضیت کا مطالبہ عملی طور پر ناقابل حصول ہے۔
- **تاریخی نظریہ کو نظر انداز کرنا (Neglect of Historical Theory):** رانکے کا فلسفہ تاریخ تجرباتی تحقیق (empirical research) اور بنیادی آخذ (primary sources) پر بہت حد تک مبنی تھا، لیکن یہ تاریخی نظریہ کے لیے ایک مضبوط بنائی ساخت (framework) فراہم نہیں کرتا ہے۔ ناقدین کا استدلال ہے کہ خالصتاً تجرباتی نقطہ نظر میں تاریخی واقعات اور نمونوں کی تشریح کے لیے ضروری نظریاتی گہرائی اور تجزیاتی ساخت (framework) کی کمی ہو سکتی ہے۔
- **قوم پرستانہ طرافداری (Nationalistic Bias):** قومی تاریخوں اور انفرادی قوموں کی منفرد رفتار پر رانکے کی توجہ کو اس کے قوم پرستانہ لہجے کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ نقطہ نظر تاریخ کے ایک تنگ اور خارجی نقطہ نظر کا باعث بن سکتا ہے۔ ممکنہ طور پر عالمی تاریخی عمل کے باہمی ربط کو نظر انداز کر سکتا ہے اور غیر قومی یا بین الاقوامی اداکاروں کے تجربات کو کم کر سکتا ہے۔

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ یہ تنقیدیں تاریخ نویسی کے میدان میں رانکے کے فلسفہ کی اہم شراکت کی نفی نہیں کرتی ہیں۔ بلکہ وہ ان دائروں کو ظاہر کرتے ہیں جہاں اس کے نقطہ نظر کی حدود ہو سکتی ہیں اور تاریخ دانوں کو ماضی کے بارے میں مزید جامع تفہیم پیدا کرنے کے لیے مختلف طریقوں اور نقطہ نظر کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

3.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اثباتیت پسندی (Positivism) انیسویں صدی کے دوران ایک نمایاں فلسفیانہ تحریک کے طور پر ابھری اور اس نے مجموعی طور پر سماجی سائنس کے ساتھ ساتھ تاریخی نگاری کے مخصوص میدان پر بھی گہرے نقوش چھوڑے۔ لیوپولڈ وان رانکے نے تاریخی معروضیت اور تجرباتی تحقیقی طریقوں کے تصور کو پیش کرتے ہوئے تاریخ نگاری کے طریقہ کار میں اہم شراکت دیا۔ اس نے بنیادی ذرائع اور تاریخی واقعات کی طرفداری نہیں کی۔ رانکے کے نقطہ نظر نے جدید تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی۔ مؤرخین کو حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے بیانئے کو اصل دستاویزات اور عینی شاہدین کی سخت جانچ پر مبنی بنائیں۔ تاریخ کی تفصیل بیان کرنے کی اہمیت پر ان کے یقین "جیسا کہ یہ واقعی" (as it really was) نے تاریخی تحریر میں انقلاب برپا کیا، جس سے ماضی کی زیادہ درست اور قابل اعتماد تفہیم حاصل ہوئی۔ رانکے کا اثر آج بھی تاریخ لکھنے کے عمل کو تشکیل دیتا ہے، جو حقائق کی درستگی اور غیر جانبداری کے عزم کو فروغ دیتا ہے۔

3.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

فلسفہ اثباتیت (Positivism) : ایک فلسفیانہ نقطہ نظر جو دنیا کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تجرباتی ثبوتوں

اور سائنسی طریقہ کار کے استعمال پر زور دیتا ہے۔

تجرباتی (Empiricism) : مخصوص مشاہدات سے عام نتائج اخذ کرنے کا ایک عمل

معروضی تاریخ (Objective History) : تاریخ نویسی میں معروضیت کا معنی ذاتی تعصبات اور موضوعی تشریحات سے باز رہنا۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. اپنی پہلی کتاب رانکے نے کہاں لکھی تھی؟
2. ان تین ملکوں کے نام بتائیے جن کے مورخین کے تصانیف کو رانکے نے ابدائی جدید تاریخ کا تجزیہ کرنے کے لیے بنیاد بنیا تھا؟
3. تجرباتی روایت سے متعلق کس ملک میں سب سے زیادہ بات کی گئی ہے؟
4. کومتے کے ان تین مراحل کا نام بتایئے جس سے دنیا کے تمام تصورات گزرتے ہیں؟
5. انگریزی لفظ 'Empiricism' کس یونانی لفظ سے ماخوذ کیا تھا؟
6. تجربیت پسندوں کے نزدیک علم کی صحیح شکل کیا ہے؟
7. رانکے کے ان پانچ کلیدی الفاظ کو لکھیے جو تاریخ نویسی کی بنیاد ہیں۔
8. ان اصطلاحی الفاظ کو لکھیے جن کے ذریعے رانکے کی فلسفہ تاریخ کی تنقید کی گئی۔
9. ان تین لوگوں کا نام بتایئے جن سے رانکے کے خیالات متاثر کیا۔
10. 'رانکے نے ہی ایسی تاریخ پیش کیا ہے، جو ہر ملک کے لیے ایک شاہکار ہے۔' یہ قول کس کا ہے؟
11. تاریخ نویسی کے حوالے سے لفظ انفرادی تاریخی اداکار کے لیے انگریزی میں کس کا لفظ استعمال ہوا ہے؟

3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نظریہ تجربیّت کا پانچ جملوں میں تعارف کرائیے۔
2. آگست کومتے کے فلسفیانہ نظریہ کو دس جملوں میں بیان کیجیے۔
3. نظریہ اثباتیت سے متعلق دو اصطلاحات کا تعارف کرائیے۔
4. مثبت نقطہ نظر کے مضمرات کو مختصر میں بیان کیجئیے۔
5. تاریخ نویسی کے حوالے سے معروضیت کا تعارف کرائیے۔

3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 'اثباتیت' فلسفہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. رانکے کون تھا؟ تاریخ نویسی کے طریقہ کار کے فلسفے میں ان کی شراکت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
3. مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Braw, J.D., 'Vision and Revision: Ranke and the Beginning of Modern History, History and Theory', *Revision in History*, Vol. 46, 2007, pp. 45–60.
2. Bourne, Edward Gaylord, 'Leo Von Ranke', *The Sewanee Review*, Vol. 4, No. 4, 1996, pp. 385–401.
3. Carr, E. H., *What is History*, Penguin, 2018.
4. Fitzsimons, M.A., 'Ranke History as Worship', *The Review of Politics*, Vol. 42, No. 4, 1980, pp. 533–555.
5. Ford, Franklin L., 'Ranke: Setting the Story Straight', *Proceeding of the Massachusetts Historical Society*, Vol. 87, 1975, pp. 57–75.
6. Ford, Guy Stanton, 'A Ranke Letter', *The Journal of Modern History*, Vol. 32, No. 2, 1960, pp. 142–144.
7. Krieger, Leonard, 'Element of Early Historicism: Experience, Theory, and History in Ranke', *History and Theory*, Vol. 14, No. 4, 1975, pp. 1–14.
8. Sreedharan, E., *A Textbook of Historiography, 500 B.C. to A.D. 2000*, New Delhi: Orient Longman Pvt. 2004.
9. Toynbee, Joseph Arnold, *A Study of History*, London: Oxford University Press, 1946.
10. Upadhyay, Shashi Bhushan, *Historiography in the Modern World: Western and Indian Perspectives*, London: Oxford University Press, 2016.
11. Wells, Colin, *A Brief History of History: Great Historians and the Epic Quest to Explain the Past*, The Lyons Press, Guilford, Connecticut, 2008.

اکائی 4۔مارکس اور تاریخ کی مادی تشریح

(Marx and the Materialistic Interpretation of History)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 سرمایہ دارانہ نظام

4.3 اشتراکیت

4.4 انیسویں صدی کے اوائل کا یوروپ

4.5 کیا سرمایہ داری بالکل بری ہے؟مارکس کا نظریہ

4.6 فطرت کا تصور

4.7 ریاست کا کردار

4.8 انسانی تاریخ کے تین مراحل

4.9 انسانی تاریخ کے مختلف مراحل میں مختلف طبقات

4.10 انفرادی انسانی تجربہ کی مربوط نوعیت

4.11 سماج کی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ

4.12 تاریخ نویسی پر مارکسزم کا اثر

4.13 کیا ہم ہندوستانی سماج کو سمجھنے کے لیے میکانکی طریقے سے مارکسزم کا استعمال کر سکتے ہیں؟

4.14 ہندوستانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کا تخلیقی استعمال

4.15 مارکسزم اور متعدد درجہ بندیاں

4.16 مارکس اور 'غلط شعوری' کا نظریہ

4.17 اکتسابی نتائج

4.18 کلیدی الفاظ

4.19 نمونہ امتحانی سوالات

4.20 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید (Introduction)

مارکزم، مارکسواد یا کارل مارکس (1818–1883) کے نظریات پر مبنی فکر آج بھی دنیا کے بہت سے لوگوں میں زندہ اور مقبول ہے۔ چین اور کیوبا جیسے ایسے ممالک ہیں جو خود کو کمیونسٹ کہتے ہیں، چاہے انکا یہ دعوی حقیقت میں درست ہو یا نہ ہو، لیکن سہرا مارکسزم کو ہی دیتے ہیں۔ 1989 اور 1991 کے درمیان USSR، GDR (مشرقی جرمنی) جیسے نام نہاد سوشلسٹ ریاستوں (Socialist States) اور ہنگری، پولینڈ اور بلغاریہ جیسے دیگر مشرقی یوروپی ریاستوں کے زوال کے بعد بھی اشتراکیت کی اپیل پوری طرح کم نہیں ہوئی۔ دنیا کے متعدد مظلوم لوگوں کے لیے ایک سیاسی مقصد ہونے کے علاوہ، مارکسزم معاشرے کی تبدیلیوں کے مطالعہ کا ایک طریقہ کار بھی ہے، جس کی وجہ سے یہ پوری دنیا کی یونیورسٹیوں اور دیگر علمی حلقوں میں زندہ ہے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مارکسزم یا مارکسی نظریہ سے واقف ہو سکیں گے۔
- تاریخ کی مارکسی تشریح کو سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستان جیسے غیر یوروپی ممالک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کو تخلیقی طور پر نافذ کرنے کے طریقوں کو جان سکیں گے۔
- انسانی ماضی کی مکمل تصویر فراہم کرنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کی کمیوں سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

4.2 سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)

کارل مارکس ایک جرمن فلسفی، سیاسی ماہر معاشیات (political economist) اور انقلابی تھا۔ وہ اس سرمایہ داری نظام کا ناقد تھا جو انیسویں صدی کے اوائل تک اپنی پختگی کو پہنچ چکا تھا۔ سرمایہ داری نظام نے جائداد اور وسائل کی ملکیت سرمایہ داروں کی ایک قلیل تعداد کے ہاتھ میں دے دیا، جنھوں نے محنت کشوں کی ایک بڑی اکثریت کی محنت کا استحصال کیا جن کے پاس معاشی پیداوار کے وسائل یا ذرائع نہیں تھے۔ مزدوروں کے پاس جو کچھ تھا وہ بس ان کی اپنی مزدوری (Labour Power) تھی جسے وہ بازار میں یومیہ اجرت پر بیچ دیتے تھے۔ سرمایہ داری نظام نے مالداروں کی ایک مختصر جماعت اور غریب لوگوں کی ایک بڑی تعداد پیدا کی جو انتہائی دردناک حالات میں زندگی

گزار رہے تھے۔ سرمایہ داری کی منطق ایسی تھی اور ہے کہ معاشرے میں وقت کے ساتھ صرف غیر برابری ہی بڑھی ہے۔

4.3 اشتراکیت (Socialism)

مزدور دیہی علاقوں سے ہجرت کر کے ایسے شہروں میں رہنے آئے جہاں سرمایہ داروں کے کارخانے قائم تھے اور بڑی بری حالت میں زندگی گزاری۔ ان کے تکلیف دہ حالات زندگی اور ان کے کام کے طویل اوقات نے 18 ویں صدی سے ہی حساس افراد کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی، جنھوں نے سرمایہ داری نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ایک متبادل کے طور پر 'سوشلسٹ' (Socialist) نظریہ پیش کیا۔ 'اشتراکیت' (Socialism) نے ایک انسانی اور مساوی معاشرے کے قیام کا وعدہ کیا، جہاں تمام لوگوں کی فلاح و بہبود ہو، نہ کہ ایسا معاشرہ جہاں صرف مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ میں دولت ہو۔ انیسویں صدی کے اوائل کے کچھ ایسے دانشوروں کو ''خیالی سوشلسٹ'' (Utopian Socialists) کہا گیا ہے۔ کارل مارکس نے اسی روایت سے تحریک حاصل کی اور خود سرمایہ داری نظام کے سخت ناقد بن گئے۔

4.4 انیسویں صدی کے اوائل کا یوروپ (Europe in the Early Nineteenth Century)

1830 اور 1840 کی دہائیاں یوروپ میں ہنگامہ خیز اور پر تشدد تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ عہد وسطیٰ کا نظام یا حکومت جو یوروپ کے بہت سے حصوں میں اب بھی موجود تھی، نئی طرح کی سیاست اور معیشت میں تبدیل ہونے والی تھی۔ مارکس سمیت بہت سے سوشلسٹوں کو یہ امید تھی کہ 1848 کے آس پاس رونما ہونے والے سنگین سماجی خلفشار، جسے 1848 کے انقلابات کا نام دیا گیا ہے، کے نتیجے میں اس سرمایہ داری نظام کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جس نے بہت سے لوگوں کے لیے غربت اور عدم مساوات کو جنم دیا تھا۔ یہ 1840 کی دہائی ہی تھی جب مارکس نے فلسفہ اور سماج پر اپنی کتابیں لکھنا شروع کی اور 1848 کے انقلابات کی ناکامی کے بعد بھی اپنی تحریر کو جاری رکھا۔ دوسرے سوشلسٹوں کی طرح وہ پُرامید رہا کہ سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے دوسرے مواقع بھی آئیں گے۔

4.5 کیا سرمایہ داری بالکل بری ہے؟ مارکس کا نظریہ (Is Capitalism all Bad? Marx's View)

مارکس جہاں سرمایہ داری کا ناقد تھا، وہیں وہ اس کے کچھ فوائد کی تعریف بھی کرتا تھا۔ مثال کے طور پر سرمایہ داری نظام نے معاشرے کی مادی اشیاء پیدا کرنے کی صلاحیت کو اس سطح تک بڑھا دیا جو پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ ان معاشروں سے کہیں زیادہ پیداواری قوت رکھتا تھا جو اس سے پہلے موجود تھے۔ مارکس کے لیے یہ ایک مثبت پہلو تھا، کیونکہ اگر عدم مساوات کو کسی طرح ختم کر دیا جائے، تو انسانی معاشرہ اس بات کو یقینی بنا سکتا ہے کہ نئے حالات کے تحت بڑھی ہوئی پیداواری صلاحیت کو تمام انسانوں کے درمیان مساوی طور پر بانٹ کر ان کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔

4.6 فطرت کا تصور (The Concept of Nature)

مارکس کے یہاں 'فطرت' (nature) کا ایک تصور ہے۔ فطرت وہ ہے جو طبعی اور قدرتی دنیا میں آسانی سے دستیاب ہو۔ انسانی تہذیب کے بالکل ابتدائی مرحلے میں انسان محض قدرتی دنیا میں دستیاب چیزیں جیسے جنگلی اناج، پھل یا شکار کردہ جانور اور ان کا گوشت کھاتے تھے۔ اسے عام طور پر شکار و جمع کرنے والا معاشرہ (hunter-gatherer society) کہا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، انسانوں نے اس مرحلے کے بعد بہت زیادہ ترقی کی۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا کیونکہ انسانوں نے اپنی محنت کے بل پر فطرت پر تصرف کیا اور بڑی مہارت کے ساتھ زیادہ مقدار میں پیداوار کرنے میں کامیاب ہوئے جو شکار و جمع کرنے والوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس عمل میں انسانوں نے فطرت کو بھی بدلنا شروع کیا۔ تاریخ کے ابتدائی دور میں جانوروں کو پالنا اور زراعت کی ایجاد اس عمل کی کچھ مثالیں ہیں۔ تکنیکی ایجاد بھی ایک عنصر ہے جو اس عمل میں شامل ہے۔ نئے طریقوں کو اپنا کر اور پیداواری کارکردگی میں تیزی لا کر انسانوں نے ''فواضل'' (surplus) پیدا کرنا شروع کر دیا، جبکہ اس سے پہلے وہ صرف وہی پیدا کرتے تھے جو ان کی خوراک کے لیے بہت ضروری تھا۔ اب انسان اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ ضرورت سے زیادہ پیدا کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے فواضل (surplus) پیدا کیا۔ فاضل پیداوار نے کچھ لوگوں کو ایسے کام کرنے کا موقع دیا جو پیداوار سے منسلک نہیں تھے اور اس طرح ایک پیچیدہ معاشرہ کو جنم دیا جس میں لوگ مختلف طبقات و درجات میں تقسیم ہو گئے۔ جیسے جیسے مختلف گروہوں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات سے معاشرہ مزید تفریق کا شکار ہوتا گیا، معاشرے کے معاملات کی نگرانی، انتظام اور کنٹرول کرنا ضروری ہو گیا۔ یہ کام نو تشکیل شدہ ادارے یعنی 'ریاست' (State) کے ذریعہ سے انجام دیا گیا۔

4.7 ریاست کا کردار (Role of the State)

ریاست کبھی بھی ایک غیر جانبدار ادارہ نہیں تھی۔ اس نے غالب گروہوں (Dominant Groups) کا ساتھ دیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ ان کا تسلط برقرار رہے۔ معاشرے میں اب دو بڑے گروہ تھے: ایک وہ جس نے سخت محنت کی اور دولت (بشمول فواضل) پیدا کی، جبکہ دوسرے گروہ نے فواضل (surplus) کو چھین لیا اور ریاستی اقتدار کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار پر بھی قبضہ جما لیا جس گروہ نے پیداوار بڑھانے میں حصہ لیا وہ معاشرے میں اکثریت میں تھے، جبکہ جس غالب گروہ تعداد میں اقلیت میں تھا۔ مارکس نے ان دونوں گروہوں کو 'طبقہ' (classes) کہا ہے اور یہ دعوی کیا کہ تاریخ میں ہر سماجی تشکیل میں ایسے معاشرے ہوتے ہیں جن میں مختلف قسم کے طبقات موجود ہوتے ہیں۔

4.8 انسانی تاریخ کے تین مراحل (The Three Stages of Human History)

مارکس نے انسانی معاشرے کے بارے میں ایک اور اہم ضابطہ بتایا ہے اور وہ یہ کہ معاشرے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی پیداواری صلاحیت کو بہتر بناتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو ہزار سال پہلے کے مقابلے معاشرہ آج زیادہ بلکہ بہت زیادہ پیدا کر رہا ہے۔ انسانی

معاشرے کی پیداواری صلاحیت میں ایک خطیّت (linearity) اور ترقی (progressivity) ہے۔ تاریخی طور پر آگے آنے والے دور میں معاشرے نے نئی ٹکنالوجی کی ایجاد اور ترقی کی مدد سے تیزی سے زیادہ مقدار کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی مادی اشیاء بھی پیدا کیں۔ پیداواری صلاحیت کی اس ترقی نے سماج کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ معاشرے بدلتے رہتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ سماجی ترقی میں وقفے بھی ہوتے ہیں۔ ایک معاشرہ کی گزشتہ شکل مکمل طور پر ٹوٹ جاتی ہے اور اس کی جگہ معاشرہ ایک ایسی نئی شکل جو زیادہ ترقی یافتہ اور نتیجہ خیز ہو، لے لیتا ہے۔ نئی شکل پرانی شکل سے، جس کا خاتمہ ہوا ہے بہت کم مشابہت رکھتی ہے۔ مارکس نے انسانی تاریخ کے اِن ترقی پذیر 'مراحل یا ادوار' (stages/epochs) کو 'پیداوار کے طریقے' (modes of production) کہا ہے۔ اس نے انسانی تاریخ میں اس طرح کے تین مراحل کی وضاحت کی ہے: غلام معاشرہ (the slave society)، جاگیردارانہ معاشرہ (the feudal society)، اور موجودہ سرمایہ دارانہ سماج (the capitalist society)۔ اگرچہ مارکس نے ان مراحل کو پوری دنیا کی تمام انسانی تاریخ پر نافذ کرنے کے مقصد سے وضع کیا تھا، لیکن بنیادی طور پر اس کی سمجھ کا انحصار یوروپ کی تاریخ پر تھا۔ وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھا کہ دنیا کے دیگر حصوں میں تاریخی تجربے کی رفتار یوروپ سے بہت مختلف ہو سکتی ہے۔ وہ اس بارے میں صرف ایک وسیع خاکہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کیونکہ اگر وہ تصویر کچھ حد تک غلط بھی ہو، تو بھی یہ حقیقت ہے کہ وسیع خاکہ سماجی دنیا کو سمجھنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

4.9 انسانی تاریخ کے مختلف مراحل میں مختلف طبقات

(Different Classes in Different Stages of Human History)

اب ہم تاریخ کے مختلف ادوار کو مختلف اقسام کے 'طبقوں' (classes) سے جوڑ سکتے ہیں۔ غلام معاشرہ میں بنیادی طبقے آقا (slave owner) اور غلام ہوتے تھے۔ غلام سخت محنت کرتے اور فواضل (surplus) پیدا کرتے جس پر آقا اپنا حق جما لیتے تھے۔ واضح طور پر آقاؤں اور غلاموں کے درمیان مفادات کا تصادم تھا اور اس کشمکش نے 'طبقاتی جدوجہد' (Class Struggle) کی شکل اختیار کر لی۔ بعض اوقات آقاؤں کے خلاف غلاموں کی بغاوتیں ہوتی تھیں۔ لیکن جب غلام کسی حد تک کمزور ہوتے اور انہیں اپنی طاقت پر یقین نہیں ہوتا، تو وہ بغاوت نہیں کر سکتے تھے، البتہ وہ کام پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو وہ قصداً کام کی رفتار کو کم کر دیتے تاکہ پیداوار میں کمی واقع ہو سکے۔ اس طرح غلام معاشرہ غیر پیداواری (Unproductive) ہو گیا (یعنی پیداواری عمل میں غیر موثر ہو گیا) اور اس کی جگہ ایک نئے معاشرے کے تشکیل کی ضرورت تھی جو غلام معاشرے سے زیادہ کارآمد ہو۔ وہ نیا معاشرہ جاگیردارانہ معاشرہ (feudal society) تھا۔ نئے معاشرے میں 'مالک' (lords) اور 'بندھوا مزدور' (serfs) طبقے تھے، جن کے درمیان کشمکش تھی اور جس میں مالکانِ زمین، بندھوا مزدوروں کی محنت و مزدوری کا استحصال کرتے تھے۔

بالآخر غلام معاشرہ (slave society) جاگیردارانہ معاشرہ (feudal society) میں بھی مفادات کا تصادم

(clash of interest) پیدا ہوا، جس کے نتیجے میں جاگیر دارانہ سماج میں بحران پیدا ہوا اور جاگیر دارانہ سماج کی جگہ آخر کار سرمایہ دارانہ سماج (Capitalist Society) نے لے لی، جہاں 'سرمایہ داروں' (capitalists) اور 'مزدوروں' (workers) کے طبقے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف متصادم تھے۔ مارکس کو یہ امید تھی کہ کشمکش کا شکار سرمایہ دارانہ معاشرہ (capitalist society) کے بعد بالآخر ایک زیادہ منصفانہ سوشلسٹ سماج قائم ہوگا۔

4.10 انفرادی انسانی تجربے کی مربوط نوعیت
(The Integrated Nature of Individual Human Experience)

ایک انفرادی انسانی تجربہ بھی متعدد چیزوں سے مربوط ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے مختلف طرح کے تجربات جیسے کام، جذبات و احساسات، عقائد اور جسمانی ضروریات گہرے طور پر سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں حقیقت میں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات معاشرہ کے تجربات پر بھی صادق آتی ہے۔ سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی جہتیں ان تمام پہلوؤں میں ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی پیچیدہ بات ہے جسے محدود انسانی ذہن نہیں سمجھ سکتا۔ سب سے پہلے حقیقت کو چاہے وہ انفرادی یا سماجی ہو، چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے اسے جزوی طور پر سمجھنا ہوگا۔ ایک بار جب ہم اس کا جزوی فہم کو حاصل کرلیں، تو ہم انہیں نئے سرے سے دوبارہ مربوط کر کے ایک جامع اور کلی تصویر بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جس کا استعمال تمام سماجی سائنس داں اور مؤرخین کرتے ہیں، حالانکہ ہمارے مربوط فہم اور توضیح پر سوال کی گنجائش باقی رہے گی اور ہم اپنی فہم و توضیح کے تئیں یہ تصور برقرار رکھیں گے کہ اس پر صحت مند اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ سائنس خواہ طبعی ہو یا سماجی، ایک مشکل کام ہے اور اس کام میں قطعیت کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

لہٰذا ہم بڑے سماجی حقائق کو اقتصادی، سیاسی، ثقافتی جیسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس بات کا اعادہ کرنا ضروری ہے کہ یہ تقسیم صرف تجزیاتی ہے (یعنی ہمارے ذہن میں بنائی گئی ہے) جس کا تعلق دراصل حقیقت سے نہیں ہے۔ انسانی ذہن کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے یہ تقسیم صرف ایک مشق کے طور پر کی گئی ہے۔ حالانکہ ایک بار جب ہم یہ تفریق کرلیں گے تو یہ سوال ہمیشہ اٹھے گا کہ ان میں سے کونسا پہلو دوسرے سے زیادہ اہم ہو سکتا ہے، یا کم از کم ان میں سے کونسا پہلو صرف ایک مخصوص تناظر میں اہمیت رکھتا ہے۔ مارکس نے معاشی تغیرات (economic variable) یا اقتصادی پہلو (economic dimension) کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

4.11 سماج کی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ (The 'Base' and the 'Superstructure' of Society)

اقتصادی پہلو کی اہمیت کو عام فہم سطح پر اور انفرادی تجربے کے حوالے درج ذیل طریقے سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ زندہ رہنے کا بنیادی انسانی داعیہ ایک فرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مادی رزق کو ترجیح دے۔ اس بنیادی ضرورت پر توجہ دینے کے بعد ہی انسان دوسرے مسائل جیسے مذہبی، عقائد یا جمالیاتی پہلوؤں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مزید برآں انسانوں کے بارے میں یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ چیزوں کو اکٹھا کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور زندگی بھر مادی وسائل جمع کرتے رہتے ہیں جو وہ بعد میں اپنی اولادوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک مختلف لیکن اسی سے

متعلق اہم بات یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کے دوام کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ اس معاشرے کے افراد خود کو زندہ و قائم رکھیں بلکہ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس معاشرے کو مستقبل کی نئی نسل دیں اور ان کی بقا اور پرورش کے حالات کو یقینی بنائیں۔

ہو سکتا ہے کہ اوپر ذکر کی گئی بات درست ہو، لیکن مارکس انفرادی سطح پر اقتصادی پہلو کی اہمیت کے بارے میں اپنی دلیل نہیں پیش کر رہا تھا۔ اس نے معاملے کو چھوٹی سطح (micro level) پر دیکھا اور معاشرے کو اپنے تجزیہ کی اکائی بنایا۔ سماج کی اجتماعی پیداواری صلاحیت اور پیدا شدہ مادی اشیاء پر کنٹرول، یہ وہ چیز تھی جسے مارکس نے اپنے تجزیہ کا موضوع بنایا۔ یہ وہی تغیر (variable) تھا جس نے دیگر تمام تغیرات (variables) جیسے قانونی، سیاسی یا ثقافتی وغیرہ کو جنم دیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسانوں کے مادی حالات تھے جنھوں نے ان کے شعور کو متاثر کیا نہ کہ اس کے برعکس۔ معاشی تغیر کو دی گئی اس اہمیت کی وجہ سے بعض اوقات ناقدین نے تاریخ کی مادیت پسندانہ تشریح (Materialistic Interpretation of History) کو یا تو تکنیکی جبر (technological determinism) یا معاشی جبر (economic determinism) کا نام دیا ہے۔ لہذا مارکس کی نظر میں معاشی تغیر (economic variable) یعنی پیداواری صلاحیت اور ملکیت "بنیاد" (base) کی اہمیت رکھتا ہے اور دیگر تمام غیر اقتصادی تغیرات (قانونی نظام، سیاسی ڈھانچہ، مذہب، ثقافت) بالائی ڈھانچہ (superstructure) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس فکر میں زیادہ زور "بنیاد" پر ہے۔

حقیقت میں مارکس کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ معیشت جس کی حیثیت بنیاد کی ہے اور دوسرے تغیرات جو معیشت پر منحصر ہیں، کے درمیان فرق کو بڑھا چڑھا کر پیش کرے۔ ہم لوگوں کی طرح وہ بھی جانتا تھا کہ سماجی حقیقت ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے اور سماج کے مختلف پہلوؤں (جیسے سیاسی، ثقافتی اور مذہبی) کے درمیان تفریق صرف تجزیاتی مقصد کے لیے کی گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ معاشی تغیر (variable) سیاسی، ثقافتی اور اس طرح کے دیگر غیر اقتصادی تغیرات سے مسلسل متاثر تھا۔ معاشی تغیر ہر چیز سے الگ تھلگ آزادانہ طور پر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ مارکس نے معاشی اور غیر معاشی عوامل کے باہمی اثر کو تسلیم کیا۔ تاہم اگر توضیح کے لیے کسی ایک تغیر کو ترجیح دینا ہو تو یقیناً مارکس معاشی تغیر کو یہ درجہ دینے پر زیادہ آمادہ تھا۔

موٹے طور پر تاریخ کی مادی تشریح (materialistic interpretation) جو مارکس نے تجویز کی تھی وہ طویل مدتی تاریخی تبدیلیوں اور رجحانات سے متعلق تھی۔ مارکس کا کہنا ہے کہ طویل مدت (long run) میں معاشی تغیر کو ہی اولین حیثیت دی جاسکتی ہے، لیکن مختصر مدت میں غیر اقتصادی عوامل وقتاً فوقتاً زیادہ نمایاں نظر آسکتے ہیں۔ تاریخ کے مادی تصور نے مارکس کے نقطہ نظر کو بہت متاثر کیا۔ لیکن مارکس اس معنی میں کوئی مؤرخ نہیں تھا جس طرح آج ہم کسی کو پیشہ ور مؤرخ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ تاریخ پر مبنی اس کی تصانیف جیسے *The Struggles in France 1848 to 1850* اور *The 18th Brumaire of Louis Bonaparte* اس عہد کے سیاسی حالات کا تجزیہ تھیں جو پیش آرہے تھے۔ ان کتابوں میں معاشی پہلو کے مقابلہ میں سیاسی اور نظریاتی

عوامل پر زیادہ اہمیت دی گئی ہے کیونکہ اصل مقصد مختصر مدت میں رونما ہونے والے واقعات کا تجزیہ کرنا تھا۔ لیکن اپنے طریقہ کار کے رجحان کی وجہ سے مارکسی مؤرخین ہمیشہ ہر صورت حال خواہ مختصر مدتی ہو یا طویل مدتی میں معاشی عنصر کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی مخصوص تاریخی تبدیلی میں کوئی معاشی عنصر اہم نہیں تھا، تو وہ غیر اقتصادی عوامل کی جانچ کرتے ہیں۔

مارکسزم نے دو بالکل مختلف منصوبوں کو متاثر کیا ہے۔ پہلا ایک سیاسی منصوبہ ہے جو سرمایہ داری کے بعد کی دنیا (Post-Capitalist World) میں انسانی آزادی قائم کرنا چاہتا ہے اور دوسرا ایک فکری منصوبہ ہے جو مارکسی طریقہ کار کا استعمال کرکے سماج میں تسلسل اور تبدیلی کے عمل کی وضاحت کرنا چاہتا ہے۔ سیاسی منصوبے کو 1991 میں روس اور مشرقی یوروپ میں سوشلسٹ حکومتوں کے زوال کے ساتھ بہت بڑا دھچکا لگا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ آیا حقیقی آزادی دلانے والی حکومتیں سابقہ سوشلسٹ ممالک میں موجود تھیں یا نہیں۔ 1991 کے بعد سیاسی منصوبے کو دھچکا لگا۔ تاہم سیاسی منصوبے کی ناکامی نے مارکس کی فکری اپیل کو کم نہیں کیا ہے۔ دینا کے مختلف حصوں میں کئی مؤرخین ہیں جو تاریخ کو سمجھنے اور لکھنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کو اپناتے ہیں۔

4.12 تاریخ نویسی پر مارکسزم کا اثر (Influence of Marxism on Historiography)

تاریخ نویسی پر تاریخ کے مارکسی طریقہ کار کا اثر نمایاں رہا ہے۔ مؤرخین نے خواہ مارکسی ہوں یا نہ ہوں، واقعات و نظریات کے آزادانہ طور پر اپنی داخلی منطق کے نتیجہ میں ابھرنے کے تصور کو قبول نہ کرتے ہوئے تاریخی واقعات و نظریات کے سماجی اور اقتصادی تناظر اور عوامل پر غور کرنا شروع کیا۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ نظریات اپنے مخصوص سماجی اور معاشی حالات میں جنم لینے کے بعد آزادانہ طور پر ترقی پا سکتے ہیں اور پھر ان مخصوص سماجی و معاشی حالات کے ختم ہونے کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے۔ مارکسی طریقہ کار کے بڑھتے ہوئے اثر نے سماجی اور معاشی تاریخ کی مقبولیت میں اضافہ کیا، جس کو اب تک بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ مارکسی طریقہ کار کے ذریعے متعارف کرائے گئے سوالات، تصورات اور اصطلاحات نے تاریخ نویسی پر گہرا اثر مرتب کیا۔ یہاں تک کہ ان مؤرخین کی نظر میں بھی جو مارکسی مکتب فکر سے تعلق نہیں رکھتے۔

معاشی متغیر جو مارکس کے نقطہ نظر میں توجہ کا مرکز رہا، جو سرمایہ داری کے ماتحت سماجی ترقی کی منطق کا نتیجہ تھا۔ معیشت جو اس طرح کے بڑے معاشرے میں سرایت کر چکی تھی، الگ ہو گئی اور ایک خود مختار دائرے کے طور پر ابھری اور ایک خاص امتیازی شناخت سنبھال لی۔ اسی طرح ہم اٹھارویں صدی کے اوائل سے معاشیات کو ایک ممتاز سائنس کی حیثیت سے (یا سیاسی معیشت، جیسا کہ اس وقت کہا جاتا تھا) کے عروج کو کیسے سمجھتے ہیں۔ مارکس کے طریقہ کار نے اس مخصوص سیاق و سباق میں شکل اختیار کی اور معیشت کے لیے پہلے سے دستیاب مواقع بنا پر ایک امتیازی شناخت بنایا۔ معیشت یقیناً موجود تھی، لیکن بڑے معاشرے میں چھپی ہوئی یا گھلی ملی تھی۔ معاشی متغیر کے عمل کا تجزیہ اس وقت کے دوران جب اس متغیر کی واضح شناخت ان لوگوں کے ذہنوں میں موجود نہیں تھی جو اس زمانے میں رہتے تھے۔ مارکسسٹ طریقہ کار کے محتاط اور ہوشیاری سے عمل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں جب اس طریقہ کار ما قبل سرمایہ داری کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے

لاگو کیا جاتا ہے۔

غیر یوروپی معاشروں کی تاریخ کا تجزیہ کرنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کا استعمال کرنے میں بعض پریشانیاں ہیں۔ مارکس ایک یوروپی مفکر تھا اور یوروپ انیسویں صدی کی دنیا میں سب سے طاقتور براعظم تھا۔ چنانچہ مارکس کی فکر یوروپی نقطہ نظر سے متاثر تھی۔ باقی دنیا کو (یعنی غیر یوروپی معاشروں کو) ان کی اپنی نظر سے نہیں بلکہ یوروپی پیمانے سے دیکھنا یوروپ مرکوز نظریہ Eurocentrism کہلاتا ہے۔ مارکس بھی اس تعصب کا کسی حد تک شکار تھا۔ اس نے ہندوستان کو ایک جمود کا شکار معاشرے کے طور پر دیکھا جہاں صدیوں سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور جہاں جامد روایات اور توہم پرستی کا بول بالا تھا۔ اس نے ہندوستان پر برطانوی اقتدار کی تعریف کی، جس کی وجہ سے ہندوستان عالمی تاریخ اور سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ بن گیا تھا (البتہ برطانوی تسلط کے ذریعہ کیے جانے والے مظالم پر تنقید بھی کی)۔ اس کا خیال تھا کہ نئی ٹکنالوجی اور جدید ادارے ہندوستان کو جمود سے باہر نکالیں گے اور ہندوستانی معاشرے کو ذات پات جیسے اداروں سے نجات دلائیں گے۔ مارکس نے ہندوستان کے بارے میں جو تجاویز پیش کیں وہ درست نہیں تھیں۔ نوآبادیاتی اقتدار سے پہلے ہندوستان ایک جامد معاشرہ (static society) نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوآبادیاتی حکومت نے ہندوستان میں کچھ جدید ادارے متعارف کرائے، لیکن ہندوستانیوں نے اس کی بہت زیادہ قیمت چکائی۔ ہندوستان میں جو کچھ متعارف کرایا گیا وہ ایک محدود اور نامکمل Modernisation تھا جو نوآبادیاتی اقتدار کے حق میں تھا نہ کہ زیادہ تر ہندوستانیوں کے حق میں۔ ہندوستان محکوم ہوئے بغیر بھی جدیدیت کی تمام نمایاں خصوصیات کا حامل ہو سکتا تھا جس کے لیے اسے جاپان کی طرح جدیدیت کے محرکات باہر سے ہندوستان میں لا کر اپنانا تھا۔

4.13 کیا ہم ہندوستانی معاشرے کو سمجھنے کے لیے میکانکی طریقے سے مارکسزم کا استعمال کر سکتے ہیں؟
(Can We Mechanically Apply Marxism to Understand Indian Society?)

ہندوستانی سماج کا تجزیہ کرنے میں مارکسزم کتنا مددگار ہے؟ اگر کوئی یوروپی تاریخ کی اصطلاحات کو ہندوستانی تاریخ میں استعمال کرنے کی کوشش کرے تو اس سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ یوروپی تناظر میں مارکس نے جن سماجی تشکیلات کا تذکرہ کیا ہے ہندوستان کی تاریخ میں ان کی جگہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر عہد وسطیٰ کے یوروپ کی سماجی تشکیل جاگیردارانہ نظام (feudalism) تھی، لیکن ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام نہیں تھا۔ ہندوستان میں عہد وسطیٰ کا سماجی نظام مختلف خصوصیات کا حامل تھا۔ زرعی معاشرے کا غلبہ اور غیر مرکزی سیاست وہ خصوصیات تھیں جو یوروپ اور ہندوستان دونوں کے عہد وسطیٰ کے نظاموں میں مشترک تھیں، لیکن ان کی نوعیت بہت مختلف تھی۔ کبھی کبھی عہدِ وسطیٰ کی سماجی تشکیل میں جیسا کہ ہندوستان میں تھا، دو اہم متصادم طبقے (یا سماجی گروہ) نہیں ہوتے تھے جو ایک دوسرے کے خلاف کھڑے کیے جا سکیں۔

4.14 ہندوستانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کا تخلیقی استعمال

(The Creative Application of Marxist Method for Understanding Indian History)

ہمیں ہندوستانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کا استعمال کرتے ہوئے تخلیقی ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ سماجی فواضل (social surplus) کس طرح پیدا ہوا، کس نے فواضل (surplus) پر اپنا حق جتایا، کیا ریاست پر دولت مند گروہوں کا قبضہ تھا یا ریاست ایک حد تک خود مختار تھی اور غریب لوگ کون تھے اور کیا انہوں نے اپنے حالات کے خلاف احتجاج یا بغاوت کی۔ ان سوالات کی تحقیق سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ ہندوستانی سماج اور تاریخ کو اور واضح کرے گی اور یہی مارکسی طریقہ کار کا تخلیقی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس طریقہ کار کو مارکسی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں معاشی پہلو سے متعلق سوالات پوچھے جا رہے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش ہو رہی ہے کہ آیا معاشی پہلو ہندوستانی تاریخ میں طویل مدتی اعتبار سے اہم تھا اور مختصر مدتی طور پر اس کا کیا اثر رہا۔ اس طریقہ کار میں معاشرے میں عدم مساوات اور غربت کی وجوہات کے بارے میں بھی سوال پوچھا جا رہا ہے۔

4.15 مارکسزم اور متعدد درجہ بندیاں (Marxism and Multiple Hierarchies)

درجہ بندی کا اصول ماضی اور موجودہ تمام انسانی معاشروں میں موجود رہا ہے۔ درجہ بندی کی کچھ بنیادیں معاشی ہیں اور کچھ غیر معاشی۔ مارکسی طریقہ کار کو درجہ بندی کے معاشی اصول کا تجزیہ کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ یہ درجہ بندی کے غیر اقتصادی اصولوں پر روشنی ڈالنے میں کم کامیاب رہا ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کے نظام کی مثال لے لیں۔ ہندوستان میں ذات پات درجہ بندی کا ایک غیر معاشی اصول ہے۔ یہ یقیناً درست ہے کہ اعلیٰ ذاتوں میں معاشی طور پر خوشحال لوگ اور نچلی ذاتوں میں غریب لوگ زیادہ ہیں۔ اس حد تک "ذات" (caste) اور "طبقے" (class) کے درمیان overlap پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی ذات اور طبقہ کو ایک نہیں سمجھا جا سکتا۔ رسمی پاکیزگی (Ritual Purity) اور سماجی برتری یہ وہ تصورات ہیں جو ذات پات کے نظام کے ساتھ خاص ہیں اور ان کا کوئی وجود 'طبقہ' میں نہیں ہوتا جو آمدنی کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ اس طرح کے سماجی درجہ بندی کو سمجھنے کے لیے مارکسی طریقہ مناسب نہیں ہو سکتا۔ ذات پات کی طرح دوسرے تغیرات بھی ہیں جیسے 'جنس' (gender) اور 'نسل' (race) جو 'طبقے' (class) کے ساتھ کچھ مماثلت رکھتے ہیں، لیکن پھر بھی انہیں 'طبقے' کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا۔ مارکسی طریقہ کار کے علاوہ دیگر طریقہ کار ایسی غیر اقتصادی درجہ بندی کو سمجھنے کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں۔ مختلف تجزیاتی طریقوں کو ایک ساتھ ملا کر تاریخ کو سمجھنے میں زیادہ مدد حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک طریقہ کار تمام سیاق و سباق کے لیے تسلی بخش نتائج فراہم نہیں کر سکتا۔ یہ پابندی نہ صرف مارکسی طریقہ کار پر نافذ ہوتا ہے بلکہ ان طریقوں پر بھی جو غیر معاشی پہلوؤں میں سے کسی ایک کو بنیاد بنا کر تحقیق کرتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا طریقہ کار نہیں ہے جو تمام موجودہ طریقوں کی بہترین خصوصیات کو یکجا کر کے حقیقی صورت حال (objective reality) کی مکمل تصویر کشی کر سکے۔ معروضی حقیقت (objective reality) تک رسائی ممکن نہیں ہے، اگرچہ فرض بھی کر لیا جائے کہ معروضی حقیقت جیسی کوئی چیز موجود بھی ہے۔ ہر طریقہ کار جزوی ہے۔ ایک خاص طریقہ معاشرے کو ایک واحد نقطہ نظر سے دیکھتا ہے، چاہے وہ نقطہ نظر طبقاتی ہو یا ذاتی یا کچھ اور۔ یہ ایک سوال ہے کہ کیا کوئی

خاص مؤرخ طبقے کو بنیاد بنا کر حاصل کیا گیا جزوی نقطہ نظر (partial perspective) دوسرے پہلوؤں کو بنیاد بنا کر اخذ کیے گئے جزوی نقطہ نظر پر ترجیح دے سکتا ہے۔ جزوی نقطہ نظر تمام انسانی علم کا خاصہ ہے۔ یہ صرف مارکسی طریقہ کار کی کمزوری نہیں ہے۔

4.16 مارکس اور 'غلط شعوری' کا نظریہ (Marx and the Idea of 'False Consciousness')

تاریخ کے مادیت پسند فلسفے پر غور کرتے ہوئے مارکس نے 'نظریہ' (ideology) یا 'غلط شعوری' (false consciousness) کے تصور کو بھی استعمال کیا۔ مذہب کی ہی مثال لے لیجیے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا موجود ہے، لیکن لوگ اب بھی خدا کے تصور پر یقین رکھتے ہیں۔ غلط شعوری زندہ برقرار رہتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ کچھ سماجی یا ذاتی مقاصد پورے کیے جا سکتے ہیں۔ یا ایک ''قوم'' (nation) کی مثال لے لیجیے، اگر ایک غریب اور امیر شخص میں مفادات کے تصادم کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہ ہو، تو وہ دونوں ایک ہی قوم سے وفاداری کیسے کر سکتے ہیں؟ مارکس کا خیال تھا کہ قوم پرستی (nationalism) ایک غلط نظریہ (False Ideology) ہے۔ درحقیقت اس کا خیال تھا کہ ایک ہی طبقے کے لوگوں (یعنی مختلف ممالک کے غریب اور مزدور) کے مفادات مشترک ہیں، نہ کہ کسی ایک ہی قوم کے مزدوروں اور سرمایہ داروں کے مفادات۔ مارکس ایک بین الاقوامیت پسند شخص تھا اور اس نے ایک عالمی انقلاب (world revolution) کا خواب دیکھا تھا جو پوری دنیا کو آزاد کرے گا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظریات خواہ وہ سچے ہوں یا غلط، لوگوں کے ذہنوں پر لمبی مدت تک مسلط رہتے ہیں۔ ایک ایسا نقطۂ نظر جس نے Ideology کو محض 'جھوٹا' قرار دے کر مسترد کر دیا تھا، وہ ان لوگوں کے خیالات اور اعمال کو سمجھنے اور سمجھانے میں ناکام پا رہا ہے جو بظاہر غلط عقائد کے تحت زندگی گذار رہے تھے۔

مارکس کی یہ پیشن گوئی بھی غلط ثابت ہوئی کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت دو اہم طبقات، یعنی سرمایہ دار اور محنت کش، معاشرے کے تمام افراد کی نمائندگی کریں گے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ 'متوسط طبقہ' (middle class) میں جس کا پیداواری نظام میں ایک مبہم مقام ہے، نمایاں طور پر اضافہ ہوا ہے۔ متوسط طبقے کے اراکین نہ سرمایہ دار ہیں اور نہ ہی مزدور۔ ان میں سے کچھ سرمایہ داری سے فائدہ اٹھانے والے ہیں، جب کہ دوسرے مزدوروں کے ساتھ مشترکہ طور پر اس نظام کا شکار ہیں۔ مزدور خود مختلف طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ ممالک میں محنت کش اشرافیہ (labour aristocracy) وجود میں آچکی ہے۔ Organised Sector کے مزدوروں کے لیے راحت ہوئی ہے جب کہ غیر منظم سیکٹر (جو ہندوستان جیسے ملک میں سب سے بڑا سیکٹر ہے) غریب اور پسماندہ رہا ہے۔

سرمایہ داری نظام نے بھی ثابت قدمی دکھائی ہے اور اپنے زوال کے بارے میں کی گئی پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کیا ہے۔ معاشی کساد بازاری (economic depression) کے خطرات کو (ایک ایسا بحران جو انیسویں صدی میں باقاعدگی سے پیش آیا اور بیسویں صدی میں 1930 کی دہائی کے عظیم کساد بازاری بحران تک جاری رہا) بڑے پیمانے پر کامیابی کے ساتھ ٹالا جا سکا ہے۔ عالمی معیشت میں اب جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک ایسا بحران ہے جسے 'کساد بازاری' (recession) کہا جاتا ہے جس میں پچھلی سرد بازاری (depression) کے مقابلے میں کم شدت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں عدم مساوات کے سنگین مسائل ہیں، خاص طور پر پچھلے چالیس سالوں میں، جن کا حالیہ برسوں میں

مارکسی ماہر معاشیات تھامس پیکٹی (Thomes Piketty) نے بخوبی تجزیہ کیا ہے۔ معاشی عدم مساوات سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لیے سنگین خطرہ ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ سنگین خطرہ موسمیاتی تبدیلی کے بحران (crisis of climate change) سے پیدا ہوا ہے جو اس وقت پوری دنیا پر منڈلا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی جو تاریخ کی اب تک کی بلند ترین سطح پر پہونچ چکی ہے، مادی اشیاء کی ضرورت سے زیادہ کھپت خاص طور پر ترقی یافتہ مغربی ممالک میں اور سرمایہ دارانہ پیداوار کو بڑھانے کے لیے جنگلات اور طبعی ماحول کی تباہی، ان سب نے مل کر آج کی دنیا کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ مارکس کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسانی سماج کی مادی پیداوار کو بڑھانے کی صلاحیت لا محدود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سرمایہ داری نظام کے حامی اور مارکسی دانشور دونوں موسمیاتی تبدیلی، جو دنیا کے وجود کے لیے خطرہ ہے، کو بھول گئے ہیں۔ ماحولیاتی تبدیلی کے خطرے سے نمٹنے کے لیے ایک باہمی اتفاق رائے پر آنا ضروری ہے جس کے لیے معاشرے کے اندرونی طبقاتی تنازعات یا ترقی یافتہ اور غریب اقوام کے درمیان تنازعات کو کم کرنا ناگزیر ہے۔ انسانیت کو اپنے وجود کے اس سنگین چیلنج کو روکنے کے لیے ایک ساتھ آنا ضروری ہے۔

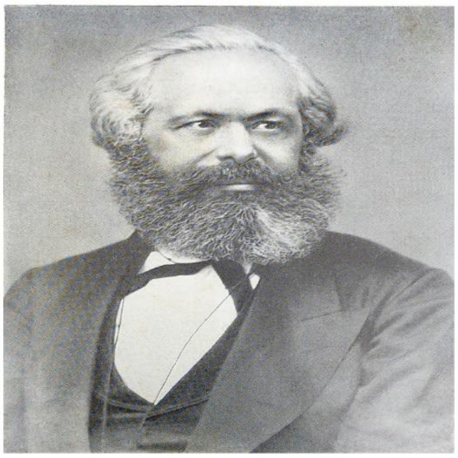

کارل مارکس

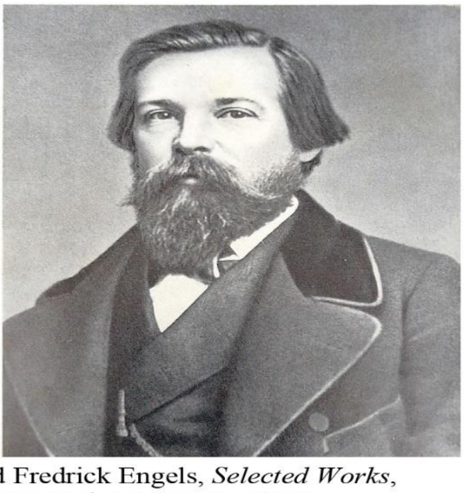

فریڈرک اینگلس

Source: Karl Marks and Fredrick Engels, *Selected Works*, Progress Publishers, Vol. I, Moscow, 1977.

KARL MARX

THE BRITISH RULE IN INDIA[237]

London, Friday, June 10, 1853

...Hindostan is an Italy of Asiatic dimensions, the Himalayas for the Alps, the Plains of Bengal for the Plains of Lombardy, the Deccan for the Appenines, and the Isle of Ceylon for the Island of Sicily. The same rich variety in the products of the soil, and the same dismemberment in the political configuration. Just as Italy has, from time to time, been compressed by the conqueror's sword into different national masses, so do we find Hindostan, when not under the pressure of the Mohammedan, or the Mogul,[238] or the Briton, dissolved into as many independent and conflicting States as it numbered towns, or even villages. Yet, in a social point of view, Hindostan is not the Italy, but the Ireland of the East. And this strange combination of Italy and of Ireland, of a world of voluptuousness and of a world of woes, is anticipated in the ancient traditions of the religion of Hindostan. That religion is at once a religion of sensualist exuberance, and a religion of self-torturing asceticism; a religion of the Lingam[239] and of the Juggernaut; the religion of the Monk, and of the Bayadere.[240]

I share not the opinion of those who believe in a golden age of Hindostan, without recurring, however, like Sir Charles Wood, for the confirmation of my view, to the authority of Khuli-Khan. But take, for example, the times of Aurung-Zebe; or the epoch, when the Mogul appeared in the North, and the Portuguese in the South; or the age of Mohammedan invasion, and of the Heptarchy[241] in Southern India; or, if you will, go still more back to antiquity, take the mythological chronology of the Brahmin himself,[242] who places the commencement of Indian misery in an epoch even more remote than the Christian creation of the world.

There cannot, however, remain any doubt but that the misery inflicted by the British on Hindostan is of an essentially different and infinitely more intensive kind than all Hindostan had to suffer before. I do not allude to European despotism, planted upon Asiatic despotism, by the British East India Company,[243] forming a more monstrous combination than any of the divine

Source: Karl Marks and Fredrick Engels, *Selected Works*, Progress Publishers, Vol. I, Moscow, 1977, p. 488.

FREDERICK ENGELS

PRINCIPLES OF COMMUNISM[35]

Question 1: What is Communism?

Answer: Communism is the doctrine of the conditions for the emancipation of the proletariat.

Q[uestion] 2: What is the proletariat?

A[nswer]: The proletariat is that class of society which procures its means of livelihood entirely and solely from the sale of its labour and not from the profit derived from some capital; whose weal and woe, whose life and death, whose whole existence depend on the demand for labour, hence, on the alternations of times of good business and times of bad business, on the fluctuations resulting from unbridled competition. The proletariat, or class of proletarians, is, in a word, the working class of the nineteenth century.

Q[uestion] 3: Thus, have there not always been proletarians?

A[nswer]: No. Poor folk and working classes have always existed, and the working classes have for the most part been poor. But such poor, such workers who lived under the just mentioned conditions, that is, proletarians, have not always existed, any more than competition has always been free and unbridled.

Q[uestion] 4: How did the proletariat arise?

A[nswer]: The proletariat arose as a result of the industrial revolution which unfolded in England in the latter half of the last century and which has repeated itself since then in all the civilised countries of the world. This industrial revolution was brought about by the invention of the steam-engine, of various spinning machines, of the power-loom, and of a great number of other mechanical devices. These machines which were very expensive and, consequently, could only be purchased by big capitalists altered the entire hitherto existing mode of production and ousted the hitherto existing workers because machines produced cheaper and better commodities than could the workers with their imperfect spinning-wheels and hand-looms. Thus, these machines handed over industry entirely to the big capitalists and rendered the workers' scanty property (tools, hand-looms, etc.) worthless, so that the capitalists soon owned every-

Source: Karl Marks and Fredrick Engels, *Selected Works*, Progress Publishers, Vol. I, Moscow, 1977, p. 81.

اب تک کی تمام معاشرے کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔

آزاد(freeman)اور غلام(slave)،اشراف اور مزدور، آقا اور غلام، گِلڈ ماسٹر اور مسافر، اگر ایک لفظ میں کہا جائے تو ظالم اور مظلوم ایک دوسرے کے خلاف مستقل طور پر کھڑے تھے، جو بلا تعطل کبھی پوشیدہ طور پر اور کبھی کھلے عام لڑتے رہے، یعنی ایک ایسی لڑائی یا تو بڑے پیمانے پر معاشرے کی انقلابی تشکیل نو پر ختم ہوئی یا کشمکش کرنے والے طبقہ کی بربادی پر

تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ہمیں تقریباً ہر جگہ معاشرے میں مختلف طبقوں کی ایک پیچیدہ درجہ بندی ملتی ہے۔ قدیم روم میں ہمارے پاس اشراف، فوجی سردار، عام لوگ، غلام؛ عہد وسطیٰ میں جاگیردار، گِلڈ ماسٹر، مسافر، پیشہ ور شاگرد، بندھوا مزدور؛ ان تمام طبقوں میں ذیلی درجہ بندی بھی تھی۔

جاگیردارانہ سماج سے پیدا ہونے والا جدید بورژوا(bourgeois) معاشرہ طبقاتی کشمکش کو ختم نہیں کر سکا ہے۔ اس نے پرانے طبقوں کی جگہ نئے طبقات، جبر کے نئے حالات، جدوجہد کی نئے شکلیں قائم کی ہیں۔

ہمارا عہد بورژوازی(bourgeoisie) عہد ہے جس میں ایک خاص بات ہے: اس نے طبقاتی دشمنی کو کھول کر سامنے رکھ دیا۔ مجموعی طور پر معاشرہ زیادہ سے زیادہ دو عظیم مخالف کیمپوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے، دو عظیم طبقوں میں جو براہ راست ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں: بورژوا(Bourgeoisie) اور پرولتاریہ(Proletariat)۔

(کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کے کمیونسٹ مینفیسٹو سے ماخوذ جو 1884 میں شائع ہوا)

4.17 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کے بعد آپ نے اس تاریخی تناظر کو سمجھ لیا ہے جس میں کارل مارکس نے تاریخ کی ایک مخصوص تشریح پیش کی تھی یعنی اس کے خیالات کہ معاشرہ ظالم اور مظلوم طبقات پر مشتمل ہے اور یہ کہ تمام تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ آپ مارکس کے بیان کردہ مختلف مراحل کو بھی سمجھ چکے ہیں جن سے انسانی معاشرہ گزرتا ہے اور گزرے گا۔ آپ نے یہ بھی سیکھا ہے کہ اگرچہ تاریخ کی تشریح کا مارکسی طریقہ کار جو معاشی عنصر کو فوقیت دیتا ہے، ایک بااثر علمی طریقہ کار کے طور پر سامنے آیا ہے، لیکن اسے میکانکی طور پر غیر یوروپی معاشروں پر نہیں تھوپا جا سکتا، بلکہ اسے تخلیقی طور پر اپنانے کی ضرورت ہے۔

4.18 کلیدی الفاظ(Keywords)

یوروسینٹرزم	:	غیر یوروپی دنیا کے بارے میں ایک متعصبانہ تصور یعنی اسے یوروپی چشمے سے دیکھنا۔
طبقاتی جدوجہد	:	مارکس کی تجویز کہ معاشرہ دو طبقوں پر مشتمل ہے اور وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے مخالف رہے ہیں۔

4.19 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.19.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مارکس کے مطابق انسانی تاریخ میں کتنے مراحل ہیں؟
2. یوروسینٹرسزم کیا ہے؟
3. *The Class Struggles in France, 1848 to 1850* کے مصنف کون ہیں؟
4. 'غلط شعور' سے کیا مراد ہے؟
5. تھامس پیکیٹی (Thomas Piketty) کون ہے؟
6. مارکس نے ہندوستانی معاشرے کو کس نظر سے دیکھا ہے؟
7. کمیونسٹ مینِفیسٹو (*Communist Manifesto*) کس سال شائع ہوا؟
8. کارل مارکس کی پیدائش کب ہوئی؟
9. فریڈرک اینگلز کون تھے؟
10. کس نے کہا ہے کہ ''اب تک کے تمام معاشرے کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے''؟

4.19.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. انسانی تاریخ کے تین مراحل پر ایک نوٹ لکھیں، جیسا کہ مارکس نے وضاحت کی ہے۔
2. کیا آپ ہندوستان کے بارے میں مارکس کے تصور سے اتفاق کرتے ہیں؟ اگر ہاں یا نہیں، تو کیوں؟
3. کیا مارکسزم ذات پات اور جنس جیسے متعدد درجہ بندیوں کا کامیابی سے تجزیہ کر سکتا ہے؟
4. طبقاتی جدوجہد سے متعلق مارکس کے تصور پر ایک نوٹ لکھئے۔
5. مارکس نے ہندوستان میں برطانوی راج کے بارے میں کیا کہا ہے؟

4.19.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 'مارکسی طریقہ کار اہم ہے لیکن ہندوستانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہے'۔ بحث کیجیے۔
2. ہندوستانی تاریخ کو سمجھنے کے لیے مارکسی طریقہ کار کے تخلیقی استعمال پر ایک مضمون لکھئے۔
3. کیا آپ اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہیں کہ آگے چل کر مارکسزم یونیورسٹیوں میں پڑھا جانے والا ایک تعلیمی طریقہ کار تک محدود ہو جائے گا؟ اگر، ہاں یا نہیں، تو، کیسے؟

4.20 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Chakrabarty, Dipesh, *The Climate of History in a Planetary Age*, University of Chicago Press, 2021.
2. Hobsbawm, Eric J., ‘Marx and History,’ *New Left Review*, London, 1/143, January/February 1984.
3. Perry, Matt, *Marxism and History*, Houndmills (U.K.), Palgrave, 2002.

اکائی 5۔انتونیو گرامشی

(Antonio Gramsci)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 انتونیو گرامشی کی حالات زندگی
5.3 گرامشی کے خیالات اور افکار کا ارتقاء
5.3.1 پہلا مرحلہ
5.3.2 دوسرا مرحلہ
5.3.3 تیسرا مرحلہ
5.3.4 چوتھا مرحلہ
5.4 نظریۂ تسلط
5.5 فلسفۂ عمل و مشق
5.6 دانشور
5.6.1 نامیاتی یا حیاتیاتی دانشور
5.6.2 روایتی یا راسخ العقیدہ دانشور
5.7 تعلیم سے متعلق گرامشی کے خیالات
5.8 ریاست سے متعلق گرامشی کا نظریہ
5.9 اکتسابی نتائج
5.10 کلیدی الفاظ
5.11 نمونہ امتحانی سوالات
5.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

5.0 تمہید (Introduction)

تحقیقی دنیا کے معروف فلسفیوں نے انسانی دنیا کو سمجھنے کے لیے متعدد نظریات پیش کیے ہیں۔انہوں نے معاصر دنیا کو بدلنے کے لیے کئی کوششیں کی۔کارل مارکس ایسے ہی ایک ممتاز فلسفی تھے۔مختلف مضامین سے وابستہ دانشور آج بھی علم وادب کے میدان میں ان کی حصہ رسدی کو بیان کرتے ہیں۔بعض دانشوران کی تعریفیں کرتے ہیں اور بعض ان کے نظریۂ طبقاتی جدوجہد کی مذمت کرتے ہیں۔انتونیو گرامشی اورایک فلسفی تھے۔ان کی عمر کافی مختصر تھی، لیکن انہوں نے نظریات کی دنیا کو کافی حد تک متاثر کیا۔وہ ایک اطالوی شہری تھے۔انہوں نے نہ صرف اپنے ہم عصروں کو بلکہ موجودہ زمانے کے اسکالروں کو بھی متاثر کیا ہے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- انتونیو گرامشی کے حالات زندگی سے واقف ہو پائیں گے۔
- ان کے فلسفۂ عمل و مشق کو سمجھ سکیں گے۔
- ان کے نظریۂ تسلط کو جان سکیں گے۔
- تعلیم،دانشوروں اور ریاست سے متعلق ان کے خیالات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

5.2 انتونیو گرامشی کے حالات زندگی (Antonio Gramsci: Early Life)

22جنوری 1891کو انتونیو گرامشی سار دینیا(Sardinia)اٹلی کے چھوٹے سے قصبے ایلس(Ales)میں پیدا ہوئے۔ان کے والدین غریب تھے، لیکن وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دینے کی خواہش مند تھے۔یہ امید اس وقت ٹوٹ گئی جب گرامشی کے والد کو خیانت کے معاملے میں ملازمت سے معطل کر کے قید کر دیا گیا۔گرامشی کی والدہ نے درزی کا کام اختیار کر کے معمولی کمائی پر سات بچوں کی پرورش کی۔گرامشی کو اچھی صحت نصیب نہیں ہوئی تھی کیونکہ ریڑھ کی ہڈی کی خرابی اور ان سے منسلک اندرونی عوارض اور شدید اعصابی پیچیدگی کے سبب،27اپریل 1937،ان کی قبل از وقت موت ہو گئی۔

1898 میں، گرامشی کو اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم کے اختتام پر چند سال تک رکاوٹیں آ گئی، کیونکہ انہیں کام پر جانا پڑتا تھا، لیکن ان کے والد کی جیل سے رہائی نے انہیں اسکول جانے کے قابل بنا دیا۔اگرچہ یہ نسبتاً ایک اچھا اسکول نہیں تھا، لیکن ایک خواندہ پس منظر نے انہیں سینئر اسکول(Senior School)میں داخلہ دلایا۔گرامشی کے بڑے بھائی، جنارو(Genarro)،ایک فوجی خدمت گذار اور سوشلسٹ عسکریت پسند تھے۔یہ جنارو ہی تھے جنہوں نے گرامشی کو سیاست سے متعارف کرایا۔وہ اکثر اپنے چھوٹے بھائی(گرامشی)کو اشتراکیت سے متعلق رسالے بھیجتا تھا۔اشتراکیت کی لہر نے پورے سار دینیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، جسے فوجیوں نے بے

دردی سے دبایا تھا۔ فوجی اور قانونی انسداد نے سارڈینیا کی قوم پرستی کو متحرک کیا۔ ان ابتدائی سالوں میں اپنے وطن سے حاصل ہونے والے ان اسباق نے گرامشی کی زندگی پر زبردست اثر ڈالا۔ 1911 میں، انہوں نے سارڈینیا کی ٹیورن یونیورسٹی سے دانشورانہ روایت حاصل کی۔ ناکافی وظیفہ، غذائی قلت اور دیگر مسائل کی وجہ سے ان کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بالآخر، علمیات اور لسانیات کی صلاحیتوں کے باوجود، گرامشی کو اپنی تعلیم ترک کرنی پڑی۔ اس کے علاوہ، بڑھتی ہوئی سیاسی وابستگی نے بھی انہیں پڑھائی چھوڑنے پر مجبور کیا۔

5.3 گرامشی کے خیالات اور افکار کا ارتقاء (Evolution of Gramsci's Ideas and Thoughts)

گرامشی کے خیالات اور افکار کو مندرجہ ذیل مراحل میں بیان کیا جاتا ہے:

5.3.1 پہلا مرحلہ (First Stage)

گرامشی کی سیاسی زندگی اور فکر کے چار مختلف مراحل ہیں۔ یہ چار مراحل سیاسی دنیا میں گرامشی کے نظریاتی ترجیحات اور رد عمل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ مرحلہ 1914 میں شروع ہوتا ہے اور 1919 میں ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں، گرامشی پہلی بار ٹیورن یونیورسٹی میں معاصر دانشوروں کے ساتھ سنجیدہ رابطے میں آ گئے۔ اس کے بعد، ان کا تعارف ہیگل کے فلسفۂ عمل (philosophy of praxis) کے ساتھ ہوا۔ ان کی تحریروں کو *Prison Notebooks* کے اصطلاح سے جانا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کو اٹلی میں انتونیو لیبریولا (Antonio Labriola) نے متعارف کرایا تھا۔ لیبریولا (1843–1904) کو اطالوی اشتراکیت کا بانی سمجھا جاتا ہے اور گرامشی ان کے خیالات سے متاثر تھے۔ ایک اہم مفکر جنہوں نے گرامشی کی سیاسی فکر کو کافی حد تک متاثر کیا وہ بینڈیٹو کروشے (Benedetto Croce) تھا۔ گرامشی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ اپنے دور طالب علمی میں کروشین (Crocean) تھے۔ یہ اثر ان کے ابتدائی مضامین سے بھی واضح ہوتا ہے۔ تاہم، ان کے جیل کی تحریروں میں مارکسزم کے حوالے سے کروشین فلسفے پر کافی تنقید دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس عرصے کے دوران گرامشی کے مضامین اور تبصرے (جو زیادہ تر سوشلسٹ اخبار !Avanti میں شائع ہوتے تھے) انقلاب کے ثقافتی اور روحانی حالات کے ساتھ تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ ساتھ ہی گرامشی شدید تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے مزدوروں میں حقیقی شعور بیدار کرنے کی مسیحائی خواہش کا اظہار کرتے تھے۔

5.3.2 دوسرا مرحلہ (Second Stage)

دوسرے مرحلے میں صنعتوں سے متعلق تحریکوں کا ایک سلسلہ شامل ہے۔ مئی 1919 میں، گرامشی اور مارکسی دانشوروں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے L'Ordine Nuovo (The New Order) رسالہ شروع کیا۔ یہ رسالہ شمالی اطالوی مزدوروں کی بڑھتی ہوئی عسکری جدوجہد کو نظریاتی اظہار اور عملی سمت دینے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ L'Ordine Nuovo کے ذریعے گرامشی نے معروف فیکٹری کونسل نظریہ پیش کیا۔ اس موقعے پر، ان کے فلسفۂ مثالیت نے معاشی کردار کے بارے میں ایک زیادہ قابل شناخت مارکسی حیثیت حاصل کی۔ اس کے نقطۂ نظر میں دو خاص عوامل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کارکنوں کی خود آموزی (self-education)

ٹھوس سیاسی تنظیم سازی کے۔ان کا ماننا تھا کہ طبقاتی شعور مزدوروں کی مفاہمتی سرگرمی کا ایک بے ساختہ پیداوار ہے۔اس لیے انقلابی پارٹی کا کام مزدور طبقے کی تربیت نہیں، بلکہ ان کے اندر مضبوط سیاسی اتحاد کا فروغ ہونا چاہیے۔

5.3.3 تیسرا مرحلہ(Third Stage)

تیسرا مرحلہ 1921 میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی(Partitio Communista Italiano)کے قیام کے وقت شروع ہوتا ہے اور 1926 میں گرامشی کی گرفتاری کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔اس عرصے کے دوران، انہوں نے بتدریج انقلاب کے عمل کو اس سے کہیں زیادہ سست سمجھا، جیسا کہ وہ پہلے ہی کونسل کی تحریک کے ذلت آمیز خاتمے کے ساتھ نظر آتا تھا۔اس سے یہ واضح ہو گیا کہ عوام کی خود مختار سرگرمی کسی بھی طرح سرمایہ داری کے خاتمے کے لیے کافی نہیں تھا۔اس کے نتیجے میں، گرامشی نے اپنی توجہ پارٹی اور اس کے اہم کردار کی طرف موڑ دی۔انہوں نے اپنی زیادہ تر توانائیاں اطالوی کمیونسٹ پارٹی اور کومنٹرن(Comintern)کے اندر روزمرہ تنظیمی مسائل کو حل کرنے اور فرقہ وارانہ انتشار کو ختم کرنے کے لیے وقف کی۔انہوں نے 23-1922 کا زیادہ تر حصہ ماسکو میں گزارا اور 1924 میں، انہوں نے اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت سنبھالی۔اس دوران ان کی تحریریں سیاسی حکمت عملی اور تدابیر کی ٹھوس ضرورتوں پر مرکوز تھیں۔

5.3.4 چوتھا مرحلہ(Fourth Stage)

انتونیو گرامشی کی سیاسی زندگی کا آخری مرحلہ ان کی نظریاتی ترقی میں سب سے اہم ہے۔1926 میں ان کی گرفتاری کے فوراً بعد، گرامشی نے اپنے فعال سیاسی تجربات کو وسیع تاریخی اور فلسفیانہ فریم ورک کے اندر قائم کرنے کے لیے تحقیق کا ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کیا۔ متعدد رکاوٹوں کے باوجود، انہوں نے تفویض کردہ کام کا ایک بڑا حصہ انجام دیا۔1929 اور 1935 کے درمیان، انہوں نے مختلف موضوعات سے متعلق تقریباً3,000صفحات پر مشتمل 32 کتابچے تحریر کیے۔یہ کتابچے ان کے (1926تک کے) سیاسی تجربے اور عمل کی انتہا تھی۔یہ کتابچے ادبی اور سیاسی دنیا میں *Prison Notebooks* کے نام سے مشہور ہیں۔جیل میں لکھے گئے ان تحریرات کو گرامشی کی بڑی نظریاتی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔کروشے کے وسیع مطالعے، مناظراتی تحریروں کی تحقیق اور فسطائی نظریے کی تنقید نے انہیں اپنا عالمی نظریہ اور اپنا 'فلسفۂ عمل'(philosophy of praxis)تیار کرنے میں مدد کی۔انہوں نے سیاست کو ایک خود مختار مضمون کے طور پر قبول کیا اور اس میں دانشوروں کے کردار پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اپنے ساتھی قیدیوں سے بات چیت کرتے ہوئے، انہوں نے پارٹی کو 'مزدور طبقے کے نامیاتی دانشور' کے طور پر پیش کیا ہے۔انہوں نے فسطائی ریاست کی حکمت عملی اور ہتھکنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قابل عسکریت پسند تنظیم کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔انہوں نے حکمران طبقے کے خلاف اتحادی یا دوست (Allies) جمع کرکے آئین ساز اسمبلی بنانے کی سیاسی ضرورت کو ظاہر کیا؛ اور اس طرح اشتراکیت کی حتمی فتح کی راہ ہموار کی۔

قید خانے میں گرامشی نے علم سیاست کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔حالانکہ قید خانے کے احتسابی عملے نے مارکسی تحریروں پر پابندی عائد کر رکھی تھی،اس لیے، مارکسزم کے بارے میں جاننے کے لیے انہیں تبصروں، تجزیوں اور تنقیدوں کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔انہوں نے کتابوں کی

عدم موجودگی میں جراید اور رسائل کا مطالعہ کیا۔اس طرح،انہوں نے ثقافتی ترقیوں سے رابطے میں رہ کر متوسط طبقے(bourgeoise) اور فسطائی ریاست میں فکری زندگی کی پسماندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

گرامشی کی سیاسی زندگی کے آخری مرحلے میں ان کے سیاسی فلسفے کے بہت سے پہلوؤں کی نظریاتی وضاحت دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک اہم تصور جس پر گرامشی نے اپنا قیمتی وقت اور توانائی صرف کی ہے وہ نظریۂ تسلط (Concept of Hegemony) ہے۔ کومنٹرن (Comintern) روایت سے تجربات حاصل کرتے ہوئے،انہوں نے ثقافتی اور فکری عوامل پر زور دے کر نظریۂ تسلط کی نئی وضاحت کی ہے۔ ان سے پہلے کسی بھی مارکسی دانشور نے یہ موقف پیش نہیں کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرے میں کسی ایک طبقے یا گروہ کی حکمرانی صرف مادی طاقت پر منحصر نہیں ہوتی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ جدید دور میں غالب طبقے کو اپنا اخلاقی، سیاسی اور ثقافتی اقدار عملی رویے کے روایتی اصولوں پر قائم کرنا چاہیے۔ لہذا نظریۂ تسلط وہ نظریہ ہے جو گرامشی کے فلسفے کو مارکسزم سے الگ کرتا ہے۔

5.4 نظریۂ تسلط (The Concept of Hegemony)

گرامشی کے بنیادی تصورات میں نظریۂ تسلط، دانشوری اور فلسفۂ عمل شامل ہیں۔ نظریۂ تسلط کی اصطلاح مابعد مارکسی دور میں وسیع پیمانے پر استعمال ہونے والی اصطلاح رہی ہے۔اس کی ایک قدیم روایت اور تاریخ بھی ہے۔ 1890 کی دہائی سے 1917 تک روسی سوشل ڈیموکریٹک تحریک میں ججمونیا (روسی زبان میں لفظ 'تسلط' کا مترادف) سب سے اہم سیاسی نعروں میں سے ایک تھا۔ یہ اصطلاح کومینٹرن (Comintern) روایت میں ایک محدود معنی کی حامل تھی، لیکن *Prison Notebooks* میں اسے وسیع تر مفہوم حاصل ہو گیا۔ *Prison Notebooks* میں، متعدد سیاق وسباق موجود ہیں جن میں 'نظریۂ تسلط' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ پہلی مثال میں اس اصطلاح سے مراد سرمایہ داروں کے خلاف مشترکہ جدوجہد میں مزدوروں اور دوسرے استحصالی گروہوں کا طبقاتی اتحاد ہے۔

'نظریۂ تسلط' کے ابتدائی استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ سرکردہ پرولتاروں (proletariat) نے اسے چھوٹے گروہوں کا اعتماد پانے اور سمجھوتہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگرچہ معاشرے میں معاشی حیثیت کے حوالے سے ان کے درمیان اختلافات ہیں، لیکن رعایت اور قربانیاں مختلف یعنی اخلاقی، سیاسی اور معاشی سطحوں پر ہو سکتی ہیں۔ یہاں یہ اصطلاح طبقاتی اتحاد، مشترکہ پلیٹ فارم اور سمجھوتوں کا مطالبہ کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے جس کے ذریعے سرکردہ گروہ کے متعدد مفادات کی قیمت پر چھوٹے گروہوں کی خواہشات کو پورا کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے سمجھوتے اور مشترکہ پلیٹ فارم صرف چھوٹے گروہوں کا اعتماد جیتنے کا باعث بنتے ہیں جس کا نتیجہ بالا خر تسلط قائم کرنا ہوتا ہے۔

کثیر مذہبی اور کثیر نسلی ریاستوں میں تسلط اس لیے قائم کیا جاتا ہے تاکہ اقلیتی گروہوں کی خواہشات اور مفادات کی نمائندگی کی جا سکے۔ اقلیتی گروہ مختلف طریقوں جیسے مذہبی، نسلی، سماجی، طبقاتی اور معاشی حیثیت سے اقلیت میں ہو سکتے ہیں – انہیں پرولتاریہ (Proletariat) کے تسلط میں لانا پہلے اقلیتوں کے لیے اور پھر پرولتاریہ کے تسلط کی مضبوطی کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس تسلط پسند نیٹ ورک کو موثر بنانے کے لیے، پرولتاریہ کو جزوی طور پر اس طرح قربانی دینی چاہیے، جس طرح وہ دوسرے مستقل گروہوں کو مخصوص

قربانیاں دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ صورتحال اس وقت حصول کامیابی کا سبب بن سکتا ہے جب پرولتاریہ اور اقلیتی گروہ کسی حد تک سمجھوتہ کر کے اپنے مقدمات کو مضبوط بناتے ہیں۔ اگرچہ ایسا انتظام پرولتاریہ کے تسلط کو مضبوط کرتا ہے، لیکن یہ بنیادی طور پر اقلیتوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ گرامشی ماتحت گروہوں کو ضم کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کے حق میں نہیں تھا۔ انہوں نے استحصال زدہ گروہوں کے اندر دوسروں کا اعتماد جیتنے کے لیے سمجھوتہ کرنے کی حمایت کی ہے۔ گرامشی لکھتے ہیں کہ اتحادی سماجی قوتوں کو جذب کر کے اندرونی تضادات کے بغیر ایک نیا، یکساں سیاسی، اقتصادی اور تاریخی بلاک تشکیل دیا جانا چاہیے۔ تاریخی بلاک کا یہ تصور، جس میں معاشرے کو بدلنے کے لیے معاشی، سماجی اور نظریاتی قوتوں کو عارضی طور پر یکجا کیا جاتا ہے، گرامشی کے متعدد تجزیوں میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

کومنٹرن روایت سے ہٹ کر، گرامشی نے سرمایہ دارانہ معاشرے میں نظریۂ تسلط کو محنت کش طبقے پر متوسط طبقے کی حکمرانی کے طریق کار کو بیان کیا۔ گرامشی طبقاتی طاقت کے دو طریقوں کے متعلقہ مقامات کے طور پر معاشرے کی سیاسی اور سول سطحوں کے درمیان فرق کا حوالہ بھی دیتا ہے جو کہ نظریۂ تسلط کے لیے بہت ضروری ہے۔ ان کے مطابق، سیاسی معاشرہ ایک زبردستی آلہ ہے جو اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ عوام الناس کی مخصوص پیداوار اور معیشت موجودہ وقت کے مطابق ہو۔ دوسری طرف، سول سوسائٹی پورے قومی معاشرے پر ایک سماجی گروہ کا تسلط ہے جسے نام نہاد نجی تنظیموں، جیسے چرچ، کاروباری انجمن، اسکول وغیرہ کے ذریعے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اگرچہ مارکس اور گرامشی نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے سول سوسائٹی کا تصور ہیگل سے لیا تھا، لیکن اس کا استعمال دونوں میں مختلف ہے۔ جہاں مارکس نے 'سول سوسائٹی' کی اصطلاح معاشی تعلقات کی مجموعی صورتحال کے لیے استعمال کیا ہے، وہی گرامشی نے 'سول سوسائٹی' کی اصطلاح نظریاتی بالائی تعمیر (ideological superstructure)، اداروں اور تکنیکی آلات کے لیے استعمال کی ہے جو سوچنے کے طریقوں کو تخلیق اور پذیرائی بخشتے ہیں۔

5.5 فلسفۂ عمل و مشق (The Philosophy of Praxis)

مارکسی فلسفے کی آمد تک فلسفے کو عمل سے الگ رکھنے کا رجحان عیاں تھا۔ مارکس پہلا دانشور تھا جنہوں نے نظریہ اور عمل کے اتحاد کا مطالبہ کیا۔ فلسفۂ عمل ایک مارکسی تصور ہے جس کا مطلب عمل میں لانا یا مشق کرنا ہے۔ مارکسی روایت کے مطابق، متعدد مفکروں نے اس نظریہ کا استعمال کیا۔ تاہم گرامشی نے اس نظریہ کو ایسے بیان کیا ہے، جیسے انتونیو لیبریولا (Antonio Labriola) نے کیا ہے۔ انتونیو لیبریولا اس نظریے کو ایک تاریخی سرگرمی سمجھتے ہیں۔ گرامشی نے بھی اس نظریے کو اسی معنی میں استعمال کیا، جہاں فکر اور خیالات کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس لیے، گرامشی کے مطابق یہ ایک تاریخی ضرورت ہیں۔

فلسفۂ عمل و مشق، جس کا مقصد ایک نئی ثقافت کی تخلیق ہے، فلسفہ کی تاریخ کے تنقیدی تجزیے کے ایک سلسلے سے گزرتا ہے، جس میں متعدد اسکالروں کی شراکت داری شامل ہے، لیکن کامیاب ہونے کے لیے ہمیں اعلیٰ (دانشوروں) اور نچلے درجے (عوام) کے فہم کی آمیزش اور امتزاج قائم کرنا چاہیے۔ آمیزش اور امتزاج کا مقصد مسئلے کا تجزیہ کرنا اور اس کا حل پیش کرنا ہے۔ آمیزش اور امتزاج 'اخلاقی اور

فکری بلاک' کی تعمیر کی طرف ایک قدم ہے۔اس سے عوام کے فکری پروگراموں کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔یہ آمیزش یا امتزاج نظریہ اور عمل کا سنگم ہے۔یہ فلسفہ دنیا سے متعلق ایک مربوط نظریہ پیش کرتا ہے۔ گرامشی نے تنقیدی معنوں میں 'فلسفۂ عمل' استعمال کیا ہے۔انہوں نے یہ نظریہ انتونیو لیبریولا سے لیا ہے۔لیبریولا کے مطابق، یہ مادی پیداواری قوتوں کو تبدیل کرنے کی ایک ٹھوس تاریخی سرگرمی ہے۔

گرامشی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لیبریولا کے فلسفۂ عمل کو سراہا اور اس عمل میں مزید گنجائش پیدا کی تاکہ وہ ایک عمومی فلسفہ بن جائے۔ گرامشی اور لیبریولا کے مطابق، فلسفۂ عمل ایک ٹھوس تاریخی حقیقت پر مبنی ہے اور تمام مثالی فلسفوں کا حل ہے۔وہ فلسفۂ عمل کو خود مختار، آزاد اور مقدم سمجھتے ہیں۔ گرامشی نے اس فلسفے کو ایک ایسی چیز سمجھا جس میں مارکس کی آمد سے پہلے عملیت کا فقدان تھا۔یہ عنوان یعنی 'فلسفۂ عمل و مشق' *Prison Notebooks* کا ایک اہم حصہ ہے۔ گرامشی کے مطابق، فلسفہ حقیقت سے پیدا ہونے والے کچھ اہم مسائل کا جواب ہے، جو اپنی فوری مطابقت میں کافی مخصوص ہیں۔اس طرح، ہر فلسفہ معاشرے میں رائج حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فلسفہ معاشرے میں مقیم مختلف گروہوں کے مادی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔فلسفے کو اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے سیاسی اور عملی بننا چاہیے۔فلسفۂ عمل میں دو اہم مہمات ہیں: خالص نظریات پر قابو پانا تاکہ فلسفۂ عمل کو دوسرے فلسفوں پر غالب ہو جائے۔ان لوگوں کو تعلیم دینا جو ابھی تک عہد وسطیٰ کی ثقافت میں ہیں۔فلسفۂ عمل کسی مخصوص نظریہ کی عملیت پر یقین رکھتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ کی مادہ کاری یا تجسیم کاری پر زور دیتا ہے۔ایسا کرنے کے لیے، کسی کو ایسے عملی عناصر کی تخلیق کرنی ہوگی، جو نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہیں۔ نظریہ اور عمل کی شناخت ایک اہم کارگذاری ہے، جس کے ذریعے نظریہ کو 'حقیقت پسند' اور 'استدلالی' پہلو کے طور پر ظاہر کیا جاتا ہے اور عمل کو عقلی اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ گرامشی کے مطابق، تاریخ، فلسفہ اور سیاست کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ طبقاتی جدوجہد کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ سرکردہ گروہوں کے تصورات، عوام کا عالمی نظریہ اور ان کے باہمی روابط، فلسفۂ عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔لہٰذا، فلسفۂ عمل ایک "ثقافتی جدوجہد ہے جو مقبول ذہنیت کو تبدیل کرنے اور فلسفیانہ اختراعات کو پھیلانے کی کوشش کرتی ہے جو تاریخی طور پر موثر ثابت ہوتی ہیں"۔اس طرح فلسفہ کی تاریخ مختلف عالمی نظریات رکھنے والے طبقات کے درمیان تصادم کی تاریخ ہے۔

5.6 دانشوران (The Intellectuals)

تسلط قائم کرنے کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے، گرامشی نے دانشوروں کی حیثیت کو ایک نئے پہلو میں واضح کیا۔تاریخ میں دانشوروں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اسے ایک بہت بڑی غلطی قرار دیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے دانشوروں کی اہمیت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ایسے حالات میں گرامشی نے دانشوروں کی ایک نئی تعریف کی جس کے لیے وہ اب بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ گرامشی کہتے ہیں کہ 'تمام انسان دانشور ہیں، کیونکہ سب کے پاس فکری اور عقلی صلاحیتیں ہوتی ہیں، لیکن تمام لوگوں میں دانشوروں کے سماجی افعال نہیں ہوتے ہیں۔' ہر کوئی انسان ایک دانشور ہے لیکن ہر کسی سے دانشور کا کردار ادا نہیں ہوتا ہے۔انہوں نے دانشوروں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، جیسے نامیاتی یا حیاتیاتی دانشور اور راسخ العقیدہ یا روایتی دانشور۔

5.6.1 نامیاتی یا حیاتیاتی دانشور (The Organic Intellectuals)

انتونیو گرامشی نے طبقاتی جدوجہد، ثقافتی تسلط اور معاشرے میں دانشوروں کے کردار کے وسیع تجزیہ کے طور پر 'نامیاتی دانشوروں' کا نظریہ تیار کیا ہے۔ گرامشی نے اپنے خیالات *Prison Notebooks* میں بیان کیے ہیں۔ نامیاتی دانشوروں کا نظریہ ان کی فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشروں میں سماجی تبدیلی اور انقلاب کیسے واقع ہو سکتا ہے۔

گرامشی کے مطابق، نامیاتی دانشور وہ ہیں جو کسی مخصوص سماجی اور معاشی طبقے سے جڑے ہوتے ہیں، جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ اپنے طبقے کے تجربات، اقدار اور جدوجہد سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور لاتعلق یا غیر جانبدار شخصیت نہیں ہوتے ہیں۔ نامیاتی دانشور اپنے طبقے کی ثقافتی اور سیاسی جدوجہد کی تشکیل اور رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گرامشی کی فکر میں نامیاتی دانشوروں کے بارے میں سمجھنے کے لیے کچھ اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- نامیاتی دانشور کسی خاص طبقے، جیسے مزدور، متوسط طبقہ یا دیگر سماجی گروہوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔
- وہ عام طور پر طبقے کے نظریے اور شعور کو بیان کرتے ہیں۔
- نامیاتی دانشور نہ صرف اپنے طبقے کے مفادات کو بیان کرتے ہیں بلکہ ثقافتی اور سیاسی شعبوں میں قیادت فراہم کرتے ہیں۔
- وہ نظریات اور اقدار کی تشکیل اور اشتہار کرتے ہیں اور مخصوص طبقے کی امنگوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

گرامشی نے نامیاتی دانشوروں کو "روایتی" دانشوروں سے الگ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ روایتی دانشور اپنے طبقے کے مفادات اور خدشات سے زیادہ لاتعلق ہو سکتے ہیں یا خود کو دوسری سماجی قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ روایتی دانشور زیادہ تجریدی یا عالمگیر نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ جبکہ نامیاتی دانشور ثقافتی تسلط کو برقرار رکھنے یا اسے چیلنج کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ ثقافتی اور نظریاتی ڈھانچے کو تقویت دینے یا اس میں خلل ڈالنے میں مدد کر سکتے ہیں جو حکمران طبقے کو طاقت یا سہارا بخشتے ہیں۔ علاوہ ازیں گرامشی کا خیال تھا کہ نامیاتی دانشور موجودہ طاقت کے ڈھانچے اور نظریات کو چیلنج کرنے میں اپنے طبقے کی قیادت کرتے ہوئے سماجی تبدیلی اور انقلاب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا کردار معاشرے کو بدلنے کی جدوجہد میں لازمی ہے۔ دراصل، گرامشی کا نامیاتی دانشوروں کا نظریہ ثقافتی اور سیاسی منظر نامے کی تشکیل میں دانشوروں کے متحرک اور فعال کردار پر زور دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ دانشور اس سماجی طبقے سے کیسے جڑے اور متاثر ہوتے ہیں، جہاں سے وہ ابھرتے ہیں۔ وہ طبقاتی جدوجہد میں فکری قیادت کی اہمیت اور نامیاتی دانشوروں کی قیادت میں اجتماعی کارروائی کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی کے امکانات کو واضح کرتے ہیں۔

5.6.2 روایتی یا راسخ العقیدہ دانشور (The Traditional Intellectuals)

بظاہر اس قسم کے دانشوروں کا ارتقا کسی خاص طبقے کی حمایت سے نہیں ہوا۔ بلکہ، وہ کسی بھی پرانی روایت کے سائے کے طور پر وجود میں آ گئے۔ گرامشی نے کلیسائی طبقے کی تاریخ کا مشاہدہ کیا اور بتایا کہ روایتی دانشور کوئی ممتاز طبقہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی طبقاتی وفاداری کو محض

پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ گرامشی کے دانشور طبقے کی درجہ بندی کے پیچھے بنیادی مقصد محنت کش یا مزدور طبقے کے انقلابی کردار کی نشاندہی کرنا تھا۔ اسی لیے انہوں نے کہا کہ یقینی اور مجموعی سماجی تبدیلی لانے کے لیے انہیں نامیاتی دانشوروں کا ایک نیا طبقہ بنانا ہوگا (یاد رہے کہ محنت کش طبقہ اس تبدیلی کو قائم کرنے کا عہد پہلے ہی لے چکا تھا)۔ اس کے بعد دانشور روزمرہ کے تجربات کو استعمال کر کے سیاسی سرگرمیوں کی قیادت کریں گے۔ پھر وہ انسانیت کے تاریخی تصور سے بتدریج محنت کش طبقے کے ناظم یا سیاسی مشیر کا اہم کردار ادا کریں گے۔ محنت کش طبقہ نامیاتی دانشوروں کے تعاون اور اپنی انقلابی سرگرمیوں کے ذریعے روایتی دانشوروں کو اپنے مسلک کی حمایت کی طرف راغب کریں گے۔ ان دانشوروں کے ذریعے محنت کش طبقے کا نظریہ عوام میں پھیل جائے گا۔ دھیرے دھیرے ان کا نظریہ لوگوں کی حمایت حاصل کرے گا، جسے سماجی تبدیلیوں کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

5.7 تعلیم سے متعلق گرامشی کے خیالات (Gramsci's Ideas on Education)

سال 1923 میں جینٹل (اٹلی کے وزیر تعلیم) نے مسولینی کی حکومت کے لیے سازگار دانشوروں کا ایک گروہ تیار کرنے کے لیے، کاساٹی کینون (Casatti Canun) کے ساٹھ سالہ پرانے تعلیمی نظام میں تبدیلی لائی۔ درحقیقت، جینٹل (Jentil) نے مسولینی کے جدامجد جولیٹی (Jolitti) کی پالیسی کو مکمل کیا، جنہوں نے 1921 میں یہ تعلیمی پالیسی کراچ [Crotch] (اٹلی کے وزیر تعلیم) کو متعارف کرائی تھی۔ کاساٹی کینون کی تعلیمی پالیسی میں ردوبدل کرتے ہوئے، جینٹل نے کلاسیکی اور پیشہ ورانہ اسکولوں کی تقدیر پر زور دیا اور اس کے ساتھ مذہبی تعلیم کی بھی بات کی۔

گرامشی نے اس تعلیمی پالیسی کی تنقید کرتے ہوئے ایک نئی تعلیمی پالیسی پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ پرانے اسکولوں کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہے، لیکن اس کی اصلاح کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ لگتا ہے۔ مسئلہ نصاب کا نہیں بلکہ ان مردوں کا تھا جو اساتذہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور نہ صرف ان مردوں کا بلکہ پورے سماجی نظام کا جس کی وہ نمائندگی کرتے تھے۔" انہوں نے جینٹل کی تعلیمی پالیسی کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ پیشہ ورانہ اسکولوں کے طلباء نہ ریاستی انتظامیہ کی رہنمائی کرنا سیکھ رہے ہیں اور نہ ہی وہ ایسے معلومات حاصل کر رہے ہیں جس سے انہیں جمہوریت سمجھنے میں مدد ملے گی۔ نتیجے کے طور پر، اقتدار کچھ دانشوروں یا اشراف طبقے کی ایک خاص شاخ کے ہاتھ میں مرکوز ہو جائے گا، جس کے ذریعے فسطائی ریاست اپنے طاقت کو وسیع کر سکتی ہے۔ اس خوف سے آزادی حاصل کرنے کے لیے گرامشی نے ایک نئی تعلیمی پالیسی تجویز کی جس میں 'عملی کارکردگی' کے ساتھ 'ذمہ داریوں اور حقوق' کو سیکھنے کی گنجائش ہوگی۔ اس تعلیمی پالیسی کے ذریعے جنرل اسکول (General School) کے آخری مرحلے میں 'انسانیت' کے بنیادی اقدار کو پیدا کرنے کی بھی بات کی گئی۔ اس کے علاوہ، اس میں نظم وضبط اور اخلاقی آزادی کے فکری احساسات کو بھی شامل کیا گیا۔

ان کے مطابق، تعلیمی بحران پر قابو پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ سب کے لیے پرائمری تعلیم کو یقینی بنایا جائے تاکہ لوگوں کو ایک انسانیت اور ثقافت کے بارے میں سکھایا جائے۔ اس کے نتیجے میں جسمانی محنت کی نشوونما اور فکری کاموں کو انجام دینے میں ضروری طاقت

کے درمیان مساوات پیدا ہوگی۔ مذکورہ تعلیمی نظام کے جنرل اسکولوں (General Schools) میں طلباء کو وقتاً فوقتاً ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر خصوصی تربیتی اسکولوں میں جگہ دی جائے یا براہ راست کسی نافع کاروبار میں شامل کیے جائیں۔ ایک جنرل اسکول کا مقصد نوجوان نسل کی ذہنی نشو و نما، فکری اور حقیقت پسندانہ سرگرمیوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑھانا اور کام کرنے اور نیک نیتی کے لیے ان کے جوش و جذبے کو ابھارنا تھا۔ ان جنرل سکولوں کے اخراجات حکومت برداشت کرے گی۔ گرامشی کے مطابق، اسکول کی عمارتیں، سائنسی آلات اور اساتذہ کے علم میں بے مثال توسیع اس طرح کی تعلیم کے لیے ضروری ہیں۔ ایسے اسکولوں کی تعلیم کی مدت وہی ہونی چاہیے جو موجودہ وقت کے پرائمری اور سیکنڈری تعلیمی اداروں میں رائج ہے۔ یقیناً اسے نصاب، طریقہ کار اور سیکھنے کے عمل کے تناظر میں دوبارہ ترتیب دینا چاہیے۔ ان کے مطابق، پہلا درجہ تین یا چار سال سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ عملی مضامین میں پڑھنا، لکھنا، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، حقوق و ذمہ داریاں، ریاست اور معاشرہ شامل ہیں۔ ان مضامین سے متعلق بنیادی علم دنیا کے بارے میں نئے خیالات اور نظریات کو جنم دے گا۔ کورس کے بقیہ حصے کو چھ سال کے اندر مکمل ہونا چاہئے تاکہ جنرل اسکول کے تمام مراحل پندرہ سے سولہ سال کے اندر مکمل کیے جائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنرل اسکولوں کو کالجوں کی طرح ہونا چاہیے جہاں ہمیشہ سماجی طور پر منظم زندگی ہو اور مطالعہ کرنے کے منظم طریقے موجود ہو۔ تعلیم کے آخری مرحلے کو اس طرح سے تشکیل دیا جانا چاہئے کہ یہ خود بخود معلوم ہو کہ یہ کسی کی تعلیم کا آخری حصہ ہے اور اس کا مقصد انسانیت کے بنیادی اقدار کو پیدا کرنا اور فکری نظم و ضبط اور اخلاقی آزادی کے جذبات کو بڑھانا ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا مقصد ایک تخلیقی یا ایجادی اسکول اور نظم و ضبط کا قیام ہے۔ استاد کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایک دوستانہ معلم کا کردار ادا کرے۔ اس مرحلے میں سیمیناروں، لائبریریوں اور تجربہ گاہوں میں جانچ اور تجربات کرکے سیکھنا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنرل اسکولوں کا قیام اسکولوں اور سماجی زندگی میں دانشورانہ کام اور مختلف فنون کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے گا۔ یہ مجموعی فارمولہ ثقافت کے تمام اعضاء میں ظاہر ہوگا اور اس طرح تبدیلی آجائے گی۔

5.8 ریاست سے متعلق گرامشی کا نظریہ (Gramsci on State)

گرامشی نے اس بات پر زور دیا کہ ریاست ایک یک سنگی اور متغیر اکائی نہیں ہے بلکہ مسلسل جدوجہد کا ایک خطہ ہے۔ محنت کش طبقہ سمیت مختلف سماجی گروہ ریاست کو تبدیل کرنے اور غالب طبقے کے تسلط کو چیلنج کرنے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس تناظر نے جمود کو چیلنج کرنے کے لیے انسدادِ تسلط پسند قوتوں کو تیار کرنے کے خیال کی حوصلہ افزائی کی۔ *Prison Notebooks* میں 'ریاست' سے متعلق مندرجہ ذیل تین مختلف قسم کے مباحثے تفویض کیے گئے ہیں:

- پہلے ریاست کو ایک 'بڑے ڈھانچے' کے طور پر سمجھا جاتا ہے جو سول سوسائٹی کی خود مختاری کو چھپاتا ہے۔ اس طرح ریاست سول سوسائٹی سے متصادم ہے۔
- ریاست کی اصطلاح سیاسی اور سول سوسائٹی دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔
- 'ریاست' کو نظریاتی اور سیاسی سرگرمیوں کی ایک مکمل ساخت سمجھا جانا چاہیے، جس کے ذریعے حکمران طبقہ نہ صرف اپنے تسلط کا جواز پیش کرے بلکہ اسے برقرار بھی رکھے اور حکمرانوں کی فعال رضامندی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو سکے۔

لہذا، ریاست اور گرامشی کے نظریۂ تسلط کی کسی بھی بحث میں مندرجہ بالا بیان کیے گئے نکات کا ذکر لازمی ہے۔ ابتدائی مارکسیوں کے برعکس، گرامشی کو ریاست اور اس کے افعال کے بارے میں ان کے مخصوص تصور کی وجہ سے اکثر بالائی تعمیر (superstructure) کا نظریہ کار سمجھا جاتا ہے۔ گرامشی نے Ordine Nuovo میں اپنی تحریروں کے ذریعے اس بات پر زور دیا ہے کہ ریاست اور معیشت یا ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلقات بدل چکے ہیں۔ اس طرح، گرامشی ریاست کے اخلاقی اور شہری افعال کی بات کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تحریروں میں یہ رائے پیش کی تھی کہ ریاست صرف جبر کا کام کرتی ہے، بعد میں انہوں نے ریاست کے شہری اور اخلاقی افعال کو زیادہ اہم قرار دیا۔ ریاست کے معاشی اور سیاسی افعال کو یہاں کے اخلاقی افعال سے کم اہمیت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی ثقافتی اخلاقیات کو بلندی تک لے جائے۔

A Chronology of Antonio Gramsci's Life: انتونیو گرامشی کے حالات زندگی

1891: 22 جنوری کو کاگلیاری (Cagliari) کے قریب ایلس (Ales) میں پیدا ہوئے۔

1911: کاگلیاری میں لائسیم (Lyceum) سے گریجویشن کی۔ نومبر میں، انہوں نے ٹیورن یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات میں داخلہ لیا۔

1913: ٹورن کے سوشلسٹ سیکشن (Socialist section) میں شمولیت اختیار کی۔

1915: 10 دسمبر کو !Avanti کے ٹیورن ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوگئے۔

1917: انہوں نے اپنی صحافتی سرگرمی جاری رکھی اور گریڈو ڈیل پوپولو (The People's Cry) کے ڈائریکٹر بن گئے۔ اس کے بعد، وہ ٹورین کے سوشلسٹ سیکشن کی عارضی ایگزیکٹو کمیٹی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

1918: گریڈو ڈیل پوپولو (The People's Cry) نے اشاعت روک دی۔

1919: Tasca، Terracini اور Togliatti کے ساتھ، انہوں نے ہفتہ وار آرڈینے نوؤنو (Ordine Nuono, The New Order)، شروع کیا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم مئی کو شائع ہوا۔

1920: ستمبر میں انہوں نے فیکٹری پر قبضہ کرنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ 24 دسمبر کو ہفتہ وار آرڈینے نوؤنو کا آخری شمارہ شائع ہوا۔

1921: کو اطالوی کمیونسٹ پارٹی قائم کی۔

1921: یکم جنوری کو روزنامہ آرڈینے نوؤنو کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ 21 جنوری 1921 کو، پہلی اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن کے طور پر منتخب ہوئے۔

1922: مارچ میں، وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ایگزیکٹو کمیٹی میں پارٹی کی نمائندگی کے لیے منتخب ہوئے۔ 26 مارچ کو وہ ماسکو روانہ ہوئے۔ جون میں، انہوں نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس میں شرکت کی۔ بیمار ہونے کی وجہ سے، انہیں ماسکو کے ایک کلینک میں داخل کرایا گیا، جہاں ستمبر میں، انہوں نے اپنی ہونے والی بیوی، جولیا شوٹ (Julia Schucht) سے ملاقات کی۔

1923: جب وہ ماسکو میں قیام پذیر تھے، اطالوی پولیس نے ان کی گرفتاری کا اختیار نامہ جاری کر دیا۔ اطالوی کمیونسٹ پارٹی اور دیگر یورپی

کمیونسٹ پارٹیوں کے درمیان روابط قائم رکھنے کے لیے انہیں کمیونسٹ انٹرنیشنل کے عاملہ نے منتخب کیا تھا۔ وہ 3 دسمبر 1923 کو ویانا (Vienna) پہنچے۔

1924: 22 فروری کو، l'Unita (The Unity) کا پہلا شمارہ ملان (Milan) سے شائع ہوا۔ یکم مارچ کو آرڈینے نوؤنو کا تیسرا سلسلہ (جو اس بار پندرہ روزہ کے طور پر) روم میں شائع ہوا۔ 6 اپریل کو وہ وینیٹو (Veneto) حلقے میں نائب کے طور پر منتخب ہوئے۔ وہ 12 مئی کو اٹلی واپس آ گئے۔ اگست میں ان کا بیٹا ڈیلیو (Delio) ماسکو میں پیدا ہوا۔

1925: جنوری میں، انہوں نے روم میں اپنی سالی تاتیانا شوٹ (Tatiana Schucht) سے ملاقات کی۔ مارچ اور اپریل میں، انہوں نے ماسکو میں انٹرنیشنل ایگزیکٹو کے پانچویں اجلاس میں حصہ لیا۔

1926: جنوری میں، انہوں نے اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی تیسری قومی کانگریس لیان (Lyon) میں شرکت کی۔ اگست میں، ان کا دوسرا بیٹا، جیولیانو (Giuliano)، ماسکو میں پیدا ہوا۔ 8 نومبر کو انہیں گرفتار کرکے ریجینا کویلی (Regina Coeli) میں قید کر دیا گیا۔ 18 نومبر کو انہیں پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ 7 دسمبر کو وہ یوسٹیکا (Ustica) جزیرے پر پہنچ گئے۔

1927: 14 جنوری کو میلان (Milan) کی فوجی عدالت نے ان کی گرفتاری کا اختیار نامہ جاری کر دیا۔ 20 جنوری کو انہیں یوسٹیکا (Ustica) سے سین وٹور (San Vittore) جیل بھیج دیا گیا۔

1928: مارچ میں ان پر ایک خصوصی عدالت نے مقدمہ چلایا۔ 11 مئی کو وہ روم روانہ ہوئے اور اگلے دن انہیں ریجینا کوئلی میں قید کر دیا گیا۔ 28 مئی کو اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ 4 جون کو انہیں بیس سال، چار ماہ اور پانچ دن قید کی سزا سنائی گئی۔ 22 جون کو انہیں باری (Bari) کے قریب توری (Turi) کی خصوصی جیل میں تفویض کیا گیا، جہاں وہ 19 جولائی کو پہنچے۔

1929: 8 فروری کو انہوں نے Prison Notebooks لکھنا شروع کی۔

1931: وہ پہلے ہی شدید بیمار تھے اور اگست میں وہ صحت کی ناسازگی سے مزید متاثر ہوئے۔

1932: معافی کے اقدامات کے بعد، ان کی سزا کو کم کرکے بارہ سال اور چار ماہ کر دیا گیا۔

1933: مارچ میں انہیں دوبارہ صحت کی ناسازگی کا سامنا کرنا پڑا۔ جولائی میں، انہوں نے تاتیانا شوٹ سے کہا کہ وہ کسی دوسرے جیل کے دارالشفاء میں ان کی منتقلی کے لیے درخواست جمع کرے۔ اکتوبر میں ان کی درخواست منظور ہو گئی اور 19 نومبر کو انہیں (توری چھوڑ کر) سویٹاوچیا (Civitavecchia) میں تفویض کر دیا گیا۔ 7 دسمبر کو، زیر حراست گرامشی کو فارمیا (Formia) میں ڈاکٹر کسومانو (Dr Cusumano) کے کلینک میں داخل کرایا گیا۔

1934: انہوں نے مشروط آزادی کی درخواست پیش کی، جو 25 اکتوبر کو منظور ہو گئی۔

1935: اپریل میں، انہوں نے فیسول (فلورنس کے قریب) کے ایک نجی کلینک میں منتقلی کی درخواست جمع کی۔ جون میں انہیں تیسری بار صحت کی سنگین صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ 24 اگست کو، انہیں ڈاکٹر کسومانو کے کلینک سے روم کے کیوسیانا (Quisisana)

کلینک میں منتقل کیا گیا۔

1937: 25اپریل کوانہیں دماغی نکسیر لگ گئی اور 27اپریل کو ان کاانتقال ہو گیا۔اگلے دن ان کی تدفین ہوئی۔ان کے جسد خاکی کو روم کے اکاٹولیکو(Acattolico)قبرستان میں دفن کیا گیا۔

(Source: Antonio A. Santucci, *Antonio Gramsci*, Aakar, New Delhi, 2011.)

5.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں مارکسی فکر اور ثقافتی تسلط کے نظریہ میں گرامشی کی شراکت کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں ثقافتی علوم، سیاسیات اور تنقیدی نظریہ پر انتونیو گرامشی کے نظریات کا اثر بھی بیان کیا گیا ہے۔ان کی تحقیق- ثقافت، حکومت اور سماجی تبدیلی کے درمیان تعلق میں دلچسپی رکھنے والے اسکالروں کے لیے حوصلہ افزائی کا اہم ذریعہ رہا ہے۔موجودہ سماجی اور سیاسی تجزیوں میں نظریہ (ideology)اور طاقت کے مباحثوں میں گرامشی کا نظریۂ تسلط ایک مرکزی موضوع ہے۔گرامشی کی تحریروں پر دنیا بھر کے اسکالروں کے درمیان مطالعہ اور بحث جاری ہے، جس کی وجہ سے ان کو سیاسی نظریہ اور ثقافتی علوم کے شعبوں میں ایک معروف اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔اس کے علاوہ، ماتحت تاریخ نویسی بھی گرامشی کے نظریات سے بہت متاثر ہے اور اس طرح، ان کے خیالات ماتحت تاریخ نویسی میں دلچسپی رکھنے والے اسکالروں سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔

5.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

نظریۂ تسلط: تسلط ایک قسم کا غلبہ ہوتا ہے جس کی بنیاد مغلوب لوگوں اور گروہوں کی رضامندی پر ہوتی ہے نہ کہ خالصتاً کسی رہنما کے جبر اور زبردستی پر۔

بالائی تعمیر (Superstructure): کسی چیز کے اوپر بنایا ہوا ڈھانچہ۔بالائی تعمیر سے مراد وہ نظریات ہیں جو ایک خاص دور میں غالب کردار ادا کرتی۔اس میں وہ سب شامل ہیں جو "لوگ کہتے ہیں، تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں" اور اس میں "سیاست، قوانین، اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات (Metaphysics) وغیرہ" جیسی چیزیں بھی شامل ہیں۔

مارکسزم: مارکسزم ایک سماجی، معاشی اور سیاسی فلسفہ ہے جو مزدوروں پر حکمران طبقے کے اثرات کا تجزیہ کرتا ہے، جس کی وجہ سے معاشرے میں دولت اور مراعات کی غیر مساوی تقسیم ہوتی ہے۔

ثقافتی تسلط: ثقافتی تسلط ایک فلسفیانہ اور سماجی نظریہ ہے جس میں ثقافتی طور پر متنوع معاشرے پر کوئی ایک سماجی طبقہ غلبہ حاصل کرتا ہے۔دوسرے الفاظ میں، یہ ایک سماجی گروہ کا دوسرے سماجی گروہ پر غلبہ ہے، مثال کے طور پر حکمران طبقے کا دیگر تمام طبقات پر۔

5.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. انتونیو گرامشی کب پیدا ہوئے؟
2. *Prison Notebooks* کس نے لکھی ہے؟
3. اصطلاح 'hegemony' (غلبہ) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. کومنٹرن سے کیا مراد ہے؟
5. انتونیو گرامشی کی وفات کب ہوئی؟
6. گرامشی کے مطابق ثقافت تعلیم کو کیسے متاثر کرتی ہے؟
7. اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد کب ڈالی گئی؟
8. گرامشی کو کمیونسٹ انٹر نیشنل کی ایگزیکٹو کمیٹی میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی نمائندگی کے لیے کب منتخب کیا گیا؟
9. انتونیو گرامشی نے کس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے؟
10. گرامشی نے ہفتہ وار Ordine Nuovo اخبار کب شروع کیا؟

5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. روایتی دانشوروں پر ایک نوٹ لکھیں۔
2. گرامشی کے معاشرے کے سول اور سیاسی درجوں کا جائزہ لیں۔
3. ریاست کے بارے میں گرامشی کے خیالات پر تبادلہ خیال کریں۔
4. گرامشی کے نظریۂ تعلیم پر روشنی ڈالیے۔
5. نامیاتی دانشوروں پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔

5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گرامشی کے نظریات اور افکار کے مختلف مراحل پر ایک مضمون لکھیں۔
2. گرامشی کے نظریۂ تسلط کی وضاحت کریں۔
3. انتونیو گرامشی کے 'فلسفہ عمل' پر بحث کریں۔

5.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Cammett, John M., *Antonio Gramsci and the Origin of Italian Communism*, Stanford University Press, Stanford, 1967.
2. Carl, Boggs, *Gramsci's Marxism*, Pluto Press, London, 1976.
3. Davidson, Alistair, *Antonio Gramsci: The Man, His Ideas*, Australian Left Review Publication, Sydney, 1968.
4. Femia, V. Joseph, *Gramsci's Political Thought: Hegemony, Consciousness and Revolutionary Process*, Clarendon Press, Oxford, 1981.
5. Forgacs, David ed., *The Antonio Gramsci Reader*: *Selected Writings, 1916–1935*, Aakar, New Delhi, 2021 (first pub. in 2014).
6. Namboodripad, E.M.S., and P. Govinda Pillai, *Gramsci's Thought*, (trans. M.G. Radhakrishnan), Left Word, New Delhi, 2021.
7. Santucci, Antonio A., *Antonio Gramsci*, Aakar, New Delhi, 2011.
8. Sreedharan, E., *A Textbook of Historiography, 500 BC to AD 2000*, Orient BlackSwan Private Limited, New Delhi, 2004.

اکائی 6۔ای ایچ کار کی نظر میں تاریخ

(E.H. Carr's What is History?)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 ای۔ایچ۔کار: حیات وخدمات

6.3 حصول تعلیم اور ملازمت

6.4 سفارتی تعلقات اور بین الاقوامی خدمات

6.5 تاریخی اور تحقیقی بصیرت

6.6 سیاسی افکار وخیالات

6.7 ایڈورڈ ہالیٹ کار کی تصنیف ''تاریخ کیا ہے؟

6.7.1 مورخین اور حقائق

6.7.2 فرد اور معاشرہ

6.7.3 تاریخ، سائنس اور اخلاقیات

6.7.4 تاریخ میں توجیہہ

6.7.5 تاریخ اور ارتقا

6.8 مورخین کی آرا

6.9 اکتسابی نتائج

6.10 کلیدی الفاظ

6.11 نمونہ امتحانی سوالات

6.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

برطانوی مورخ ایڈورڈ ہالیٹ کار جو عرفِ عام میں ای۔ ایچ۔ کار کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک زیرک سفارت کار، بہترین صحافی، بین الاقوامی تعلقات کے ماہر اور تاریخی بصیرت کے حامل دانشور تھے۔ تاریخ نویسی کے بارے میں ان کا نظریہ اپنے ہم عصر مورخین سے قدرے مختلف تھا۔ اسی وجہ سے انہیں اکثر اپنے معاندین کی تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ وہ حقیقت پسندی (حقیقت پسندانہ نظریات) کے زبردست حامی اور تجرباتیت کے ناقد تھے۔ انہوں نے اپنے پیشہ ورانہ کیریر کا آغاز ایک سفارت کار کے طور پر کیا۔ اپنی لگن، محنت، قابلیت اور دوراندیشی سے بین الاقوامی سفارتی تعلقات کے ماہر بنے۔ اپنی مدبرانہ فہم و فراست سے کافی شہرت حاصل کی۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران ہونے والے روسی انقلاب نے انہیں کافی متاثر کیا۔ چناچہ ای۔ ایچ۔ کار نے 1917 سے 1929 کے دوران روس کے حالات پر 14 جلدوں پر مشتمل سوویت یونین کی تاریخ لکھی۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات اور حساس مسائل کو "دی ٹوئنٹی ایرز کرائسز" کے نام سے قلم بند کیا۔ انہیں ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "تاریخ کیا ہے؟" سے دوانشور حلقوں میں بڑی شہرت حاصل ملی۔ اس کتاب میں انہوں نے روایتی تاریخ نویسی کے اصولوں کو مسترد کرتے ہوئے تاریخی نویسی کی بابت حقیقت پسندی کے نظریات کی کھل کر وکالت کی اور جدید تاریخ نویسی کے اصول و ضوابط پر بڑے اہم اور تیکھے سوالیہ نشان لگائے۔

تاریخ کیا ہے؟ ای ایچ کار کی ایک عمدہ شاہکار تصنیف ہے جس میں انہوں نے مورخانہ حقیقت پسندی اور صداقت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "مؤرخ اپنے حقائق کے بغیر بے بنیاد اور فضول ہے اور حقائق بھی مورخ کے بغیر مردہ اور بے جان ہیں۔" پھر تاریخ، ماضی اور حال کے درمیان ایک مسلسل اور نہ ختم ہونے والا مکالمہ ہے جس میں مؤرخ رہنما اور ترجمان کے طور پر کام کرتا ہے۔ کار نے اپنی اس کتاب میں فنِ تاریخ نویسی کے اہم مسائل پر گفتگو کی ہے۔ ان کے اصولوں پر کچھ مورخین نے شدید تنقید بھی کی ہے۔ تمام تنقیدوں کے باوجود اکثر مورخین اور دانشوروں کی نظر میں یہ کتاب ایک اہم تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس نے تاریخ نویسی کے باب میں انتہائی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی مورخ ای۔ ایچ۔ کار کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ای۔ ایچ۔ کار کی علمی اور سفارتی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ای۔ ایچ۔ کار کی لکھی کتاب "تاریخ کیا ہے؟" کو سمجھ سکیں گے۔
- تاریخ کیا ہے؟ کے موضوعات سے واقف ہو سکیں گے۔
- تاریخ کیا ہے؟ کی اہمیت کو بیان کر سکیں گے۔
- تاریخ نویسی کے بارے میں کار کے خیالات کی وضاحت کر سکیں گے۔

6.2 ای۔ایچ۔کارحیات وخدمات (E.H. Carr, His Life, and Services)

ابتدائی حالات

ایڈورڈ ہالیٹ کار(E.H. Carr) 28 جون 1892 کو برطانیہ کے مشہور شہر لندن کے ایک اعلیٰ متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجدادواوران کا خاندان عرصۂ دراز سے شمالی انگلینڈ میں آباد تھا۔ان کے اجداد کا پہلا تذکرہ جارج کار کے طور پر ملتا ہے جنھوں نے نیو کیسل شہر کے شیراف کے طور پر خدمات انجام دی تھیں۔کار کے والد کا نام فرانسس پار کار ایک قابلِ احترام فرداور والدہ جیسی ہالیٹ کار(Jessy Hallet Carr) ایک سلیقہ مند خاتون تھیں۔ان کے والدین نے ان کی پرورش اور تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔جن کا پر تو ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں نظر آتا ہے۔کار کے والدین ابتدا میں قدامت پسند تھے، لیکن 1903 میں آزاد تجارت کے معاملے پر لبرلس کی حمایت کرنے لگے۔جب جوزف چیمبرلین نے آزاد تجارت کے تئیں معاندانہ رویہ اختیار کیااور امپیریل ترجیحات کو فروغ دیا، توان کے والد نے اپنی سیاسی وفاداریاں بدل لیں اور آزاد خیالوں (لبرلس) کے ہم مشرب بن گئے۔کار کے والد ملکی، بان الاقوامی اور عالمی معاملات کی سمجھ رکھتے تھے اوراس میں خاطر خواہ دلچسپی رکھتے تھے اور انہیں اس کی اچھی سمجھ تھی۔ای۔ایچ۔کار کو عالمی معاملات کی سمجھ اور دانشورانہ بصیرت ان کے والد سے وراثت میں ملی تھی۔انہیں اس بات کا پختہ یقین تھااور وہ برابر یہی سوچتے رہے کہ دنیا کے حالات ایک نہ ایک دن ضرور بدلیں گے آہستہ آہستہ ایک بہتر جگہ بن رہی ہے، لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا جس کا ان پر بڑا گہرا اثر پڑا۔1925 میں،کار نے این وارڈ ہوے سے شادی کی، جس سے ان کا ایک بیٹا تھا۔3 نومبر 1982 کو لندن میں ان کا انتقال ہوا۔

6.3 حصول تعلیم اور ملازمت (Education and Employment)

ای۔ایچ۔کار نے اس دور کے بچوں کی طرح معیاری تعلیم حاصل کی۔ابتدائی تعلیم کے حصول کے لیے لندن کے مرچنٹ ٹیلر اسکول میں داخلہ لیا۔ثانوی تعلیم، درمیانے درجے کے سرکاری اسکول سے حاصل کی، 1911 میں کار نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لیا۔وہ بچپن ہی سے بڑے محنتی اور انتہائی ذہین تھے۔اعلیٰ کلاسیکی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کریوین دانشورانہ روایت حاصل کی۔اپنی یونیورسٹی میں کلاسیکی ڈگری کا امتحان مکمل کیا۔ابھی کار اپنے ڈگری مکمل کرکے نکلے ہی تھے کہ پوری دنیا علمی جنگ کی لپیٹ میں آگئی۔کار نے فوج میں بھرتی ہو کر فوری طور پر فعال اور رضاکارانہ خدمات انجام دینے کی پیشکش کی۔لیکن انہیں جسمانی طور پر محاذ جنگ پر فوجی خدمات انجام دینے کے لیے اہل نہیں سمجھا گیا۔چنانچہ انہوں نے فوجی ملازمت کا ارادہ ترک کر دیااور 1916 میں دفتر خارجہ میں بطورِ سفارت کار ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ 20 سالوں تک بطورِ سفارت کار اور بین الاقوامی معاملات کے ماہر کی حیثیت سے اپنے فرائض بڑی مہارت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔1936 میں انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیااور کیمبرج یونیورسٹی کے کالج آف ویلس میں سیاسیات کی درس وتدریس سے وابستہ ہوئے۔بعد ازآں وہ 1941 سے 1946 تک ٹائمس میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔1953 سے 1955 تک آکسفورڈ یونیورسٹی کے بالیول کالج میں سیاسیات کے معلم کے فرائض ادا کیے۔1955 میں کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینیٹی کالج

کے فیلو اور 1966 میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے بیلیول کالج میں آنریری فیلو مقرر کیے گئے۔

6.4 سفارتی تعلقات اور بین الاقوامی خدمات (Foreign Relations, and International Services)

ای۔ایچ۔کار کو برطانوی دفتر خارجہ میں وہ شعبہ تفویض کیا گیا جس کو جرمنی پر پابندیاں عائد کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔1917 میں انہیں شمالی محکمہ خارجہ کی سفارت کا کام تفویض کیا گیا۔ جس میں ان کی ذمہ داری دوسرے شعبوں کے کاموں کی دیکھ ریکھ کے علاوہ روس کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات کی نگرانی کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام سفارتی خدمات بڑی ہی خوش اسلوبی سے انجام دئے۔ایک برطانوی خارجہ سکریٹری لارڈ ہیلی فیکس نے کار کی سفارتی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس نے (کار) نہ صرف درست سیکھنے اور سیاسی سمجھ بوجھ سے، بلکہ انتظامی صلاحیت میں بھی اپنے آپ کو ممتاز کیا"۔1936 میں انہوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

کار پہلی عالمی جنگ کے بعد ہونے والی پیرس امن کانفرنس میں برطانوی وفد کے نمائندہ تھے اور لیگ آف نیشنز سے متعلق ورسائی کے معاہدے کے مسودہ سازوں میں شامل تھے۔ کانفرنس کے دوران، کار اتحادیوں کے ذلت آمیز رویہ سے بیزار تھے۔ خصوصاً جرمنوں کے ساتھ فرانسیسیوں نے جو ہتک آمیز رویہ اختیار کیا تھا اس سے بہت نالاں تھے۔ انہوں نے لکھا کہ ”امن کانفرنس میں جرمنی کے وفد کو "چودہ نکات پر دھوکہ دیا گیا اور انہیں انتہائی ذلت ورسوائی کا نشانہ بنایا گیا" کار لیگ آف نیشنز سے متعلق ورسائی معاہدے میں بھی شریک رہے۔انہوں نے جرمنی اور پولینڈ کے درمیان سرحدوں پر کام کرنے والے سفارتی اہل کاروں کی بھی نمائندگی کی تھی۔ پیرس امن کانفرنس کے بعد، کار 1921 تک پیرس میں برطانوی سفارت خانے میں تعینات رہے۔

ای۔ایچ۔ کار کو ابتدا میں لیگ آف نیشن پر بڑا اعتماد تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ آنے والے ادوار میں ایک اور عالمی جنگ کو روکنے میں معاون ہوگی اور پہلی عالمی جنگ کے بعد کے حالات کو بہتر بنائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا1920 کی دہائی میں، کار کو برطانوی دفتر خارجہ کی روسی شاخ میں ایک اہم ذمہ داری دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے ریگ لٹویا میں قیام پذیر رہتے ہوئے 1925 اور 1929 کے درمیان سیکنڈ سیکریٹری کے طور پر خدمات انجام دیں۔

6.5 تاریخی اور تحقیقی بصیرت (Historical and Research Insights)

ریگ میں اپنے قیام کے دوران روسی ادب و ثقافت میں کار کی دلچسپی بڑھی۔ انہوں نے روسی، سماج و معاشرے اور روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کئی کام کیے۔ کار نے ریگ میں قیام کے دوران روسی زبان سیکھی، تاکہ روسی مصنفین کی تحریروں کو بذاتِ خود پڑھ اور سمجھ سکیں۔ بعدازآں انہوں نے الیگزینڈر ہرزن، فیوڈور دوستووسکی اور 19 ویں صدی کے دیگر روسی مصنفین اور دانشوروں کی تصنیفات کو پڑھ کر اپنے لبرل اور آزادانہ خیالات و نظریات پر نظر ثانی کیا۔ روس، (سوویت یونین) اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں برطانوی ادبی جرائد میں اور، لندن ریویو بکس میں تفصیل سے لکھا۔ کار کو 1930 کی ابتدائی دہائی میں سوویت ماہر کے طور پر ایک نئی پہچان ملی جو 1982 میں ان کی

وفات تک قائم رہی۔1929-1936تک سفارت کارانہ پالیسی کے تقاضے کہ وجہ سے گمنام قلم کار کے طور پر لکھتے رہے۔اس دوران ان کے زیادہ تر جائزے یاتوگمنام یا"جان ہیلیٹ" کے تخلص سے شائع کیے گئے تھے۔1929 کے موسم گرما میں، کار نے فیوڈور دوستووسکی کی سوانح عمری پر کام شروع کیااور دوستووسکی کی زندگی پر تحقیق کے دوران، کار کی دوستی شہزادہ ڈی ایس میر سکی سے ہوئی، جواس وقت برطانیہ میں مقیم ایک روسی مہاجر دانشور تھے۔ بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کے علاوہ، 1930 کی دہائی میں کار کی تحریروں میں دوستووسکی (1931)،کارل مارکس(1934)اور میخائل باکونین(1937)کی سوانح حیات شامل ہیں۔

رفتہ رفتہ کار سویت یونین کے قریب آئےاس کی تعریف کرنا شروع کر دیا۔1932 میں لانسلوٹ لاٹن کی سوویت روس کی اقتصادی تاریخ کے جائزے میں، کار نے لاٹن کے اس دعوے کو مسترد کر دیا کہ سوویت معیشت ناکام تھی۔انہوں نے برطانوی مارکسی ماہر اقتصادیات موریس ڈوب کے سوویت معیشت کے بارے میں جو سازگار جائزہ پیش کیا تھااس کی ستائش کی تھی۔

6.6 سیاسی افکاروخیالات (Political Thoughts and Ideas)

ابتدائی ایام میں ای ایچ کاراپنے والدین کی طرح لبرل نظریات کے حامل تھے۔ان کا ابتدائی سیاسی نقطۂ نظر مارکس وادی خیالت کے برعکس لبرل اورآزاد پسندانہ تھا۔1934 میں مارکس کی سوانح عمری پر تبصرہ کرتے ہوئےانہوں نے کارل مارکس کے بارے میں کہا تھا کہ ''وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کے مالک اور ایک ہونہار مصنف ہیں لیکن ایک ایسا شخصیت جس کی تمام صلاحیتیں مکمل طور پر تباہی کے لیے وقف تھیں۔''کار نے دلیل دی کہ مارکس کے خیالات و نظریات کا واحد محرک بلاسوچی سمجھی طبقاتی نفرت تھی۔کار نے جدلیاتی مادیت پرستی اور قدر کے نظریاتی اوراستخراجی نظریہ کولیبر کا نام دیا۔اس نے فرد پر اجتماعی اہمیت پر زور دینے کے لیے مارکس کے افکار و نظریات کی تعریف بھی کی ہے۔روس میں قیام کے دوران ای ایچ کار کے سیاسی افکار وخیالات میں نمایاں تبدیلی آئی۔مارکسزم کے تئیں اس تبدیلی کے پیش نظر ای ایچ کار نے کارل مارکس کے بارے میں کی گئی اپنی تنقید کو انتہائی شرمناک قرار دیااور کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔کار کو بعد میں اسے اپنی بدترین کتاب قرار دیناپڑااور معذرت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس نے یہ کتاب صرف اس لیے لکھا ہے کہ ان کے پبلشر نے مارکس کی سوانح حیات کو بکونن کی سوانح شائع کرنے کے لیے پیشگی شرط قرار دیا تھاجو وہ لکھ رہے تھے۔اپنی کتابوں جیسے کہ رومانٹک جلاوطنی اور دوستووسکی میں، کار کواپنے مضامین کے ساتھ انتہائی ستم ظریفی پر مبنی رویہ کے لیے جانا جاتا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے عہد کے نامور لوگوں کی زندگی اوران کی سوانح عمریوں میں دلچسپی تھی لیکن زیادہ اہمیت نہیں تھی۔1930 کی دہائی کے وسط میں، کار خاص طور پر باکونین کی زندگی اور خیالات کے مطالعہ میں مصروف تھا۔بکونن نے ایک ناول میں ان تمام چیزوں کو بے نقاب کیا تھا جس سے ای۔ایچ۔کار نے برطانوی بورژوا معاشرے کے دکھاوے اور منافقت کے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔انہوں نے برطانوی بورژوا طبقہ پر شدید تنقید کی ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ ناول مکمل نہیں ہوا یا شائع نہیں ہوا سکا۔ورنہ شاید ہمارے سامنے یوروپ کے بورژوا معاشرے کی الگ تصویر ہوتی۔

6.7 ایڈورڈہالیٹ کار کی تصنیف 'تاریخ کیا ہے؟' (Edward Hallett Carr's What is History?)

'تاریخ کیا ہے؟' دراصل عہد جدید کے مشہور برطانوی مورخ، سیاسی مدبر اور مفکر ایڈورڈ ہالیٹ کار کی تاریخ اور فنِ تاریخ نویسی پر لکھی گئی اپنے عہد کی ایک شہرۂ آفاق تصنیف ہے جو آج بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تاریخ اور تاریخ نویسی کے موضوع پر ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ان کے لیکچروں کا ایک مجموعہ ہے جو انھوں نے 1961 میں جنوری سے مارچ کے دوران جی ایم ٹریولین لیکچرز سیریز کے طور پر کیمبرج یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ کار کے لیکچروں کی یہ سیریز تاریخی حقائق اور مورخ کی جانبدارانہ رویہ اور اس کی ذمہ داریوں پر کیے گئے مباحث پر کافی اہمیت رکھتی ہے اور اس موضوع پر کئی اہم سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ ساتھ ہی تاریخ کے ماہرین کو ان کی دانشورانہ ذمہ داری کا احساس دلاتی ہے۔ یہ کتاب تاریخ نویسی کے فن پر ایک عمدہ تصنیف شمار کی جاتی ہے۔ ای۔ ایچ۔ کار کو اس کتاب سے جہاں بہت شہرت ملی وہیں انہیں اپنے عہد کے مورخین اور دانشوروں کی تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ اُس کے باوجود کار کی یہ تصنیف مورخین اور دانشور حلقوں میں آج بھی انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور تاریخ نویسی کے میدان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ای ایچ کا کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شروع میں امپیریل نظریات کے حامی تھے۔ بعد ازآں روس میں قیام کے دوران ان کے خیالات میں تبدیلی آئی اور ان کا جھکاؤ مارکس واد کی طرف ہونے لگا تھا۔

ای ایچ کار نے اپنی اس کتاب میں تاریخ اور تاریخ نویسی سے متعلق کئی اہم معاملات پر بحث کی ہے وہ اپنی کتاب ،تاریخ کیا ہے؟ میں مورخ کے فرض منصبی کی وضاحت مختلف انداز میں مثالوں کے ذریعہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مورخ کا سب سے اہم کردار ماضی کے حقائق اور واقعات کو معنی خیز انداز میں تاریخی صداقت اور راست گوئی کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ ان کی کتاب کا اصل موضوع یہی ہے۔ یہ کتاب کل چھ ابواب اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے جس میں مندرجہ ذیل ابواب کے تئیں تاریخ سے متعلق اہم مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

- مورخین اور حقائق
- سماج اور فرد
- تاریخ، سائنس اور اخلاقیات
- تاریخ میں توجیہ
- تاریخ بطور ارتقا
- وسیع منظر نامہ

تاریخ میں طویل عرصہ سے یہ بحث کافی زوروں سے چلی آ رہی تھی کی تخیلات (آئیڈیا) زیادہ اہم ہیں یا مواد۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آئیڈیا (خیالات) زیادہ اہمیت کے حامل ہیں انہیں آئیڈیلسٹ کہا جاتا ہے اور جو دانشور یہ مانتے ہیں کہ مواد زیادہ اہمیت رکھتے ہیں انہیں مادیت پرست کہا جاتا ہے۔

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY Estd. 1998

6.7.1 مورخین اور تاریخی حقائق (Historians and Historical Facts)

بعینہ اسی طرح تاریخ میں بھی دو چیزیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں (1) حقائق اور دوسرا (2) ان کی وضاحت کرنے والا مورخ۔ اب یہ مورخ کا کام ہے کہ وہ حقائق کو کس طرح سے پیش کرتا ہے۔ ای ایچ کار کا ماننا ہے کہ تاریخ نویسی میں حقائق اور مورخ دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے اس کو مچھوارے کے جال میں پھنسی مچھلیوں کی مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ تاریخ تحقیق شدہ حقائق کے مجموعے سے مرکب ہوتی ہے۔ مورخین کو حقایق دستاویزات میں، نقوش میں اور اس کی نوعیت کی دیگر چیزوں میں پھنسے ہوئے ملتے ہیں جس طرح مچھلیاں مچھیرے کے جال میں۔ مچھیرا ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اس سے اپنی پسند کی کوئی ڈش بناتا ہے۔ سی طرح مورخ پہلے حقائق کو جمع کرتا ہے۔ گھر لاتا ہے۔ انہیں اپنے اسلوب میں تیار کرتا ہے اور اپنے انداز میں پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی بھی جنگ کے واقعہ کا مطالعہ کر لیں۔ جنگ کا متعینہ وقت میں ہونا ایک واضح حقیقت ہے۔ کہ جنگ ہوئی ہے۔ لیکن جنگ کیوں ہوئی؟ کیسے شروع ہوئی؟ کون جیتا؟ کیسے جیتا اس کی وضاحت کا کام مورخ کا ہے۔ لہٰذا دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ کار اس بات پر شدت سے زور دیتے ہیں کہ حقایق اور مورخ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم ہیں۔ وہ کہتے ہیں "مؤرخ اپنے حقائق کے بغیر بے بنیاد اور فضول ہے اور حقائق بھی مورخ کے بغیر مردہ اور بے جان ہیں۔" پھر تاریخ، ماضی اور حال کے درمیان ایک مسلسل اور نہ ختم ہونے والا مکالمہ ہے جس میں مؤرخ رہنما اور ترجمان کے طور پر کام کرتا ہے۔

اسی طرح ماضی اور حال کے واقعات اور مورخ کے تعصبات پر بھی کافی بحث ہوئی۔ کالنگ وڈ کہتے ہیں کہ ماضی اپنے آپ میں کوئی شے نہیں ہے ای ایچ کار نے ان میں سے کچھ نظریات کی تخلیص کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مؤرخین اپنے عہد کی ہی پیداوار ہوتے ہیں اور ان کی ذہنی دنیا بھی ان کی معاصر دنیا کی سیاست اور خیالات سے تشکیل پاتی ہے۔ وہ معاصر افکار سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ ماضی کو حال کے آئینہ میں ہی دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ماضی کی نمائندگی کرتے ہوئے معروضیت پسند واقع ہونا ان کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ ان کی تحقیقات اور پیش کش ہمیشہ ان کے حال کے افکار میں رنگی ہوتی ہے۔ حتی کے جو ثبوت وہ اکٹھا کرتے ہیں وہ بھی ماضی کی مکمل تصویر کو پیش نہیں کرتے کیونکہ ان کا انتخاب ان کے زمانے کے مروجہ خیالات اور نظریاتی رجحان کے مطابق ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ وہ ریکارڈ جو ماضی کے لوگ ہمارے لیے ورثہ کے طور پر چھوڑ گئے ہیں وہ بھی منتخب ہوتے ہیں، کار کے الفاظ میں ہماری تصویر ہمارے لیے پہلے ہی منتخب اور متعین کر دی گئی ہے۔ یہ بیشتر اتفاقی طور پر نہیں ہوا ہے بلکہ یہ کام ان لوگوں نے کیا ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر مخصوص نظریہ سے متاثر تھے اور انہوں نے یہ سوچا کہ جن حقائق سے اس نظریہ کی حمایت ہوتی ہے وہ محفوظ کیے جانے کے لائق ہیں۔ ان ثبوتوں پر اعتماد کرنا اور حقائق کے بارے میں مطمئن ہو جانا بڑا دشوار ہے، کیونکہ تاریخ کے حقائق ہم تک خالص نہیں پہونچتے ہیں کیونکہ وہ خالص شکل میں موجود ہی نہیں ہوتے بلکہ ہو بھی نہیں سکتے۔ یہ حقائق ہمیشہ ناقل کے ذہن سے چھن چھن کر آتے ہیں۔ اسی روشنی میں ای ایچ کار یہ نتائج نکالتا ہے: دستاویزات ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے جتنا ان دستاویزات کا مصنف ہمیں بتانا چاہے کہ کیا ہوا تھا۔ اس کی فکر کے مطابق کیا چیز رونما ہونے کے لائق ہے یا رونما ہوگی۔ یا پھر اتنا ہی وہ چاہتا ہے کہ دوسرے بس یہی سوچیں یا پھر بس اتنا ہی کچھ جتنا وہ

خود سوچتا ہے۔''لہٰذا طرزِ انتخاب کے عمل کی دو سطحیں ہیں۔ ایک تو اس عہد کا ناقل جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کون سا مواد نقل کرنے کے لائق ہے اور دوسرا معاصر مورخ جو اس انتخاب کو یہ فیصلہ کر کے مزید پختہ کر دیتا ہے کہ کون سا مواد پیش کرنے کے لائق ہے۔ اس خیال کے مطابق ماضی کی ہمارے لیے دوسری تشکیل ہے۔

کار نے مورخ کے کام کے تجرباتی نظریے کو "حقائق" کا ایک مجموعہ ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیا جو اس کے پاس موجود ہیں۔ کار نے حقائق کو دو قسموں میں تقسیم کیا: "ماضی کے حقائق"، یعنی وہ تاریخی معلومات جنہیں مورخین غیر اہم سمجھتے ہیں اور "تاریخی حقائق"، وہ معلومات جن کا مورخین نے فیصلہ کیا ہے، اہم ہے۔ کار نے دعویٰ کیا کہ مورخین اپنے اپنے تعصبات اور ایجنڈوں کے مطابق "ماضی کے حقائق" میں سے کس کو "تاریخی حقائق" میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

6.7.2 فرد اور معاشرہ (Individual and Society)

اس مختصر کتاب میں فرد اور معاشرہ سے وابستہ مسائل کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس عمل میں، کار نے بعض مکاتب فکر کے تاریخی نظریات کو بڑے موثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ فرد اور معاشرے کے درمیان شدید تضادات کی وضاحت کی ہے۔ تاریخ میں "عظیم آدمی" کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہوئے سماجی قوتوں کے حوالے سے اچھی طرح واضح کیا گیا ہے جو "عظیم آدمیوں" پر عمل کرتی ہیں۔ عظیم انسان بدلے میں ان قوتوں کے نمائندے بنتے ہیں جنہیں انہوں نے تشکیل دیا ہے اور جو تاریخی واقعات کے نئے موڑ کو سمت دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں کوئی فرد سماج کی تنہا مخلوق نہیں ہے بلکہ سماج کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ مورخ کو حقائق کا مطالعہ کرتے وقت اس سماج اور سماجی عمل کو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے جس میں وہ حقائق اور واقعات یا حادثات رونما ہو رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے سماج کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں اور سماج کو ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا مورخ کے لیے حقائق کے ساتھ فرد اور سماج پر گہری نظر ہونی چاہئے۔ تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس عہد اور اس سے وابستہ ماحول کو بھی سمجھنا بہت ضروری ہے۔

6.7.3 تاریخ، سائنس اور اخلاقیات (History, Science, and Ethics)

ای ایچ کار دیگر سائنسی علوم کے استعمال اور ان سے مدد لینے کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں تاریخ نویسی میں حقائق کو استعمال کرتے وقت دیگر معاون سائنسی علوم سے بھی استفادہ کرنا چاہئے۔ جیسے آثارِ قدیمہ کے ماخذ، علمِ مسکوکات، کتبہ شناسی اور کاربن ڈیٹنگ وغیرہ مورخین کو اس تاریخی عمل میں کافی مدد کر سکتے ہیں اور یہ تاریخی موضوعات اور عمل کو سمجھنے میں ہمارے معاون ہوتے ہیں۔ ان علوم کو وہ تاریخ کے معاون سائنسی علوم کا نام دیتے ہیں۔ وہ مورخ کی اخلاقی ذمہ داری بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مور کو چاہئے کہ وہ حقائق کو نہ تو چھپائے اور نہ ہی اسے توڑ مروڑ کر پیش کرے۔ بلکہ مورخانہ صداقت کے ساتھ اسے جیسے ہے ویسے ہی بیان کرنا چاہئے۔ یہ ایک راست گو اور اچھے مورخ کی پہچان ہے۔ ساتھ ہی حقائق کو استعمال کرتے وقت مورخ کو اس عہد کے اخلاقی اقدار کو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ

وقت حالات اور علاقہ کے ساتھ اخلاقی اقدار بدلتے رہتے ہیں۔ مورخ کے لیے تاریخ لکھتے وقت یا حقائق کا استعمال کرتے وقت ان اخلاقی اقدار کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

6.7.4 تاریخ میں توجیہہ (Causation in History)

ای ایچ کار نے تاریخ میں توجیہہ پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعہ اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ کوئی بھی مورخ کسی بیا ایک اہم واقعہ یا حاثہ کے کئی وجوہات بیان کر سکتا ہے۔ اس کے بیان کردہ مختلف وجوہات موزوں اور درست بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک اچھے مورخ کا کام ہے کہ وہ اس خاص واقعہ سے متعلق اہم ترین وجہ کو پیش کرے۔

6.7.5 تاریخ اور ارتقا (History and Progress)

اس باب میں ای ایچ کار تاریخ کو ایک ارتقائی عمل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تاریخ ایک ارتقا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ مورخ حالیہ واقعات کو اسی وقت بہتر طور پر موضوعیت کے ساتھ سمجھ پائے گا جب وہ ماضی کے واقعات کو سمجھے گا اور یہ ادراک کرے گا کہ ان کا انجام مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ تاریک ماضی میں ہو چکے واقعات اور مستقبل میں ابھرنے اور وجود پانے والے واقعات کے درمیان ایک مسلسل عمل ہے۔ اسی لیے ان کا ماننا ہے ‘Historiography is a progressive science’ (تاریخ نویسی ایک ارتقائی سائنس ہے) ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ تاریخ لکھنا ہر کسی کا کام نہیں ہونا چاہئے بلکہ صرف ان لوگوں کو لکھنا چاہئے جنہیں تاریخ کی روح کی سمجھ ہو۔ مورخ کو یہ سمجھ ہونے چاہئے کہ حقائق کہاں لے جا رہے ہیں اور کہاں جانے چاہئے۔ انہیں پر بحث ہونی چاہئے اور یہی تاریخ ہے۔ آخر وہ یہ کہتے ہیں ‘Our view of history reflects our view of society’ کہ تاریخ کے بارے میں ہمارا جو بھی نظریہ ہوگا وہ ہمارے سماج کا عکاس ہوگا۔

6.8 مورخین کی آرا (Historians' Opinions)

اس کتاب کو علمی حلقوں میں شہرت و مقبولیت ملی تو اسے تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ کئی دانشوروں نے اس کی سراہنا کرنے کے باوجود اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی پیش کی ہیں۔ جیفری ایلٹن نے اپنی کتاب دی پریکٹس آف ہسٹری میں کہا کہ کار نے ”تاریخی حقائق“ اور ”ماضی کے حقائق“ کی جو بات کی ہے وہ بے بنیاد ہے۔ لیکن وہ کئی باتوں پر کار کی تعریف کرتے ہیں۔ روجر کا ماننا ہے کہ کار کا یہ کہنا کہ تاریخ میں ”اگر“ اور ”مگر“ نہیں ہوتے ہیں کہنا درست سو فیصد درست نہیں ہے۔ تاریخ میں حالات کی تبدیلی سے نتائج بدل بھی سکتے ہیں۔ اینڈریاس ہیلگر بر کا ماننا ہے کہ ای ایچ کار کے خیالات و نظریات میں کئی طرح کے تضادات پائے جاتے ہیں کہیں وہ قدامت پسند نظر آتے ہیں کہیں آزاد خیال اور کہیں کہیں ان پر دقیانوسیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔

6.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ای ایچ کار بیسویں صدی کے ایک مشہور برطانوی مورخ ہیں۔ جنہوں نے اپنے پیشہ ورانہ کیریر کا آغاز ایک سفارت کار کے طور پر کیا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ برطانوی وفد کے رکن کے طور پر پیرس امن کانفرنس میں شریک ہوئے۔ جلد ہی انہیں بین الاقوامی تعلقات کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ روس میں قیام کے دوران انہوں نے سوویت یونین (روس) کی تاریخ کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ روس کے حالات پر انہوں نے چودہ جلدوں پر مشتمل ایک مبسوط تاریخ لکھی۔ جو روس کی تاریخ پر ایک اہم کلاسیکی کتاب تصور کی جاتی ہے۔ دو عالمی جنگوں (1919 سے 1939) کے دوران وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات اور حساس مسائل کو انہوں نے ''بیس سالہ بحران'' (دی ٹوئنٹی ایرز کرائسز) کے نام سے قلم بند کیا۔ انہیں ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ کیا ہے؟'' سے دانشور حلقوں میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب تاریخ نویسی کے موضوع پر دیئے گئے ان کے لیکچروں کا ایک شاہکار مجموعہ ہے جو تاریخ اور تاریخ نویسی کے فن میں کافی شہرت رکھتی ہے۔ 1916 سے 1936 تک بین الاقوامی معاملات کے ایک ماہر مدبر کی حیثیت سے کئی اہم اور گراں قدر سفارتی خدمات انجام دیں۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات کی اتھل پتھل کا انہوں نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہیں توقع تھی کہ جنگ کے بعد حالات بہتر ہوں گے۔ لیکن تمام امن کانفرنسیں اس میں ناکام رہیں۔ چنانچہ انہوں نے دفترِ خارجہ کی سفارتی ملازمت دفتر خارجہ سے استعفیٰ دے دیا۔ 1936 میں انہوں نے تعلیمی میدان میں طبع آزمائی کی بھرپور کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب رہے اور کئی اہم اور شہرۂ آفاق کتابوں کے مصنف بنے۔ 1941 سے 1946 تک، کار نے ٹائمس میگزین میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کیا، جہاں وہ اپنے اداریوں کے لیے مشہور تھے۔ ان میں وہ ایک سوشلسٹ نظام اور جنگ کے بعد کے حالات پر تجزیہ کرتے۔ کار بنیادی طور پر اینگلو سوویت اتحاد کے حامی تھے۔

6.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

- یوٹوپین : وہ خیال یا نظریہ جس میں خیالی، مفروضی بات کی جائے۔
- حقیقت پسندی : وہ نظریہ جس میں مفروضوں کے بجائے ممکنہ حقائق پر زور ہو۔
- پیرس امن کانفرنس : پہلی علمی جنگ کے بعد قیامِ امن کی خاطر فرانس میں ہونے والی کانفرنس
- لیگ آف نیشن : وہ بین الاقوامی عالمی ادارہ جو پہلی عالمی جنگ کے بعد قیامِ امن کے لیے 1920 میں بنایا گیا
- ورسائی معاہدہ : جون 1919 میں ورسائی کے مقام پر امن کی خاطر کیا جانے والا معاہدہ
- امپیریلزم : سامراجیت وادی خیالات و نظریات
- مٹیریلزم : مادیت پرستانہ افکار و خیالات
- آئیڈیلزم : فلسفۂ تصوریت کا علمبردار نظریہ

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

6.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

6.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ای۔ایچ۔کار کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. فنِ تاریخ نویسی پر کار نے کون سی کتاب لکھا ہے؟
3. سوویت روس کی تاریخ پر کا نے کون سی کتاب تحریر کیا تھا؟
4. کار نے ابتدائی تعلیم کس اسکول سے حاصل کی تھی؟
5. ''دی ٹوئنٹی ایرز کرائسز'' نامی کتاب کا مصنف کون ہے؟
6. کار نے حقائق کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟
7. کار کو فوجی خدمت کے قابل کیوں نہیں سمجھا گیا تھا؟
8. ابتدا میں کار کن نظریات کی حمایت کرتے تھے؟
9. ای ایچ کار کس میگزین کے ایڈیٹر تھے؟
10. کار کا انتقال کب ہوا۔؟

6.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ای ایچ کار کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالیں۔
2. ٹونٹی ایر کرائسز پر ایک مضمون لکھیے۔
3. ای ایچ کا کا معروضی نظریہ بیان کریں۔
4. حقائق اور مورخ کے بارے میں کار کے خیالات وضاحت کریں۔
5. تاریخ کیا ہے؟ کے اہم موضوعات پر روشنی ڈالیں۔

6.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ای ایچ کار کی سفارتی زندگی پر ایک مضمون لکھیے۔
2. تاریخ کیا ہے؟ میں حقائق اور مورخ کے کردار کی وضاحت کریں۔
3. کار کی تعلیمی تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

6.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Carr, E.H., What is History? New York, 1964.
2. Carr, E.H., *The Twenty Years' Crisis,1919-1939: An Introduction to the Study of International Relations*, New York, 1939.
3. Haslam, Jonathan, “E.H. Carr and the History of Soviet Russia,” In *Historical Journal*, 26, 1983.
4. Carr, E.H., *From Napoleon to Stalin*, London, 1980.

اکائی 7۔ فرانسیسی اینالس مورخین

(French Annalists)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 سماجی اور دانشورانہ پس منظر

7.3 انالس مکتب فکر کی ابتدا

7.4 نئے تاریخی زاویے

7.5 انالس اسکول کی اہمیت

7.6 اکتسابی نتائج

7.7 کلیدی الفاظ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

فرانسیسی روشن خیالی کے دوران والٹیئر (Voltaire) اور مونٹیسکیو (Montesquieu) نے ماضی کے زیادہ فلسفیانہ بیان کی حمایت میں اس نظریے کو چیلنج کیا تھا کہ تاریخ انفرادی سیاسی کرداروں کے کارناموں کی داستان ہے۔اٹھارہویں صدی کی اس 'نئی تاریخ' نے اپنی توجہ تمام لوگوں کے آداب، رسم ورواج اور عقائد اور ان کی سماجی اور ثقافتی ترقی کے وسیع طرزوں پر مرکوز رکھی۔ بیسویں صدی کے وسط میں فرانس میں ایک بار پھر سیاسی تاریخ کو تاریخی توجہ کے مرکز سے ہٹانے کی ایک اور بنیادی کوشش کی گئی۔ وہ دو آدمی جنہوں نے معاشرے میں انسان کی زندگی کی ایک بھرپور اور مکمل تاریخ کی طرف پہلا ٹھوس قدم اٹھایا وہ لوسیئن فیبرے اور مارک بلاک تھے۔اس سے پہلے ہی، ہینری بیر (Henri Berr) نے 1900 میں *Review of Historical Synthesis* نامی جریدہ شروع کیا تھا اور معاشرے میں انسان کی تمام سرگرمیوں کو ایک عظیم مجموعے میں اکٹھا کرنے کے مقصد کے ساتھ سو جلدوں پر مشتمل *Evolution of Humanity* لکھنے کا منصوبہ بنایا۔اس عظیم منصوبے میں سماجیات اور دیگر علوم کے طریقوں اور بصیرت کو بروئے کار لانا تھا۔

تاریخ نویسی کے انالس مکتب فکر (Annales School) کو عام طور پر بیسویں صدی کی تاریخ نویسی میں ایک نہایت اہم پیشرفت تصور کیا جاتا ہے۔ باضابطہ طور پر اس کی ابتداء 1929 میں مارک بلوک (Marc Bloch) اور لوسین فیبرے (Lucien Febvre) کے ذریعے *Annales d'historie Economique et Sociale* نامی جریدے کے آغاز سے ہوئی، اور اسی سے اسے اپنا نام یعنی 'اینالس' ملا ۔ موضوعات کی وسعت اور اصولوں اور طریقہ کار میں جدت پسندی کے معاملے میں یہ اسکول سارے فرانس میں ممتاز رہا۔ کئی دہائیوں تک اس نے دوسرے ممالک میں بھی تاریخ نویسی کو متاثر کیا اور پوری دنیا میں اس کے پیروکار موجود تھے۔اس اکائی میں آپ اس کے ابھرنے کے پس منظر، تاریخ نویسی میں اس کی خدمات اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف نئے تاریخ نویسی کے رجحانات کا مطالعہ کریں گے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اینالس مکتب فکر کے تعارف اور اس کی ابتدا سے واقف ہو سکیں گے۔
- اینالس مکتب فکر کی وسعت اور اس کے ذریعے تاریخ نویسی میں لائی گئی تبدیلیوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- تاریخ کے ناقدین کو اینالس مورخین کے ذریعے دیے گئے جوابات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- علم تاریخ کو متعدد دوسرے سماجی علوم سے منسلک کرنے اور نئے علوم جیسے معاشی تاریخ کے پیدا ہونے سے واقف ہو سکیں گے۔
- اینالس مورخین کی کئی پیڑھیوں اور ان کی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔

7.2 سماجی اور دانشورانہ پس منظر (Social and Intellectual Background)

1920 کی دہائی میں فرانس میں دو باہم متضاد (Paradoxical) معاملات سامنے آئے۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور فرانسیسی وزیر اعظم کلیمنشو (Clemenceau) کی صدارت میں پیرس کے نزدیک وارسائے (Versailles) میں اس کا اصولی طور پر اختتام ہو چکا تھا۔ بظاہر یہ فرانس کی باقی یوروپ کی مجموعی فتح سے بھی زیادہ اپنے روایتی حلیف جرمنی پر فتح تھی۔ عظیم فرانسیسی تاثراتی مصور کلاؤڈ منٹ (Claude Mante) کے کاموں (Les Nym Pheas) میں سب سے مشہور اور اہم کام *The Water Lilies* ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ 'فتح کے بعد فرانس کو پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا جا رہا ہے۔' خاص میوزیم جیسی ایک عمارت *L Orangerie* پیرس کے بیچ و بیچ اس کی نمائش کے لیے بنائی گئی۔ اس طرح پورے فرانس میں جشن کا ماحول تھا۔

لیکن دہائی کے آخر میں فضا پر مایوسی کے بادل چھانے لگے۔ عظیم معاشی بحران (The Great Depression) کے آسیب اس دہائی پر اپنا سایہ ڈالنے لگے اور بحران جلد ہی پوری دنیا کے سماج اور معیشت پر حاوی ہو گیا۔ جو ملک اس کی لپیٹ میں ایک بار آ گیا اسے بہت کچھ کھونا پڑا۔ فرانس بھی ان ملکوں میں شامل تھا۔ اس طرح وہاں چاروں طرف واضح بے چینی تھی۔ ایک معمہ جس نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک قوم جس نے جلد ہی ایک پرانے اور طاقتور دشمن کو زیر کیا ہو، نازک حالات کے سامنے بے چارگی سے دیکھ رہی ہو۔ یہ بالکل ہی نئی صورت حال تھی جس نے ایک بڑا سوال کھڑا کر دیا تھا اور ایک نئے جامع جواب کے انتظار میں تھی۔ پرانے جوابات اپنی نوعیت کے حساب سے نامکمل ہو گئے تھے۔ نئے جوابات، نئے رجحانات اور نئے اصولوں کے متقاضی تھے۔ اگر تاریخ کو اس کھوج بین میں کچھ مدد کرنی ہے تو سب سے پہلے خود سوال کر کے اس کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ مضمون کی از خود تجدید کا سماجی پس منظر تھا جس کا نتیجہ *Annales d'histoire Economique et Sociale* جریدے کے قیام کی شکل میں نکلا۔

اس کے علاوہ ایک دانشمندانہ پس منظر بھی ہے۔ 19 ویں صدی میں بہت سے نئے مضامین (Disciplines) کی ابتدا ہوئی۔ خصوصاً سماجی اور تہذیبی علم بشریات (Social and Cultural Anthropology)، انسانی جغرافیہ اور نفسیات (Human Geography and Psychology) وغیرہ۔ اس کے ماننے والے پر جوش اور چاق و چوبند تھے۔ انہوں نے قدیم تاریخ کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ خاص طور سے درخائمی (Durkheimian) سماجیات جو وسیع اور پر عزم تھی جو کلی توضیح (Totalizing Explanation) کی اہلیت یا دوسرے لفظوں میں سماجیاتی تغیر پذیری (Societal Dynamics) کے پورے طیف (Spectrum) کی وضاحت کا دعوی کرتی تھی۔ انسانی جغرافیہ (Human Geography) بھی اس طرح کے دعووں سے پیچھے نہیں تھا۔ اس کی توجہ تنظیم کی سماجی، تہذیبی اور اداراتی شکلوں پر تھی۔

تاریخ کا واقعات سے استثنائی رابطہ کے باعث کافی مذاق اڑایا گیا۔ یہ واقعات بے مثل، قلیل مدتی، وقتی اور عارضی تھے۔ اس وقت تاریخ کا مطالعہ اسی طرح کا ہوتا تھا۔ حکمراں خاندان کی تبدیلی، جنگ و جدل، انتظامی امور پر خاص توجہ دی جاتی تھی جیسا کہ جان سیلے (John

(Seeley) نے موثر طریقے سے بیان کیا ہے کہ 'تاریخ ماضی کی سیاست ہے اور سیاست حال کی تاریخ' ہے۔ طویل مدتی تغیر پذیری مورخین میں دلچسپی پیدا نہیں کر سکی۔ اس وقت تاریخ کے مطالعے کا کیا ہی مطلب ہو سکتا ہے جب صرف یہی بیان کیا جا رہا ہو کہ کس طرح ایک حکمراں کی جگہ دوسرا آیا اور کس طرح حکمراں کے علاقے میں جنگ کی وجہ سے زمین میں اضافہ ہوا یا کمی ہوئی۔ 'واقعہ' سمندر میں موج کی مانند ہے، جو عارضی ہے اسی لیے غیر اہم ہے۔ اوپری سطح سے سمندر کے اندر میں ہونے حرکت کو ننگی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ علم بشریات کے ماہرین اور جغرافیہ دانوں کا یہ ماننا ہے کہ مورخین نے اسے نظر انداز کیا۔

دوسرا سوال تاریخی ماخذ کے استعمال سے متعلق تھا۔ دستاویزات (Archives) مورخین کے نزدیک تقدس کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ یہ تقریباً ایک اخلاقی ضابطہ بن گیا تھا کہ مورخین کے تمام بیانات کی مزید تصدیق دوسرے تجرباتی شواہد جو گرد آلود محافظ خانوں میں ہیں، سے ہونی چاہیے۔ اس سے کم تر کوئی بھی چیز حقیقت نہیں ہو سکتی۔ حقیقت مورخین کے لیے بہت پاک شئے تھی۔ یہاں تک کہ 1970 کی دہائی کے مورخ جیک لیونارڈ (Jacques Leonord) نے تاریخ کے مسئلے میں فلسفی مائیکل فوکو (Michel Foucault) کی مداخلت پر دھمکی آمیز لہجے میں یہ جاننے کے لیے سوال کیا کہ کیا کبھی اس نے قدیم دستاویزوں کی دھول سے اپنے ہاتھوں کو گندہ کیا ہے (*The Historians and the Philosophers*) اور فوکو نے دستاویزی دھول کے تقدس کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیا تھا (*The Dust and the Cloud*)۔ دستاویزی شواہد کی سطح پر جو بھی تھا مورخین نے اسے ہی سچ سمجھا۔ دستاویز بذات خود تہذیبی عمل کے دوران وجود میں آیا تھا اور یہ ایک موضوعی تشکیل (Subjective Construct) تھا جس کی مورخین نے کبھی پروا نہیں کی۔ معروضی یا اصل حقیقت، انسانی رویے، عادات، نظام اقدار اور حالات زندگی کے تئیں ان کے رد عمل کی طویل ترتیب میں چھپی ہوئی ہے۔ ان ساری چیزوں کی تشکیل، خاندان، گروہ اور پڑوس میں تحت الشعوری سطح پر ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی تحریری دستاویزوں کا نتیجہ نہیں تھا۔ نہ یہ ان میں ریکارڈ ہو سکا اور نہ ہی یہ ان سے واضح ہو سکا۔ فوری اور واضح 'واقعہ' سے متعلق تاریخ کے مضمون کی دلچسپی نے اس نکتہ رسی کو محو کر دیا تھا۔ سماجی علوم (Social Science) کا ایک طرح کا ایسا نظریہ (Vision) ابھر رہا تھا جو تاریخ کے دائرے سے اب تک باہر تھا۔

7.3 انالس مکتب فکر کی ابتدا (Beginning of the Annales School)

تاریخ پر سخت تنقید نے فرانسیسی علمی دنیا کے دور دراز کونے میں اسٹراسبرگ (Strasbourg) کے دو نوجوان مورخ دوستوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ مارک بلاک اور لوشین فیبرے نے جس طرح کی تاریخ پڑھی تھی اور اسے پڑھانے پر مجبور کیے جا رہے تھے، اس سے بہت ناخوش تھے جس طرح کی بصیرت نیا مضمون فراہم کر سکتا تھا وہ اس کے لیے بہت حساس تھے۔ وہ غیر مطمئن اس لیے تھے کہ اتنا قریبی رشتہ رکھنے والے مضامین ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف ہیں اور ہر ایک نے اپنے گرد مضبوط حصار بنا رکھا ہے۔ جنوری 1929 میں انہوں نے *Annales d'histoire Economique et Sociale* نام سے ایک نیا جریدہ شروع کیا۔ ابتداء میں جریدہ کی

توجہ آنے والے بحران کی پیدائش (genesis) کو سمجھنے کی غرض سے حالیہ مسائل کی تفتیش پر تھی۔ وقت گذرنے کے بعد اس کی زیادہ توجہ وسطی اور ابتدائی جدید تاریخ پر ہوئی۔ بلاک اور فیبرے نے اس طرح اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔

جریدے کے ابتدائی شمارے میں مدیروں نے اپنے نہایت ہی مختصر اداریے میں جذباتی طور پر اس کی ضرورت وافادیت پر زور دیا جسے بعد میں بین العلومی تحقیق (Interdisciplinary Research) کا نام دیا گیا۔ انہوں نے زور دیا کہ اگرچہ اپنے مضمون پر سختی سے بنے رہنا چاہیے یقیناً اس سے بہتر کچھ نہیں ہوگا لیکن بین العلومی تحقیق کے بھی بڑے فائدے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص میدان میں محنت و مشقت سے لگا رہے اور ساتھ ہی اپنے پڑوسی کے کام کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ لیکن اکثر فصیلیں کافی اونچی ہیں اور وہ ہماری نظر میں حائل ہیں، پھر بھی مختلف گروہوں کے مابین اکثر و بیشتر دانشورانہ باہمی تعامل سے اصولوں اور حقائق کی ترجمانی میں بہت سے قیمتی نظریات، تہذیبی بصیرت اور درست نظریات کے فروغ کا آغاز ہوگا۔ معاشی تاریخ کا مستقبل اسی پر منحصر ہے اور حقائق کا صحیح علم ہی 'مکمل تاریخ' (Total History) مرتب کرے گا۔ جزوی تاریخ (Partial History) کی جگہ اناس والے مکمل تاریخ مرتب کرنے کے خواہش مند تھے اور یہی ان کے نزدیک 'سچی تاریخ' (True History) بھی تھی۔ سچی تاریخ، جھوٹی تاریخ کے بالمقابل نہیں ہے بلکہ جزوی تاریخ کے بالمقابل ہے۔ مکمل تاریخ اور سچی تاریخ کے مضمون کے اعتبار سے کافی وسیع الظرف ہونے کے باعث اس کے دائرے سے ماضی کا کوئی حصہ اور پہلو باہر نہیں رہتا۔ دوسرے مضامین کی چنوتیوں کا سامنا کرنے اور ان کی بصیرت کو شامل کرنے کے لیے اس میں وسعت پیدا کی گئی ہے۔

نتیجتاً مورخین کی تحقیق و جستجو کے لیے مزید نئے موضوعات سامنے آئے۔ مارک بلاک نے خود 1936 میں اپنی دو جلدوں پر مشتمل کتاب *The Feudal Society* کی ایک جلد میں جاگیرداری (Feudalism) کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کر کے ایک جامع اور عظیم ڈھانچہ قائم کیا۔ اس نے سماج کی باقیات، چاہے وہ لاوارث زرعی زمینوں کی شکل میں ہوں یا تہذیبی رویوں اور اقدار کی شکل میں، سے خود کو واقف بنانے کے لیے فرانس کے دیہی علاقوں میں کافی وقت گزارا۔ دوسری جانب لوشین فیبرے جذبات واعتقاد کے میدان کا وسیع جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس کی کتاب *The Problem of Unbelief in the Sixteenth Century: The Religion of Rabelais*, 1942 میں ایک مرکزی کردار فرانکوئس ریبلیس (Francois Rabelais) کا ذکر ہے جو یقین نہ رکھنے کی حد تک عیسائیت کا ناقد ہے۔ یہ کردار دراصل سولہویں صدی کے سماج ضمن میں فیبرے کے ذریعے مذہب کے بے شمار پہلوؤں کے مطالعے کا نقطہ آغاز تھا۔ اس کا مشہور مضمون *Sensibility and History: How to Reconstitute the Emotional Life of the Past* نئے میدانوں میں تاریخ کی بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کے سلسلے میں ایک اہم موڑ ہے۔ دراصل یہ مضمون اس ایک دعوے سے شروع ہوتا ہے کہ 'حسیت اور تاریخ' (Sensibility and History) بالکل ایک نیا مضمون ہے، میں کسی ایسی کتاب کو نہیں جانتا جو اس کے بارے میں ہو۔ مجھے یہ بھی علم نہیں ہے کہ اس سے متعلقہ بہت سے مسائل کہیں بیان بھی کیے گئے ہیں، پھر بھی برائے مہربانی ایک نادار مورخ کو فنکار کے شکوے کو بیان کرنے کے لیے معاف کریں اور ہاں تب بھی یہ کیا ہی بہترین مضمون ہے۔' کچھ معنوں میں اسی مضمون نے ذہنیت کی تاریخ (History of Mentalities) کا طرز متعین کیا جس کی بعد میں اناس

مورخین نے بہت اعلی پیمانے پر تحقیق کی۔

اس طرح تاریخ، سماجی علوم کا حصہ بننا شروع ہوگئی۔ 1903 میں فرانکوئس سیمنڈ (Francois Simiand) نے تاریخ سے الگ منفرد سماجی سائنس (Social Sciences) کو تصور پیش کیا۔ اگرچہ اس نے اپنے مضمون *methode historique et science sociale* میں تاریخ کے لیے سماجی سائنس کے میدان میں داخل ہونے کی طرف بھی رہنمائی کی تھی۔

> اگر انسانی حقائق کا مطالعہ اپنے آپ کو اثباتی سائنس (Positivist Science) کے طور پر قائم کرنا چاہتا ہے تو اس کو واحد حقائق تک محدود نہیں ہونا چاہیے اور بار بار ہونے والے واقعات سے اپنے آپ کو متعارف کرانا چاہیے۔ یعنی معمول میں سے اتفاق کو ایک طرف رکھنا اور سماج کے لیے فرد کو فنا کرنا ہے۔

یہ مورخین کو معاشیات، سماجیات، بشریات اور جغرافیہ سے سیکھنے کی دعوت تھی تا کہ سماجی تحریک اور تبدیلی کے قوانین سمجھے جانے والے ان اصولوں پر زور دیں جو خصوصیت کے بجائے عمومیت میں چھپے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کو 1960 میں فرنانڈ براؤڈیل (Fernand Braudel) نے اینالس جریدے میں نوجوان مورخین کے استفادے کے لیے دوبارہ شائع کیا تا کہ وہ نصف صدی میں طے کردہ دوری پر اپنی رائے قائم کر سکیں اور تاریخ اور سماجی علوم کے درمیان ہوئے مکالے کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں، جو ہمارے جریدے کا مقصد اور آغاز کا اصل سبب تھا۔

وسیع المدتی (Long-term) اصولوں کے مطالعے کی دعوت کا پہلا رد عمل، معاشیات اور تاریخ کا امتزاج اور ایک خود مختار مضمون 'معاشی تاریخ' (Economic History) کا ابھرنا تھا۔ ارنسٹ لیبروس (Ernest Labrousse) کی کتاب *The Crisis of French Economy at the End of Ancient Regime and the Beginning of revolution*, 1944 اور فرنانڈ براؤڈل کی کتاب، *The Mediterranean and the Mediterranean world in the age of Philipp II*, 1949 میں دونوں نے تاریخ میں وسیع المدتی رجحانات کو تلاش کیا جو سماجی اور معاشی تبدیلی کو سمجھنے یا ایک حد تک پیشین گوئی کرنے میں ہماری مدد کریں۔ لیبروس کا کہنا یہ تھا کہ صنعتی معیشت (Industrial Economy) میں جہاں زائد پیداوار، معاشی بحران کا باعث ہوتی ہے، کے برخلاف زراعت میں غلے کی کم پیداوار، بحرانی حالت کی بنیاد ہوتی ہے جو بعد میں معیشت اور سماج کے دوسرے شعبوں میں پھیل جاتی ہے۔ دوسری جانب براؤڈیل نے بحیرہ روم (Mediterranean) کے ارد گرد ماحولیات (ecology) میں انتہائی سست تبدیلی اور بین براعظمی تجارت کے وسیع المدتی اور طویل فاصلاتی اثرات کا مطالعہ کیا۔ براؤڈیل کی دلچسپی ان موضوعات میں مسلسل باقی رہی، اگرچہ وہ اپنے بعد کے کاموں کے ذریعہ اس کے دائرے بڑھاتا رہا۔ *Civilisation and Capitalism* کے عام عنوان کے تحت تین جلدوں، *The structure of everyday life*، *The Wheels of Commerce*، *The Perspectives of the World*، میں دونوں نے اپنے

پہلے کے سروکاروں کو جاری رکھا اور کچھ نئے جیسے غذا کی تاریخ کو شامل کیا۔ وسیع المدتی تاریخ میں سے ایک شاخ آب و ہوا کی تاریخ (History of the Climate) نکلی جو کئی صدیوں پر مشتمل تھی۔ ایمانوئیل لے رائے لیڈوری (Emmanuel Leroy Ladurie)، ساٹھ کی دہائی کے ان اولین مورخین میں شامل ہیں جنھوں نے یوروپی تاریخ نویسی میں اس نئے موضوع یعنی آب و ہوا کی تاریخ کو متعارف کیا۔

ایک نئے خطے کی جستجو جاری تھی، یعنی معیشت کی وسیع المدتی تاریخ اور سماج میں اس کا شاخ در شاخ پھیلاؤ۔ نئے مسائل، تاریخ کی نئی بصیرت، نئے ماخذ اور تفتیش کے نئے اصولوں کے متقاضی تھے۔ معاشی تبدیلیوں کو عام تاثرات پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کی بنیاد کمیتی معلومات (quantitative data) پر ہونا طے پائی جو کہ ایک نیا تصور تھا اور 1960 میں کمپیوٹر کی آمد نے اس کو مزید تقویت دی۔ مواد کے حوالے سے بھی لوشین فیبرے نے فوسل کالنجس (Fustel de Coulanges) کے اس دعوے پر کہ 'تاریخ متون کے استعمال سے لکھی جاتی ہے' ایک دوسرے سیاق میں یہ کہہ کر ردِ عمل ظاہر کیا تھا کہ 'متن، یقیناً، لیکن ہر قسم کا متن۔۔۔ اور صرف متن نہیں۔۔۔' جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ مارک بلاک، فرانس کے دیہی علاقوں میں ایک ماہر علم بشریات کی حیثیت سے رہا تا کہ جاگیر دارانہ نظام عمل کی بصیرت حاصل ہو۔ براؤڈیل نے مورخین کے فوری اور اسی لیے وقت کے واحد اور یک رخے تصور والے 'واقعہ' میں ملوث ہونے کی تنقید کو سنجیدگی سے لیا۔ اس کا اپنا مطالعہ اس کو فوری وقت سے کافی دور لے گیا۔ اس لیے وہ مختلف مشکل سیاق میں تاریخی وقت کی مختلف آہنگوں (Rhythms) پر اپنا نظریہ پیش کر سکا۔ ایک باثر مضمون 'History and Social Science: the *Longue Duree*, 1958' میں براؤڈیل نے تین زمانی آہنگ (Temporal Rhythms) واضح کیے؛

1. وسیع المدت (*long term*) یا ایک ایسی ساخت (structure) جو ماحولیات یا سماجی و معاشی نظام جیسے کہ سرمایہ داری (Capitalism) کی تاریخ لکھنے میں آہستہ آہستہ حرکت کرتی یا آگے بڑھتی ہے۔
2. اتفاقات (*Conjunctures*) جو وسط مدتی تبدیلی کی تاریخ جیسے دور دراز کی تجارت کے طرز میں دس سالوں میں تبدیلی کی نقش کشی (Mapping) کا طریقہ کار مہیا کرتا ہے۔
3. واقعہ (Event) یعنی فوری واقعہ۔

7.4 نئے تاریخی زاویے (New Historical Dimensions)

ان نئی کوششوں کی وجہ سے تین نئے علوم جیسے، ذہنیت کی تاریخ (History of Mentalities)، سماج کے حاشیائی گروہوں کی تاریخ اور تقابلی تاریخ (Comparative History) وضع ہوئے۔ فیبرے پہلے ہی اپنے مضمون حسیت اور تاریخ (Sensibility and History) کے ذریعے ذہنیت کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ بلاک خود 1924 میں اپنی تصنیف '*Le rois thaumaturges*' یعنی 'بادشاہ کی شفا دینے کی قوت' جسے 1973 میں *The Royal Touch* کے نام سے انگریزی میں

ترجمہ کیا گیا، کے ضمن میں شاہی شعبدہ کاری کے موضوع کی جانچ پڑتال کر چکا تھا۔ ابتدائی دریافتوں نے دلچسپی میں کافی اضافہ کیا اور ذہنیت کا مطالعہ تیزی سے بڑھنا شروع ہوا۔ مائیکل ووول (Michel Vovelle) نے وسطی اور ابتدائی جدید فرانس میں موت کی جانب بدلتے رویے کی نقش بندی کے لیے چرچ ریکارڈ میں محفوظ وصیت ناموں (Testamentary will) کی جانچ کے لیے کمیتی طریقے (quantitative method) کا اضافہ کیا۔

جیکس لے گاف (Jacques Le Goff) نے اپنے بہت مشہور مضمون 'Merchant's time and Church's time in the Middle Ages' میں یہ لکھا ہے کہ عہد وسطی میں کس طرح وقت کے تئیں لوگوں کا رویہ بدل رہا تھا۔ چرچ کا وقت سماوی (Cosmic)، ناقابل شمار اور کائنات کی تخلیق سے آخرت تک پھیلا ہوا تھا دوسری جانب تاجر کو لین دین کے لیے ایسے وقت کی ضرورت تھی، جو متعین تھا، جسے دن کے حساب سے ناپا جا سکتا تھا اور جو ایک ایسی چیز تھا جسے معاشی لین دین کے ذریعہ خریدا یا بیچا جا سکتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے یوروپ میں ان دونوں وقتوں کے درمیان اختلاف، ایک اہم سماجی جھگڑا تھا۔ لے گاف، اینالس تاریخ نویسی کی روایت میں ایک قدآور شخصیت تھے جنھوں نے اس کی سرحدوں کو مزید وسیع کرتے ہوئے ذہنیت کی تاریخ تک پھیلا دیا۔ اسی طرح کی ایک دوسری شخصیت، جارج ڈوبی (Georges Duby) تھے جن کی موت 1996 میں ہوئی۔ اپنی کتاب *Rural Economy and Country Life in the Medieval West* میں یوروپی عہد وسطیٰ کے پس منظر میں زمین اور مزدور کی تاریخ سے آغاز کرتے ہوئے ڈوبی، شادی، خاندان، عورت، کلیسا اور عہد وسطیٰ کے تخیلات، خصوصاً عہد وسطی کے سماج کو چلانے والے رہنمایانہ اقدار کے مطالعے تک چلے گئے۔

فلپ ایریس (Philippe Aries) اپنے آپ کو ایک شوقیہ مورخ کہنا پسند کرتا تھا۔ اگرچہ وہ تاریخ سے وابستہ تھا لیکن یہ اس کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ تاریخ میں کچھ اہم نئے موضوعات کا بانی تھا۔ اس نے مرنے سے متعلق تصورات اور بچوں کے تئیں رویے کو صحیح معنی میں تاریخی تفتیش کا موضوع بنایا۔ اس نے جنسیت (Sexuality) کے مسائل، گھریلو اور ذاتی رشتوں کو اصل موضوع بناتے ہوئے خاندان کی تاریخ کو مرکزی کردار عطا کیا۔ اپنی کتاب *Centuries of Childhood*, 1962 میں بچپن اور اس کی ضروریات کو تسلیم کرنے کی تاریخ کو تلاش کرنے کی کوشش کی کیونکہ بچے ابھی تک چھوٹے جوان سمجھے جاتے تھے اور *The Hour of Our Death*, 1981 میں موت کے تصور پر غور کیا گیا ہے۔ یہ سماجی تاریخ کی از سر نو وضاحت کرنے کے سلسلے میں اہم مداخلت تھی۔ 1970 اور 1980 کی دہائی میں خاندان کی تاریخ پر کام کرنے والے کیمبرج کے مشہور گروہ نے، جس کی قیادت پیٹر لیزلیٹ (Peter Laslett) اور جیک گوڈی (Jack Goody) کر رہے تھے، ان انکشافات کی پیروی کی اور کچھ اہم جدت پسند تحقیقی کاموں کی اشاعت کی جیسے, پیٹر لیزلیٹ اور رچرڈ وال (Richard Wall) کی مرتبہ *Household and Family in Past Time*, 1972، پیٹر لیزلیٹ کی کتاب *Family life and Illicit Love in Earlier Generations*, 1977، رچرڈ وال، جے۔ رابن (J. Robin) اور پیٹر لیزلیٹ کی مرتبہ *Family Forms in Historic Europe* 1982، اور جیک گوڈی کی

The Development of the Family and Marriage in Europe, 1983 وغیرہ۔

حالیہ تین مشترکہ کوششوں نے ذہنیت کی تاریخ (History of Mentalities) کو مزید آگے بڑھایا ہے۔ پہلی فلپ ایریس اور جارج ڈوبی کی پانچ جلدوں میں عمومی مرتبہ *A History of Private Life*، دوسری جارج ڈوبی اور مشیل پیرٹ (Michelle Perrot) کی چار جلدوں میں عمومی مرتبہ *The History of Women* اور تیسری جیووانی لیوی (Giovanni Levi)اور جین کلاؤڈے شمٹ (Jean-Claude Schmitt) کی دو جلدوں میں عمومی مرتبہ *A History of Young People* ہے۔ان تحریروں کا زیادہ تر حصہ ذہنیت سے متعلق ہے۔جی وگارلو (G. Vigarello) نے اپنی دلچسپ کتاب *The Concept of Cleanliness* 1981 میں ذہنیت کے موضوع کو زیر غور لایا ہے جب کہ جین کلاؤڈے شمٹ نے1984 میں حرکات و سکنات (gestures) کے موضوع پر تاریخ اور بشریات (*History and Anthropology*)، جریدے کا مخصوص شمارہ تدوین دیا تھا۔

سماج کے حاشیائی گروہ کافی زمانے سے مورخین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔1960 اور 70 کی دہائی تک جس چیز کی کمی تھی وہ حاشیائیت (Marginality) کا تصور اور اصل سماج (Mainstream) سے اس کا رشتہ تھی۔ حاشیائی صرف وہ لوگ نہیں جو غریب اور نادار ہیں، نہ ہی یہ صرف وہ لوگ ہیں جو اصل سماج کے علاقائی حاشیوں جیسے گاؤں کی سرحدوں، جھونپڑیوں، جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں رہتے ہیں، بلکہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے اصول زندگانی، اصل سماج کے اصول و قوانین سے مختلف ہیں چاہے یہ زبردستی ہو یا پھر ایسے لوگوں کی اپنی مرضی سے جیسے بھکاری، پاگل، سنیاسی، چور اور ڈاکو۔ یہ مائیکل فوکو (Michel Foucault) نامی فلسفی ہی تھا جس نے اس مسئلے کے حل کے لیے خصوصاً اپنی تصانیف *Discipline and* Punish اور *Madness and Civilization* میں پیمانے طے کیے۔اس کا دعوی تھا کہ حاشیائیت کا مطالعہ اہم ہے کیوں کہ یہ اصل سماج کا 'دوسرا پہلو' ہے۔ یہ مطالعہ خود اصل سماج کے خطوط کی نقشہ بندی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ فوکو نے سماجی مظاہر کے مطالعے میں اقتدار کے رشتے کو مرکزی تصور کے طور پر پیش کیا۔ حاشیائیت کی تخلیق، اقتدار کے رشتے کا پرزور اظہار تھا جس میں کہ اصل سماج کی اعلیٰ اقدار نے حاشیائیت کے نظریے کا تعین کیا تھا۔ جو بھی ان اقدار سے میل نہیں کھاتا تھا وہ قیدی یا مجنوں وغیرہ کی طرح الگ کرکے حاشیہ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک نفسیاتی علاج (Psychiatry) کا آغاز، سماجی قوت کے ایک رشتے کے طور پر حاشیائیت کی تخلیق کا مرکزی اظہار تھا۔

اس صورت حال کو مرتب کرتے ہوئے، فوکو تاریخ کے مضمون کے ایک بنیادی مفروضہ پر سوال اٹھارہا تھا یعنی جو حقائق محافظ خانوں سے حاصل کیے گئے ہیں ان کی معروضیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ فوکو کے مطابق 'حقائق' (Facts) تہذیبی طور سے بنائے جاتے ہیں اور وہ اقتدار کے ساتھ تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس طرح تاریخ کی معروضیت کو ایک ہی بار میں اضافی بنا دیا گیا۔ یہ انالس مکتب فکر اور ساتھ ہی اثباتی تاریخ (Positivist History) کے لیے ایک اہم چنوتی تھا۔ کچھ انالس والوں نے حاشیائیت کے اپنے مطالعے میں فوکو کے

نظریات کو شامل کیا۔ پولینڈ کے مورخ بورنسا گرمک (Bronisław Geremek) کی اہم تصنیف *The Margins of Society in Late Medieval Paris* ہے جو دراصل 1971 میں پولش زبان میں، 1976 میں فرانسیسی میں اور 1987 میں انگریزی میں شائع ہوئی، وہ فوکو سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔

تقابلی تاریخ (Comparative History) کا ڈھانچہ، اینالس نظریات میں شروع سے ہی شامل تھا۔ 'تقابلی تاریخ' انالس تاریخ نویسی کی ایجاد نہیں تھی جیسا کہ مارک بلاک نے اپنے مشہور مضمون *A Contribution Towards a Comparative History of European Societies* میں اس پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک تقابلی طریقے کا انحصار دو واقعات اور حالات کے درمیان بظاہر مماثلت میں چھپی عدم مماثلت پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان موازنہ، ہر ایک کے اہم اوصاف کو واضح کرے گا اور اسی لیے ہر ایک کی پہچان بہتر بنانے کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ پھر بھی ایک بڑے اور جامع موضوع کے طور پر جاگیرداری اور سرمایہ داری جیسے مظاہر کا مطالعہ خود ہی اس کو اتنا تقابلی بناتا ہے جتنا کہ ان کے وسیع اور مختلف ڈھانچوں کے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں ان کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

7.5 انالس اسکول کی اہمیت (Importance of the Annales School)

یہ مان لینا ایک بڑی غلطی ہوگی کہ تاریخ نویسی کی انالس روایت نے اپنے قیام کے بعد سات دہائیوں میں کوئی سیدھا سپاٹ راستہ اختیار کیا ہے اور کسی ایک خاص وصف پر مرکوز رہا ہے۔ ساتھ ہی اس میں نہ تو کوئی اہم اتار چڑھاؤ آئے ہیں اور نہ ہی اسے اندرونی کشمکش اور اختلافات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دراصل ابتدائی دور میں ہی جریدے کے ذیلی عنوان (subtitle) میں بار بار تبدیلیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کتنے خلفشار سے گزرنا پڑا اور یہ کس قدر تغیر پذیر رہا۔ انالس لفظ نے بھلے ہی اس جریدے کی ایک مستقل پہچان بنائی ہو لیکن اس کے بنیادی ذیلی عنوان *histoire economique et sociale* کو بعد میں *Economies, Societies, Civilisations* اور آخر میں *Histoire et sciences sociales* کر دیا گیا۔

کچھ اہم تناؤ خود انالس کے اپنے منصوبوں سے ہی پیدا ہوئے۔ بامعنی طور پر دیکھیں تو انالس تاریخ نویسی ایک طرف تو اثباتیت (Positivism) اور مارکسزم (Marxism) کی وراثت کی مخالف تھی اور دوسری جانب اسی کو اس نے وراثت کے طور پر حاصل کیا۔ اثباتیت اور مارکسزم نے تاریخ کی معروضی حقیقت اور مورخین کے ذریعے اس کے موضوعی تصور میں فرق پیش کیا۔ اثباتیت نے سائنسی معقولیت کی بنیاد پر اس معروضی حقیقت کا انکشاف کیا کہ معروضی سچائی، تاریخی ریکارڈ میں چھپا ہوا ہے۔ اپنی عقل کا استعمال کرکے مورخین تھوڑا تھوڑا کرکے اسے باہر لا سکیں گے جس سے کہ دیکھنے والے، مورخ اور دیکھی جانے والی چیز کے درمیان خلا کو پُر جا سکے۔ مارکسزم بھی طبقاتی کشمکش کے منشور (Prism) کے ذریعہ اسی نتیجے پر پہنچتی ہے۔ تمام تاریخ کی وضاحت اسی طرح کی جا سکتی ہے۔

انالس مورخین کا یہی خواب تھا کہ وہ کسی دن 'مکمل تاریخ' ('Total History') لکھ سکیں گے اور یہی 'سچی تاریخ' ('True History') ہوگی۔ لیکن ان کے درمیان واضح فرق یہ تھا کہ اثباتیت کی ساری تاریخی وضاحتیں سائنسی دلیلوں پر اور مارکسزم کی طبقاتی کشمکش پر منحصر تھیں، جب کہ انالس روایت کے مورخین کے پاس علم تاریخ سے متعلق تشریحات کے لیے اس طرح کا کوئی مستقل ڈھانچہ نہیں تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تاریخ سے متعلق سبھی واقعات یا حادثات یا تحریکیں آخری طور پر صرف معاشی یا سیاسی یا نفسیاتی یا اور کسی اور بنیاد پر منحصر نہیں کیے جا سکتے، بلکہ انالس نے گھٹتے رہنے والے اتفاقات، ہر ایک حالت، واقعہ، یا تحریک کے، اپنی منطقی درجہ بندی کے ساتھ، مطالعے کو ترجیح دی۔ پھر بھی کسی نہ کسی سطح پر مکمل اور سچی تاریخ مرتب کرنے کی اہلیت، اثباتیت پسندوں اور مارکسیوں کی معروضی حقیقت کے مفروضہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

فلسفہ غایات (teleology) سے نفرت کے باوجود انالس والوں نے ڈھکے چھپے طور پر ہی سہی، تاریخی وضاحت کی ایک حیران کن وسیع المدتی درجہ بندی پیش کی۔ فیبرے کی اپنے وقت سے آگے کی حسیت (Sensibility) اور بدعقیدگی وغیرہ کی تاریخ میں کھوج بین کو اگر الگ رکھ دیں تو عام طور سے اس صنف کی ابتدائی تحریروں کا تعلق سماجی۔معاشی تاریخ کے میدان سے تھا۔ ایک بار جب بنیاد ڈال دی گئی تب اس پر ذہنیت کی تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا۔ اس مکمل خاکہ بندی کو انالس تاریخ نویسی کے ایک بیحد مشہور رکن، جارج ڈوبی کے اس دعوے سے زیادہ کوئی بھی چیز بیان نہیں کر سکتی، کہ انہوں نے وسطی یورپ میں شادی، عورت اور خاندان کے مطالعے کی طرف اس وقت توجہ کی جب وہ یہاں کی معیشت، پیداواری عمل، تقسیم اور مزید دوسری چیزوں سے مکمل واقف ہو چکا تھا۔

تاریخ اور علم سنین (Chronology) کے درمیان تعلق کا جو مسئلہ انالس تاریخ نویسی نے خود اٹھایا تھا، اسی کی جانب وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اگر وہ سچی تاریخ کی تلاش میں وقتی اور عارضی رکاوٹوں کو عبور کرنا چاہتا تھا تو اسے وقت اور علم سنین پر دوبارہ غور کرنا تھا۔ حقیقت میں تاریخ کا تعلق وقت سے ہے لیکن یہ نہ تو علم سنین کی تابع ہوتی ہے اور نہ ہی اسے ہونا چاہیے۔ واقعتاً اگر علم سنین مصنوعی ہے تو وقت بذات خود بھی بہ جانے والا ہے۔ براوڈیل کے تاریخی وقت کے مختلف آہنگوں (طرزوں) کے تصور اور لے گاف کے وقت کو تہذیبی تشکیل کی حیثیت سے پیش کرنے (کیونکہ وقت اضافی اور تغیر پذیر ہے نہ کہ مطلق اور متعین) نے تاریخ کے وقت اور علم سنین سے دوہرے رشتے کو دوبارہ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 'کامل تاریخ' یا 'اپنے آپ میں مکمل تاریخ' کا خیال ہی علم تاریخ کی قدیم، وسطی اور جدید ادوار کے درمیان سخت تقسیم کے تقدس پر سوال کھڑا کرتا تھا کیونکہ ایسے بہت سے موضوعات ہیں جنہیں اس درجہ بندی میں رکھنا مشکل تھا۔

ذہنیت، سماجی اقدار یا خاندانی ڈھانچے میں تبدیلیوں کا توازن در حقیقت اس کے ارد گرد قائم کسی بھی وقتی سرحد کو عبور کر جاتا ہے۔ ان موضوعات کی تفتیش میں پوشیدہ مفروضہ یہ تھا کہ مورخ کو شواہد کے خصوصاً دستاویزی شواہد کے خوف سے اوپر اٹھنا چاہیے اور تخیل اور بشریاتی بصیرتوں پر بھی بھروسہ کرنا چاہیے، ٹھیک ویسا ہی جیسا کہ مارک بلاک نے کیا۔ پھر بھی تاریخ نویسی کی اس طرز کے زیادہ تر دانشوروں نے شواہد کے ذریعے متعین کردہ زمانی ترتیب کی حدوں کا مضبوطی سے خیال رکھا۔ اس تناؤ کا اتنا پرزور اظہار اور کہیں نہیں ہوا ہے جتنا کہ

براوڈیل کی اہم کتاب *Mediterranean and the Mediterranean World in the Age of Philip II* کے نام میں ہوا ہے۔ایک طرف براوڈیل تاریخ کے وسیع میدان کا احاطہ دو جلدوں میں کرنا چاہتا ہے تو دوسری جانب وقتی حدوں کا سخت تعین فلپ دوم کے عہد کے ذریعے ہو جاتا ہے۔شواہد کی فرمانروائی نے اسے بھی خوفزدہ کیا جیسا کہ اس کے پچھلے والوں کو 19ویں صدی میں کر رکھا تھا اور جبراً اُن کو سلسلہ واقعات سے جوڑ کر ان کی خواہشات کو قابو میں رکھا۔

پھر بھی ان تمام تحقیقات نے جن کا خلاصہ ہم ایک مجموعی اصطلاح (umbrella term) 'انالس تاریخ نویسی' سے کر سکتے ہیں، مورخ کے پیشے کے افق کو وسیع کر دیا جس سے اس مضمون کو سب طرف پھیلا ہوا تحقیق کا ایک وسیع دائرہ کار ملا۔اس کی سوچ بچار کا محور اپنی زندگی کی تمام الجھنوں، کشمکش،ابہامات،تذبذب،متضاد و مسابقتی جذبات،افکار، تجربے اور ذہنیت کے ساتھ نسل انسانی ہے۔یہاں زندگی کی ساختوں کا مطالعہ انسانی مطالعے کے ماتحت ہوتا ہے،نہ کہ مطالعہ کا موضوع ایسا ہوتا ہے جو الگ تھلگ اور غیر ذاتی ہو اور جس سے انسان صرف ایک منصوبہ بند کردار کے طور پر منسلک ہو۔دائرہ کار کی وسعت کو اور اس کے مسلسل بڑھنے والے پہلوؤں کی جانچ پڑتال کی پیچیدگیوں کو خود یہ طے کرنا چاہیے کہ وہ کسی بھی غایتی (Teleological) منصوبے کو ایک دم پیچھے چھوڑ دیں گے، بھلے ہی انالس والوں نے شعوری طور پر اس کا سامنا کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

7.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

جیسا کہ گذشتہ بحث سے ہم کو معلوم ہوا کہ انالس مکتب فکر (Annales school) نے 20ویں صدی میں تاریخ نویسی کی روایتوں میں سے ایک بہت ہی اہم روایت قائم کی۔مارک بلاک،لوشین فیبرے،فرنانڈ براوڈیل،جارج ڈوبی،ایمانوئیل لے رائے لیڈوری،رابرٹ منڈرو،جیک لے گاف اور دوسرے مورخین نے وقتاً فوقتاً موضوعات اور طریقہ کار میں مستقل جدت کے ذریعے تاریخی عمل (Historical Practice) کو نئی تعبیر دی۔معاشی ڈھانچوں کی تاریخ،وسیع المدتی ترقیوں کی تاریخ،ذہنیت کی تاریخ، خرد تاریخ اور ثقافتی تاریخ وغیرہ سب کو اس مکتب فکر کے مورخین کی اہم تحریروں سے فائدہ پہنچا ہے۔

7.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

حاشیائیت	:	حاشیائیت (Marginality) یعنی سماج میں اصل سماج کے رسوم و رواج اور اقدار سے الگ تھلگ ہونا جیسے ہندوستان میں، آدی واسی، قبائلی، اَنتیج اور شودر وغیرہ عام ہندوستانی سماج سے الگ تھلگ تصور کیے جاتے تھے۔
اصل سماج	:	اصل سماج (Mainstream) یعنی وہ سماج جس کے رسوم و رواج اور اقدار بڑے پیمانے پر رائج ہوں اور ایک خطے کی اکثریت اس پر عمل کرتی ہو ساتھ ہی عام طور پر انہیں فیصلہ کرنے کا پیمانہ سمجھا جائے۔
تقابلی مطالعہ	:	کسی ایک ملک کے اندر یا مختلف ممالک کے درمیان موازنہ پر مشتمل ہے، بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ

مماثلت اور فرق دونوں کو اجاگر کرنے سے یہ نئی ترکیبوں، نئے سوالات اور بعض اوقات قابل قبول جوابات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

رجعت پسند : اس طریقہ میں معاملات، رسوم ورواج، روایات، جگہ کے نام اور میدانی طرز کے بعد کے زمانے سے اخذ کیے گئے شواہد کا استعمال کرنا شامل ہے جو اس ابتدائی زمانے کو واضح کرنے کے لیے شاید پہلے زمانے پر عائد کیے جائیں۔

7.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. *Review of Historical Synthesis* کس نے جاری کیا؟
2. انالس مکتب فکر کی باقاعدہ ابتدا کس سال میں ہوئی؟
3. اسے انالس نام کس کے جریدے کے نام پر ملا؟ اس کا پورا نام بتایئے۔
4. اس کے دو ابتدائی مفکر کون تھے؟
5. پہلی جنگ عظیم کا اصولی طور پر اختتام کہاں ہوا؟
6. اسٹراسبرگ یونیورسٹی کہاں واقع ہے؟
7. مارک بلاک نے جاگیرداری کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کس کتاب میں کیا؟
8. *The Problem of Unbelief in the Sixteenth Century: The Religion of Rabelais* کس کی تصنیف ہے؟
9. فرنارڈ براوڈیل کس مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے؟
10. آب وہوا کی تاریخ کس کی شاخ کے طور پر ارتقا پذیر ہوئی؟

7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. انالس اسکول کے قیام کے سیاسی سیاق کا ذکر کیجیے۔
2. انالس اسکول کے قیام کے دانشمندانہ سیاق کا ذکر کیجیے۔
3. تاریخ پر کس چیز کو لے کر تنقید کی جاتی تھی؟
4. دستاویز پچھلے مورخین کے لیے اتنے مقدس کیوں تھے؟
5. مارک بلاک کے ابتدائی حالات بیان کیجیے۔

7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اس سیاق کا ذکر کیجیے جس میں انالس اسکول قائم ہوا؟
2. تاریخ نویسی کے انالس مکتبہ فکر کے بانی کون لوگ سمجھے جاتے ہیں ان کی تحریروں پر بحث کیجیے۔
3. موضوعاتی سطح پر انالس اسکول کے مورخین نے اس مدت میں کیا اضافہ کیا؟ مثالوں سے واضح کریں۔

7.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Reading Material)

---

1. Burke, Peter (ed.), *New Perspectives on Historical Writing*, Oxford, 1992.
2. Burke, Peter, *Economy and Society in Early Modern Europe*: *Essays from Annales*, Taylor and Francis, 2013.
3. Harsgor, Michael, 'Total History: The Annales School,' *Journal of Contemporary History*, Vol. 13, No. 1, 1978, pp. 1–13.
4. Iggers, Georg G., *New Directions in European Historiography*, Wesleyan University Press, Middletown, Connecticut, 1975.
5. Le Goff, Jacques, and Pierre Nora (eds.), *Constructing the Past*: *Essays in Historical Methodology*, Cambridge University Press, 2011.
6. Maurice, Aymard and Harbans Mukhia (eds.), *French Studies in History*, 2 Vols. Orient Longman, New Delhi, 1988 and 1990.
7. Stoianovich, Traian, *French Historical Method*: *The Annales Paradigm*, Cornell University Press, Ithaca, 2019.

اکائی 8۔ ذہنیت کی تاریخ

(History of Mentalities)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 ذہنیت کی تاریخ کی ابتدا

8.3 ذہنیت کی تاریخ کا ارتقاء

8.4 ذہنیت کی تاریخ کی خصوصیات

8.5 ذہنیت کی تاریخ کے اثرات

8.6 اکتسابی نتائج

8.7 کلیدی الفاظ

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید (Introduction)

پچھلی اکائیوں میں آپ نے تاریخ نویسی سے متعلق متعدد نظریات اور مکاتب فکر کے بارے میں پڑھا ہوگا۔انہیں میں سے ایک اینالس اسکول ہے جس کے بارے میں آپ نے اکائی 7 میں پڑھا ہوگا۔اینالس مورخین کی تحریروں سے تاریخ نویسی کا ایک اور طرز نکل کر سامنے آیا جسے ذہنیت کی تاریخ (history of mentalities) کہا جاتا ہے جس کے بارے میں آپ اس اکائی میں پڑھیں گے۔

ذہنیت کی تاریخ، ثقافتی تاریخ سے متعلق ایک نظریہ ہے جس کا مقصد ان طریقوں کو بیان کرنا اور تجزیہ کرنا ہے جن کی مدد سے قدیم لوگوں نے اپنے ارد گرد کی دنیا کے بارے میں سوچا، اس کے ساتھ تعامل کیا اور اس کی درجہ بندی کی، جو کہ مخصوص واقعات یا معاشی رجحانات کی تاریخ کے برعکس ہے۔ذہنیت کی تاریخ کو تاریخ کے مختلف مکاتب فکر کے متعدد مورخین اور دانشوروں نے ایک تاریخی آلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔خاص طور پر، اینالس اسکول کے مورخین نے ذہنیت کی تاریخ کو ترقی دینے اور ایک ایسا طریقہ کار بنانے میں مدد کی جس سے کام لیا جا سکے۔اس طریقہ کار کو تشکیل دیتے ہوئے، انہوں نے اپنے تجزیے کو ایک خاص جگہ اور ایک خاص وقت تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ یہ نقطہ نظر اپنے آپ کو ایسے گہرے مطالعہ کی طرف راغب کرتا ہے جو خرد تاریخ (micro history) کی خصوصیت ہے۔خرد تاریخ ایک اور ایسا شعبہ جس نے ذہنیت کی تاریخ کو تاریخی تجزیہ کے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ذہنیت کی تاریخ کی ابتدا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ذہنیت کی تاریخ کے ارتقاء کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ذہنیت کی تاریخ کی خصوصیات بیان کر سکیں گے۔
- ذہنیت کی تاریخ کے اثرات پر روشنی ڈال سکیں گے۔

8.2 ذہنیت کی تاریخ کی ابتدا (Emergence of the History of Mentalities)

نٹالی زمون ڈیوس(Natalie Zemon Davis)نے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ثقافتی تاریخ کے اس خاص اسلوب کے ممتاز مورخین میں سے ایک ہونے کا ایک درست دعویٰ کیا ہے جسے فرانسیسی *l'histoire des mentalités* (ذہنیت کی تاریخ) کہتے ہیں۔تاریخی ذہنیت کا مطالعہ بڑی حد تک بیسویں صدی کے فرانسیسی عظیم علمی شخصیات جیسے مارک بلاک(Marc Bloch)، لوسیئن فیبرے (Lucien Febvre) اور فرنانڈ براوڈیل(Fernand Braudel)کے کام اور مستقبل شناسی کے ذوق سے پروان چڑھا ہے۔1929 میں، بلاک اور فیبرے نے مشترکہ طور پر *Annales d'histoire économique et sociale*

نامی جریدے کی بنیاد رکھی۔1946 میں اس کا نام *Annales: Economies, Sociétés, Civilizations* رکھ دیا گیا۔اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی تاریخ لکھی جا سکے جس میں دیگر تمام علوم کے، بطور خاص سماجی علوم جیسے جغرافیہ، سماجیات، معاشیات، لسانیات، نسلیات اور نفسیات کے اکتسابی طریقوں اور بصیرت کو اپنایا جائے۔

اس جریدے کے صفحات میں اور اپنے علمی کام میں، بلاک، فیبرے اور ان کے شاگردوں نے تاریخ کو ان لوگوں سے چھڑانے کا بیڑا اٹھایا جنہوں نے تاریخ کے نام پر خصوصاً، سیاست، سفارت کاری، اقوام کی جنگوں اور عظیم شخصیات پر توجہ مرکوز کی۔اس تاریخ کی جگہ، جسے انہوں نے حقارت کے ساتھ *histoire événementielle* یا واقعاتی تاریخ (episodic history) قرار دیا، اینالس مورخین نے کل انسانی تجربے (total human experience) کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی۔ان کا حتمی مقصد تاریخ کو انسانی علم اور سماجی علوم وفنون کی بنیاد بنانا تھا۔

بلاشبہ اس نئی تاریخ کا سب سے بہترین نمائندہ براوڈیل تھا، جو اینالس تاریخ نویسی کی دوسری نسل میں ممتاز ترین دانشور تھا۔اس کے دو عظیم عالمانہ شاہکاروں، *The Mediterranean and the Mediterranean World in the Age of Philip II* اور *Civilization and Capitalism, 15th–18th Century*، نے وسیع تر تاریخی دائرہ کار کی سطح حاصل کی جس کی اکثر پرچار کیا جاتا ہے لیکن اینالس نظریے کے مداحوں کو شاذ و نادر ہی اس کا احساس ہوتا ہے۔ الگ الگ سیاسی، اقتصادی اور سماجی زمروں میں تاریخ کی روایتی تقسیم کو ترک کرتے ہوئے، براوڈیل نے ایک مکمل مربوط اور کامل ثقافتی تاریخ لکھنے کی کوشش کی۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، اس نے ماضی کا ایک نظریہ پیش کیا جس میں اس نے دلیل دی کہ تاریخ ایک ہی وقت میں تین اعمال پر مشتمل ہے، ہر ایک عمل اپنی تبدیلی کی رفتار کے مطابق آگے بڑھتا ہے۔یہ تین سطحیں ایک پیچیدہ لیکن مربوط تاریخی عمارت کی تین منزلوں کو تشکیل دیتی ہیں۔

فرنانڈ براوڈیل
(Source: https://en.wikipedia.org)

نچلا حصہ سست، طویل مدتی، انتہائی قدامت پسند تاریخی قوتوں جیسے ماحولیاتی اور زرعی عوامل پر مشتمل ہوتا ہے۔یہ مظاہر بدلتے تو ہیں لیکن ہزارہا سال کے دوران۔یہ 'جغرافیائی وقت' کی شرح کے مطابق تاریخ ہے۔درمیانی سطح پر وسط مدتی ثقافتی اور اقتصادی تبدیلیاں ہیں جو ایک ہزار سال کی مدت میں، یا ایک یا دو صدیوں کے اندر ارتقا پذیر ہوئیں۔یہ 'سماجی وقت' کی شرح پر مبنی تاریخ ہے۔بالائی منزل میں مختصر مدت کے ڈرامائی واقعات ہیں ۔یہ ایسے تاریخی واقعات ہیں جو روایتی طور پر مورخین کی توجہ حاصل کرتے رہے ہیں ۔یہ 'انفرادی وقت' کی تیز رفتار والی تاریخ ہے۔ذہنیت کی تاریخ (history of

(mentalities)اس تاریخی عمارت کی درمیانی سطح پر مرکوز ہے۔یوں سمجھا جاسکتا ہے، مورخ جو ماضی کے بارے میں اس نظریہ کو اپناتا ہے، وہ اجتماعی روایات اور افکار کے ڈھانچے کا جائزہ لیتا ہے تا کہ ان سے ان گروہوں کی اقدار اور تصوراتی طریقوں کو اخذ کیا جائے جنھوں نے ان کو عزیز رکھا۔ دانشورانہ یا سماجی تاریخ سے کہیں بڑھ کر، ذہنیت کی چھان بین کا طریقہ، اپنے وسیع تر تصور میں ثقافتی تاریخ ہے۔یہ جذبات کی ساتھ ہی خیالات کی بھی تاریخ ہے۔یہ ذہنی ساخت کے ساتھ ساتھ طبقاتی ڈھانچے کی بھی تاریخ ہے۔

8.3 ذہنیت کی تاریخ کا ارتقاء (Development of the History of Mentalities)

ذہنیت کے مورخ کا خیال ہے کہ ذہنی عادات اور فکر کے زمرے آفاقی یا لافانی نہیں ہیں۔یہ مورخ یہ بھی مانتا ہے کہ سوچنے کے طریقے اس پوری ثقافت پر منحصر ہیں جس میں وہ پائے جاتے ہیں۔ان دونوں سے یہ بات نکلتی ہے کہ ماضی کے لوگوں کو بالکل اپنے جیسے انسانوں کے طور پر دیکھنے کے بجائے، ذہنیت کا مورخ ماضی کے لوگوں کا ان کے مکمل ثقافتی ماحول کے حوالے سے تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔مثال کے طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ بارہویں صدی کی ایک ہندوستانی خاتون کی ذہنی عادات اور افعال کو ان ذرائع کی بنیاد پر نہیں پرکھا جاسکتا جن سے بیسویں صدی کے شمالی امریکی، پوری دنیا کو دیکھتے ہیں اور اس سے تعلق قائم کرتے ہیں۔بلکہ، اس خاتون کو زبان، افسانوں، مذہبی-سماجی رشتوں اور دیگر ساختوں کے سیاق سباق میں سمجھنا چاہیے جنھوں نے اس کی دنیا کو تشکیل دیا۔ذہنیت کا مؤرخ، نہ صرف ماضی کی ثقافتوں کے اعمال پر جدید طرز فکر کو مسلط کرنے کے خلاف مزاحمت کرتا ہے بلکہ انسانی ماضی کی ان صاف ستھرے زمروں میں درجہ بندی کے خلاف بھی بغاوت کرتا ہے جس کی بڑی حد تک ماضی کے سیاسی، ثقافتی اور سماجی اشرافیہ کے اعمال، افکار اور تحریروں سے وضاحت کی گئی ہے۔

انسان دوستی کا دور، عہد روشن خیالی، رومانوی انقلاب، گپت دور، کاماکرا دور اور تانگ دور، یہ سب ایسی تاریخی تقسیم کی مثالیں ہیں جنھیں ذہنیت کے بہت سے مورخین کافی محدود اور بناوٹی سمجھتے ہیں۔ان مورخین کے مطابق، اس قسم کے زمرے صرف قسط وار تاریخ (episodic history)کے واقعات کی عکاسی کرتے ہیں جو کہ طاقت پر اجارہ داری رکھنے والے محدود طبقوں کے ذریعہ تخلیق کردہ اور یادگار بنائے گئے ہیں اور جنھوں نے اپنی تعلیم سے اعلیٰ ثقافت کی شناخت واضح کی۔بے اختیار اور ناخواندہ لوگوں کی بھی اپنی تاریخ ہے۔یہ تاریخ بھی اشرافیہ کی تاریخ کے جتنا ہی درست ہے، لیکن یہ اکثر ایک مختلف تاریخی رفتار سے اور ایک مختلف ذہنی منظر نامے سے سبقت کر جاتی ہے۔

8.4 ذہنیت کی تاریخ کی خصوصیات (Characteristics of the History of Mentalities)

تبدیلی اور تسلسل تاریخ کے اہم پیمانے ہیں۔مورخین مستقل طور پر، روایت اور اختراع کے درمیان، انسانی ماضی میں واقع ہونے والی اکثر ہلکی سی اور بعض اوقات ڈرامائی تبدیلیوں کو سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس طرح کی مشاہدہ کی جانے والی تبدیلیوں کے بارے میں مورخین کی تشریحات، ان درجہ بندیوں کو منظم کرتی ہیں جن میں وہ ماضی کو تقسیم کرتے ہیں۔مثال کے طور پر 'ابتدائی نشاۃ ثانیہ' اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ اس دور کے اگلے پچھلے ادوار یعنی اواخر عہد وسطیٰ(Late Middle Ages)اور اعلیٰ عہد نشاۃ ثانیہ (High Renaissance Period)کے درمیان بامعنی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔مغربی مورخین، کم از کم اٹھارویں صدی سے،

تاریخی تبدیلی کے رجحان سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔اس کی دلیل یہ ہے کہ ،تاریخ کی جس تعریف پر جدید مغربی مورخین نے سب سے زیادہ اتفاق کیا ہے وہ ہے 'وقت کے ساتھ ساتھ اہم انسانی پیش رفتوں کا مطالعہ۔'

تاریخ کی تغیر پذیری میں تبدیلی کی اہمیت، یہاں تک کہ اس کی مرکزیت سے بھی انکار کیے بغیر،ذہنیت کے مورخین زیادہ تر تسلسل اور ماضی کی روایات پر توجہ دیتے ہیں۔ایسے مورخین آہستہ آہستہ تبدیل ہونے والی اجتماعی نفسیات کی کھوج لگاتے ہیں اور اپنے تاریخی افراد کے روزمرہ کے مفروضوں اور خودکار جوابات کو تلاش کرتے ہیں۔وہ ان طریقوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں ایک مخصوص تاریخی ثقافت کے اشخاص نے اپنے روزمرہ کے تجربات کو واضح طور پر معنی دیے ہیں۔ مختصراً، ذہنیت کے مورخین ایک ثقافت کو استحکام دینے والی، دہرائے جانے والی اور یہاں تک کہ لاشعوری فکری اور عملی ساختوں پر زور دیتے ہیں۔

مزید برآں، علم تاریخ کے لیے ذہنیت کا نقطہ نظر، ثقافتی تبدیلی کے ادوار پر اہم روشنی ڈال سکتا ہے، جیسا کہ دو فرانسیسی مورخین کے حالیہ کام میں دکھایا گیا ہے۔جیکس لے گاف(Jacques Le Goff)نے رومن کیتھولکوں کے بعد مرگ ارواح کی روحانی تطہیر (Purgatory)میں یقین کے ارتقاء کا سراغ لگایا ہے اور اس بات پر قائل کرنے کے لیے یہ دلیل دی ہے کہ بارہویں صدی میں اس نظریے کی فتح نے تخیلات کے بنیادی ڈھانچے کو کافی حد تک بدل دیا۔

8.5 ذہنیت کی تاریخ کے اثرات (Impact of the History of Mentalities)

جارج ڈوبی(Georges Duby)نے اس طریقے کا مطالعہ کیا ہے جس میں بارہویں صدی کے دوران قدیم شہسور طبقے اور کلیسائی اقدار کے درمیان تنازعہ کے نتیجے میں شادی کا 'جدید' نقطہ نظر ابھرا جس میں ایک مقدس، پائیدار اور یک زوجگی رشتے کے بجائے دو بالغوں کے ذریعے آزادانہ طور پر داخل ہوا جا سکتا تھا۔ مغربی عیسائی دنیا کے سب سے بنیادی نظریات جیسے موت، نجات اور شادی وغیرہ میں اس قسم کی تبدیلی، عیسائی دنیا کے لوگوں کے سوچنے اور عمل کرنے کے طریقوں میں بنیادی طور پر نئے رخ کی نشاندہی کرتی ہے۔

نجات اور ازدواجی قوانین اور رسم ورواج کے مفروضے میں ان تبدیلیوں نے سبھی سماجی حدود عبور کر کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔اس حقیقت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تاریخی تحقیق میں ذہنیت کا نظریہ صرف انہی دانشوروں کا خصوصی شعبہ نہیں جو کہ کم طاقتور، زیادہ تر ان پڑھ اور سماج کی حد درجہ روایتی تنظیموں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔یقیناً اس میدان میں زیادہ تر دلچسپ ترین کام، اب تک دھندلکے میں رہے غیر اشرافیہ یعنی عام افراد کے احساسات اور عقائد سے وابستہ ہے۔ایک پوری کتاب سولویں صدی کے ایک چکی والے کے تصور زندگی کے لیے وقف کیا گیا ہے۔تاہم، بااثر اشرافیہ طبقے جیسے سولہویں صدی کی فرانسیسی یسوعی انجمن(French Jesuits)اور ورجینیا کے جوار بھاٹے سے متاثر علاقے کے اٹھارویں صدی کے وسط کے تمباکو اگانے والوں کی اجتماعی نفسیات کے بارے میں بھی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں۔مزید براں ذہنیت کا نقطہ نظر، اشرافیہ اور غیر اشرافیہ کے ذریعے یکساں اور شراکتی طور پر کیے جانے والے مشترک ادراک اور احساس کے میدانوں کا

انکشاف کرتا ہے۔

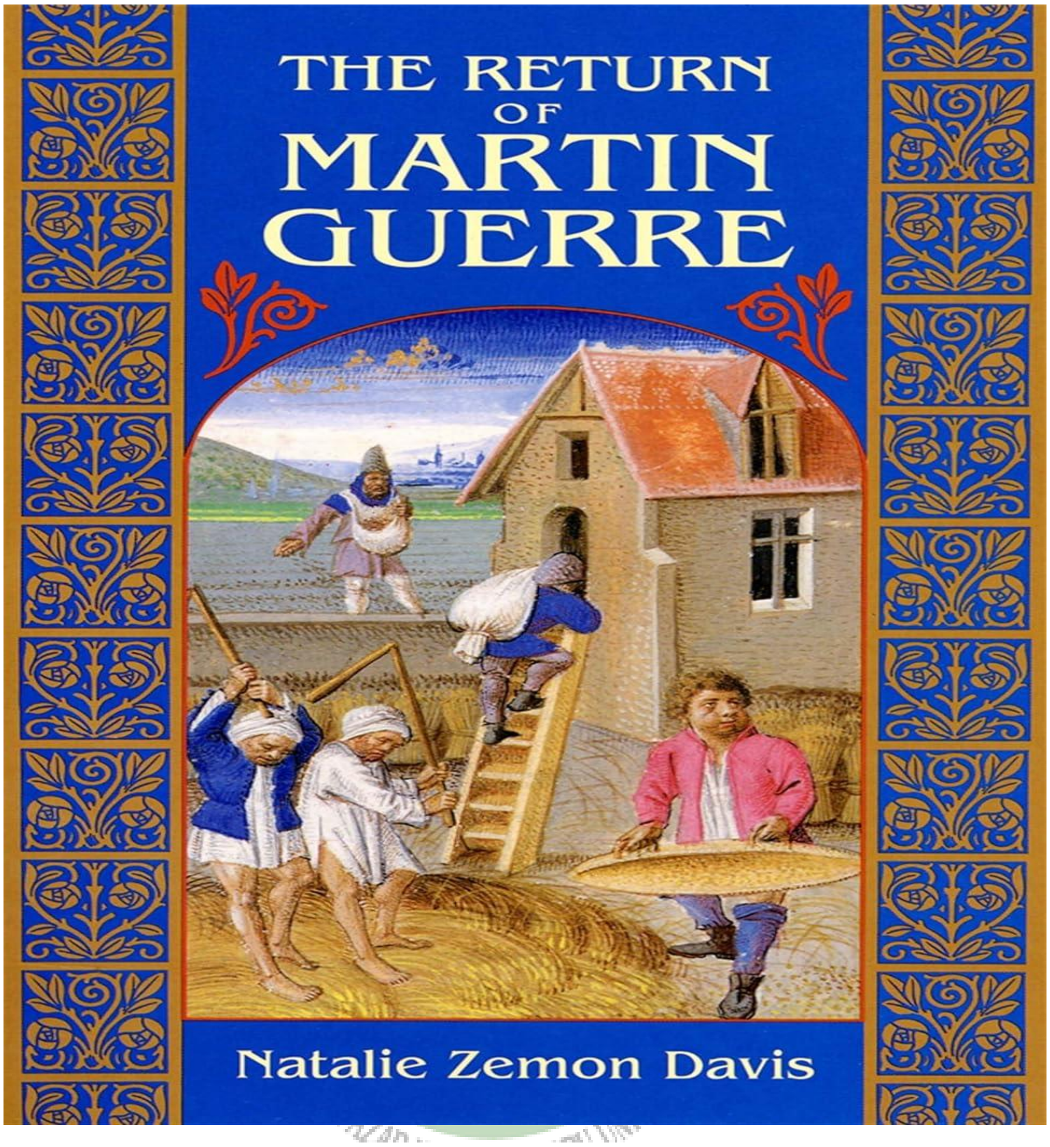

تصویر 8.1۔ نٹالی زمن ڈیوس کی کتاب 'مارٹن گوئرے کی واپسی' کا سر ورق۔
(Source: https://www.amazon.in/Return-Martin-Guerre-Paper-Natalie/dp/0674766911)

ذہنیت کے علم کے ساتھ یہ تصور لازمی طور پر جڑا ہوا ہے کہ یہ تاریخ، ثقافتی نظاموں کو باہم مربوط کرنے کا مطالعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک نظام یا اجتماعی ذہنی ساختیں، اپنی اندرونی منطق اور واضح دلیلیں رکھتی ہیں اور ایک مخصوص وقت اور مدت میں یہ نظام اکثر بنیادی طور پر مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اٹھارہویں صدی کے ورجینیا کے سیلابی علاقے کے کاشتکاروں کا ذہنیت کا نظام اپنے غلاموں سے یکسر مختلف تھا۔ مورخ کو اس لیے کسی بھی تاریخی عہد کی مکمل تصویر حاصل کرنے کے لیے ان میں سے ہر ایک نظام کو دریافت کرنا ہوگا۔ یہ ہم عصر ثقافتیں ایک دوسرے سے چاہے کتنی بھی مختلف کیوں نہ ہوں، وہ ایک دوسرے سے ربط پیدا کرتی ہیں اور بہت سی عام اقدار اور نظریات میں شراکت بھی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر عہد وسطی کے عیسائی بادشاہ، پادری، جنگجو، آزاد کردہ غلام (burgher) اور کاشتکار مساوی طور پر

یقین رکھتے تھے کہ مقدس تبرکات روحانی طور پر اپنے معتقدین کو طاقت دیتے ہیں۔ انجام کار تبرکات بطور خاص مقدس سرزمین کے تبرکات کی ہوس، جو کہ مندرجہ بالا تصور کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی، مذہبی جنگوں (crusades) کے پیچھے ایک بنیادی محرک طاقت تھی، جو کہ اجتماعی تحریکوں کا ایک سلسلہ تھا جس کی اعلیٰ عہد وسطی (high middle ages) کی عیسائی مغربی دنیا میں سماج کے ہر طبقے نے حمایت کی تھی۔

جس کسی نے بھی علم بشریات کا مطالعہ کیا ہوگا وہ اس موضوع اور خصوصاً اس کی ذیلی شاخ نسلیات اور تاریخ کے ذہنیتی نظریے کے درمیان شدید مطابقت دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔ نٹالی زمن ڈیوس کے معاملے میں بھی یہ تعلق نہیں ٹوٹا جو کہ علم بشریات کو انہیں کئی مفید بصیرتیں اور نمونے فراہم کرنے کا اعزاز دیتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت میں تاہم وہ خبردار کرتی ہیں کہ علم بشریات اور تاریخ دو جداگانہ موضوع ہیں اور مورخین کو متنبہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے پیشے کے موضوعاتی لوازمات اور مخصوص تناظر کو لے کر ہمیشہ وفادار رہیں۔

8.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دانشورانہ تاریخ کا ایک شعبہ 'ذہنیت کی تاریخ'، روزمرہ کی زندگی کے بارے میں عام لوگوں کے رویوں بشمول بچپن، جنسیت، خاندان، وقت اور موت سے متعلق خیالات پر غور کرتا ہے، یہ نقطہ نظر فرانسیسی اینالس اسکول کے ساتھ قریب سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن جہاں اینالس مورخین انسان کی پرورش کرنے والے مادی عوامل جیسے معاشی، سماجی اور ماحولیاتی اثرات وغیرہ پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، وہیں ذہنیت کی تحقیق کرنے والے مورخین، نفسیاتی حقائق کا جائزہ لیتے ہیں اور گہرے رشتوں اور ذہن کی بنیادی عادات کے بارے میں انسانی تصورات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ذہنیت کی تاریخ، نظریات اور ثقافت کی تاریخ کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے۔ عینیت پسند (idealist) ثقافتی مورخین، جیسے برک ہارٹ (Burckhardt) اور ہوئزنگا (Huizinga)، نے ثقافت کے مسائل کو نظریاتی مسائل اور سماجی اور سیاسی تناظر میں ان کی تشریح کے طور پر دیکھا۔ ثقافتی تاریخ کے لیے یہ عینیت پسند اور فکری نقطہ نظر اپنی کشش کھو بیٹھا تھا کیونکہ اس کے طریقہ کار نے اسے من مانی طور پر اعلی ثقافت کا مطالعہ کرنے تک محدود کر دیا تھا اور اس میں عام آدمی کو کسی دوسری جگہ گڑھے گئے خیالات کے اطاعت گزار وصول کنندہ کے طور پر دیکھنے کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ اس کے برعکس، ذہنیت کی تاریخ، عام آدمی کی ثقافت پر غور کرنے کی وجہ سے عینیت پسند مورخین سے آگے نکل گئی۔ اس نئے نقطہ نظر نے عالمی نظریات سے توجہ کو ان 'ساختوں' کی طرف منتقل کر دیا جن کے ذریعے اس طرح کے تصورات کو پہنچایا جاتا ہے۔ یہ ایسی شکلیں ہیں جو ذہنی سرگرمیوں کو باقاعدہ بناتی ہیں، جیسے رسم و رواج، رسومات، لسانی ضابطے، جمالیاتی تصاویر وغیرہ)۔ خیالات کے ان ڈھانچوں کو بیان کرنے سے ذہنی کائنات کا نقشہ بنانے میں مدد ملتی ہے جو کہ کسی ثقافت کی خصوصیت ہوتی ہے۔ اب نئی توجہ خیالات کی تاریخ کے بجائے ذہن کی تاریخ پر دی جانے لگی۔

مورخین جنہوں نے سب سے پہلے ذہنیت کی تاریخ کے لیے رہنما اصول تیار کیے وہ اینالس اسکول کے بانی لوسیئن فیبرے اور مارک بلوک تھے جو عقائد کے اجتماعی نظام سے متعلق تھے۔ فلپ ایریس (Philippe Ariès) اور نوربرٹ الیاس (Norbert

Elias) نے بعد میں، ابتدائی بچپن کی شناخت کی اور اس سے متعلق نظریات تیار کیے۔ آخر میں، مائیکل فوکو (Michel Foucault) نے، جو ساختیاتی طریقوں کو لاگو کرنے میں سب سے زیادہ شدت پسند تھا، سماج کے بھگوڑوں اور غیر موافقت پسندوں کی نفسیات پر غور کیا۔ تشریح کا یہ طریقہ زندگی اور ثقافتی تاریخ کے ان پہلوؤں کو جانچنے کا ایک طریقہ فراہم کرتا ہے جن پر تاریخ کا مستوی (linear) نقطہ نظر توجہ نہیں دے سکتا، جیسے مطابقت کا دباؤ، وقت کو تیز کرنے کا احساس اور خود کے ساتھ مشغولیت وغیرہ۔ یہ تہذیبی عمل کا ایک دوسرا پہلو فراہم کرتا ہے۔ جسے ترقی کہا جاتا ہے، ذہنیت کے نقطہ نظر سے آسانی سے اس پر کنٹرول کا ٹھپہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سیاسی آزادی، ایک واضح نفسیاتی سماجی نظم و ضبط کی قیمت پر حاصل کی جاتی ہے، کیونکہ ہر شہری کو حقوق کے ساتھ متعدد فرائض پر بھی عمل کرنا پڑتا ہے۔ متضاد طور پر، انسان ایک تخلیق کار کے طور پر ایسے ڈھانچے تخلیق کرتا ہے جو اس کی آزادانہ اظہار کی صلاحیت کو محدود کرتے ہیں۔

8.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

عینیت پسند	:	(idealist) وہ شخص جو اعلیٰ یا عظیم اصولوں، مقاصد، اہداف وغیرہ کی قدر یا اس کی پیروی کرتا ہے۔
مستوی طرز	:	(linear) سیدھی اور روایتی تاریخ جس میں پیدائش سے موت تک، عروج سے زوال تک ایک سیدھے خط میں تاریخ آگے بڑھتی ہے۔
پرگیٹری	:	(Purgatory) رومن کیتھولکوں میں بعد مرگ، ارواح کی روحانی تطہیر کا عقیدہ

8.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

8.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اینالس مکتب فکر کے بانی کون تھے؟
2. اینالس اسکول کا نام اینالس کیوں پڑا؟
3. 'History of Mentalities' اصطلاح کس زبان سے نکلی؟
4. فرنانڈ براوڈیل کس تاریخی مکتب فکر سے وابستہ تھے؟
5. براوڈیل کی تاریخی عمارت کے کس منزل پر ذہنیت کی تاریخ پائی جاتی ہے؟
6. نٹالی زمن ڈیوس کس مکتب فکر کے ممتاز ترین دانشور ہیں؟
7. کس یسوعی انجمن کی اجتماعی نفسیات کے بارے میں اہم کتاب لکھی گئی؟
8. پرگیٹری (purgatory) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
9. کس نے رومن کیتھولکوں کے بعد مرگ ارواح کی روحانی تطہیر میں یقین کے ارتقاء کا سراغ لگایا؟
10. سب سے پہلے ذہنیت کی تاریخ کے لیے رہنما اصول کن مورخین نے تیار کیے؟

8.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ذہنیت کی تاریخ اور ثقافتی تاریخ میں کیا فرق ہے؟ مختصر نوٹ لکھیے۔
2. فرنانڈ براوڈیل کی تاریخی عمارت کا مختصر تذکرہ کیجیے۔
3. پر گیٹری پر جیکس لے گاف کی تحقیق اور اس کے نتائج بیان کیجیے۔
4. مذہبی جنگوں کے پیچھے محرک طاقت کے طور پر ذہنیت کی تاریخ کا کردار واضح کیجیے۔
5. ذہنیت کی تاریخ کے اثرات پر نوٹ لکھیے۔

8.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ذہنیت کی تاریخ کی ابتدا پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. ذہنیت کی تاریخ کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. ذہنیت کی تاریخ کی خصوصیات تفصیلی طور پر بیان کیجیے۔

8.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Braudel, Fernand, *On History*, University of Chicago Press, Chicago, 1982.
2. Chartier, Roger, *Cultural History*: *Between Practices and Representations*, Cornell University Press, Ithaca, New York, 1988, especially chapter 1 titled ‘Intellectual History and the History of Mentalités: A Dual Re-evaluation,’ pp. 19–52.
3. Hobsbawm, E.J., ‘From Social History to the History of Society,’ in *Historical Studies Today*, (eds.), Felix Gilbert and Stephen R. Graubard, W. W. Norton & Company, New York, 1972, pp. 1–26.
4. Hutton, Patrick H., ‘The History of Mentalities: The New Map of Cultural History,’ *History and Theory*, Wiley, 20, 1981, pp. 237–59.
5. Le Goff, Jacques, ‘Mentalities: A History of Ambiguities,’ in *Constructing the Past*: *Essays in Historical Methodology*, (eds.), Jacques Le Goff and Pierre Nora, Cambridge, 1985, pp. 166–80.

اکائی 9۔ اسپینگلر اور مغرب کا زوال

(Spengler and Decline of the West)

اکائی کے اجزاء

9.0	تمہید
9.1	مقاصد
9.2	اسپینگلر اور ان کا کام
9.3	اسپینگلر کی تصنیف کا سیاسی پس منظر
9.4	اسپینگلر کا نظریہ تاریخ
9.5	'ثقافت' بطور تاریخی تجزیہ کی قسم
9.6	تاریخی حقیقت کی تفہیم کا مسئلہ
9.7	ثقافتی امتیازات کی علامات
9.8	جدید مغربی ثقافت کے چار اہم مدارج
9.9	انسانی فطرت کے تئیں اسپینگلر کا ادراک
9.10	اسپینگلر کی سیاسی قدامت پسندی
9.11	اسپینگلر کے سیاسی طور پر قدامت پسند پیش رو
9.12	جرمنی کے روایت پسند حکمران طبقہ پر اسپینگلر
9.13	جمہوریت اور ثقافتی اقدار کی بربادی
9.14	اسپینگلر کے ناقدین
9.15	اکتسابی نتائج
9.16	کلیدی الفاظ
9.17	نمونہ امتحانی سوالات
9.18	تجویز کردہ اکتسابی مواد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

9.0 تمہید (Introduction)

تہذیبوں کے آغاز، ارتقاءاور زوال تحقیق کے ایک خصوصی موضوع کے بطور دنیا بھر میں اسکالروں کی توجہ کا ہمیشہ مرکز رہا ہے۔اس کے ذریعے وہ چاہتے تھے کہ مختلف تہذیبوں کے بارے میں سمجھیں اوران کے تاریخی ارتقا کی وضاحت کریں۔اوسوالڈ اسپینگلر(Oswald Spengler) ان ہی اسکالروں میں سے ایک ہے جس نے تہذیبوں کے آغاز اور زوال کی تشریح کی۔ان کی تصنیف ''مغرب کا زوال'' (The Decline of the West) بہت زیادہ مقبول ہے حالانکہ دیگر اسکالروں نے اس پر تنقید بھی کی ہے۔یہ اکائی کے ذریعے آپ اسپینگلر کے کام سے متعارف ہوں گے اور یہ بھی جانیں گے کہ کس طرح ان کے کام نے دانشوران کے حلقوں اوران کے ناقدین میں اس موضوع سے متعلق دلچسپی کو ابھارا۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اسپینگلر کے کام کے متن کو سمجھ سکیں گے اور جو نظریہ پیش کیا گیا اس سے واقف ہو سکیں گے۔
- اشاعت کے بعد اس کام کی مقبولیت کے اسباب سے واقف ہو سکیں گے۔
- اسپینگلر کے نظریہ کے مختلف ناقدین کے بارے میں جانیں گے۔
- اسپینگلر کے کام کی اہمیت کو سراہ سکیں گے۔

9.2 اسپینگلر اوران کا کام (Spengler and His Work)

اوسوالڈ اسپینگلر (1880-1936) ایک جرمن مفکر اور تاریخ کا فلاسفر تھا۔دو جلدوں (volumes) پر مبنی اپنی تصنیف *The Decline of the West* کی وجہ سے وہ کافی مشہور و مقبول ہوا۔پہلی جلد اس نے 1918 میں لکھا جبکہ دوسری جلد 1922 میں لکھا گیا۔پہلے اور دوسری جلد کے انگریزی تراجم 1926 اور 1928 میں بالترتب شائع ہوئے۔اوران کی اشاعت سے پوری دنیا اس پر متوجہ ہوئی۔اس تصنیف میں اسپینگلر نے یہ پیشین گوئی کی کہ مغربی تہذیب جو اس کتاب کے لکھے جانے کے وقت ایک غالب اور طاقتور کلچر کی حیثیت رکھتی تھی،اپنے زوال کی علامات ظاہر کررہی تھی اوراس کا یہ بھی ماننا تھا کہ یہ طاقت اور غلبہ بیسویں صدی کے اختتام تک زوال پذیر ہو جائے گا۔اس کا ایقان اور استدلال تھا کہ تاریخ میں پائی جانے والی تمام ثقافتیں (کلچر) اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد زوال کا مزہ چکھتی ہیں او ر یہ کہ مغربی تہذیب بھی اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو *The Decline of the West* کوئی تاریخ پر لکھی گئی تصنیف نہیں ہے۔یہ ایک تخیل پر مبنی تحریر ہے یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادبی کام ہے۔دنیا بھر اس وقت کے بہت بڑی تعداد میں مغرب سے تعلق رکھنے والے

دانشوروں کا یہ مضبوط عقیدہ تھا کہ دنیا نہ ختم ہونے والی ترقی کے نہ ختم ہونے والے سفر کو شروع کر چکی ہے۔ لہٰذا اسپینگلر کی کتاب نے سب کو حیران کر دیا اس حیران کرنے والی خصوصیت نے اس کتاب کو مقبولیت کے اونچے مقامات پر پہنچایا اور اس کے مصنف کو بھی ایک celebrity شخصیت بنا دیا جو اس وقت تک بہت کم جانے جاتے تھے۔

9.3 اسپینگلر کی تصنیف کا سیاسی پس منظر (The Political Context of Spengler's Work)

اسپینگلر کی فکر کو اگادر تنازعہ (Agadir crisis) (جسے دوسرا مراقش تنازعہ) بھی کہا جاتا ہے' نے بہت متاثر کیا۔ اگادر تنازعہ اس وقت رونما ہوا جب جولائی 1911 میں بحر اوقیانوس میں واقع مراقش کی بندرگاہ کو جرمنی نے بندوق والی کشتی (Gun Boat) روانہ کی تاکہ اپریل 1911 میں مراقش میں فرانسیسی دستے کو چیلنج کیا جا سکے۔ دونوں یوروپی طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف کھڑی تھیں۔ اسپینگلر کا خیال تھا کہ یوروپی طاقتوں کے درمیان پائی جانے والی یہ مخاصمت (دشمنی) اس براعظم کے مستقبل کے لیے خطرہ ہے۔

9.4 اسپینگلر کا نظریہ تاریخ (Spengler's Theory of History)

روایتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اسپینگلر کوئی مورخ نہیں تھا لیکن وہ تاریخی تبدیلی کی سمت کے بارے میں واضح نظریات رکھتا تھا۔ روایتی مورخین تاریخ کے ارتقا کے سلسلے میں ایک خطی نظریہ (Linear Theory) کے حامی جانے جاتے ہیں جہاں انہوں نے تاریخ کے ماضی کو عہد قدیم، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے بطور تقسیم کی۔ اور اس تقسیم کے دوران انہوں نے تاریخ کی خطی سمت (Linear Direction) میں ترقی وارتقا کو پیش کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ حال ہمیشہ ماضی کے مقابلے ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ اسپینگلر نے پہلی مرتبہ تاریخ کو ایسے معاشروں میں تقسیم کیا جو وقت کے ساتھ شاید ہی بدلتے ہوں۔ ایسی سوسائٹیز جو تاریخ سے عاری تھیں وہ قدامت پسند سوسائٹیز ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ تسلسل (Continuity) کا مشاہدہ کیا۔ اس کے برعکس ایسی سوسائٹیز جو تاریخ رکھتی تھیں انہوں نے یا تو ترقی کو ظاہر کیا یا تنزل پذیر ہوئیں۔ تاریخی سوسائٹیز ابتداء میں ترقی اور پھر بالآخر تنزل کے چکر (Cycle) سے گزریں۔ اسپینگلر کا نظریہ تاریخ مدوراتی نہیں ہے لیکن ان میں بالآخر ابتدائی نقطہ (Starting Point) پر واپس پہنچنے کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔

9.5 ثقافت بطور تاریخی تجزیہ کی قسم ('Culture' as a Category of Historical Analysis)

اسپینگلر کے خیال میں تاریخ کی انسانی اکائی نہ تو کوئی قوم (nation) ہے نہ کوئی نسل (race) اور نہ کوئی طبقہ (class) ہے، بلکہ یہ اکائی ثقافت یعنی کلچر ہے۔ انہوں نے درج ذیل استدلال کیا۔

> کیا دنیا کی تاریخ دیکھنے والی آنکھ کو مخصوص خصوصیات مناسب اعتدال کے ساتھ بار بار پیش کرتی ہے، تاکہ مخصوص نتائج کو ثابت کیا جا سکے؟ اور اگر اس طرح ہو، تو ان علاقوں سے علتوں (reasoning) کی حدود کیا ہیں جن کو ڈھکیلا جا سکتا ہے؟ کیا خود حیات کو پانا ممکن ہے؟ کیونکہ انسانی تاریخ ایسی طاقتور حیاتی کورسوں (طرزوں) کا مجموعہ ہے جو مروجہ

خیالات اور اظہارات میں انا(ego)اور شخصیت(personality) سے لیس ہیں اور جو اعلیٰ درجے کے علاقوں (entities)کی پیش گوئی کرتی ہیں جیسے ''دی کلاسیکل'' یا'' چینی کلچر'' یا جدید تہذیب۔ مراحل کی سیریز جسے عبور کیا جانا چاہیئے اور کیا عبور کیا جانا بھی ایک ایسی ترتیب میں ہو؟ ہر ایک ذی حیات شیئے کے لیے پیدائش' موت' جوانی' عمر' مدت حیات جیسے تصورات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیا یہ تصورات اس شعبہ میں ایک ایسے سخت ترین معانی رکھتی ہیں جو کسی نے اب تک اخذ نہ کیا ہو؟ مختصراً طورپر کیا تمام تاریخ کی بنیاد ایک عمومی بائیو گرافک آر کی ٹائیپس (Biographic Archetypes) ہونی چاہیئے۔ (اسپینگلر، مغرب کازوال، صفحہ 3)۔

ایک ثقافت (کلچر) سے دوسری ثقافت کی جانب حرکت پانچ ثقافتوں کی ایک ترتیب میں ہوئی ہے۔ مصری (Egyptian)' کلاسیکل' ماگیان (Magian)' مغربی (Western) اور روسی (Russian)۔ اسپینگلر کا کہنا ہے کہ روسی کلچر اپنی ساخت بنانے کے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ انہوں نے چینی کلچر اور ہندوستانی کلچر کا بھی ذکر کیا۔ اسپینگلر نے اس بات پر زور دیا کہ ماگیان کلچر' کلاسیکل کلچر (یونانی۔ رومن) اور موجودہ مغربی کلچر کے درمیان موجود ہے۔ ماگیان کلچر میں کلی کلچروں کے عناصر شامل ہیں جیسے عربی' شامی (Spain)' یہودی' بازنطینی (Byzantine) اور مشرقی لیونٹائن (Eastern Levantine) ذیلی ثقافتیں۔ ماگیان کلچر کی ترقی پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر محمد ﷺ کے ادوار میں ہوئی اور اس کا زوال عہدِ وسطیٰ کے آخری دور میں ہوا۔ چینی اور ہندوستانی ثقافتیں بھی لگ بھگ اسی مدت تک قائم رہیں اور ترقی و تنزل کے ان ہی مدارج سے گزریں۔ البتہ ان ثقافتوں نے مغربی کلچر پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اور ان پچھلی ثقافتوں کے دوبارہ نمودار ہونے کے خاطر حواہ نشان بھی نہیں پائے جاتے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ہمیشہ ایک نئے کلچر کی شروعات ہوئی جو زوال پذیر کلچر سے نمودار ہوا۔ اسپینگلر کا مطالعہ کلچروں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ ان میں سے دو کلچر وہ بہتر طور پر جانتے تھے۔ وہ کلاسیکل اور مغربی (یوروپی اور امریکی) کلچر ہیں۔

> ثقافتیں اجسام ہیں اور عالمی تاریخ ان کی سوانح حیات ہے۔ ساخت یا تشکیل (Morphologically) کے اعتبار سے چینی کلچر یا کلاسیکل کلچر کی تاریخ ایک انفرادی شخص یا کوئی جانور یا درخت یا پھول کی تاریخ سے مکمل طور پر سادی ہے۔ Faustian نظریہ کے مطابق یہ کوئی اصولک (Postulate) نہیں ہے بلکہ ایک تجزیہ ہے۔ مختلف تہذیبوں کی تقدیر میں جو ایک دوسرے پر عمل کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ترقی کرتے ہیں، چھوتے ہیں، سایہ فگن ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو دباتے ہیں، انسانی تاریخ کا پورا نچوڑ ہیں''(اسپینگلر، معرب کازوال، صفحہ 104)۔

اسپینگلر نے انسانی کلچر کو ذی حیات ہستی سے تعبیر کیا کیونکہ ان کی مدت حیات بھی ایک محدود' قابل توقع اور قبل از متعین ہوتی ہے۔ انہوں نے اجسام اور کلچروں کے درمیان مشابہت کو پیش کیا۔ ذی حیات اجسام پیدائش' نشو و نما' بالیدگی' زوال اور بالآخر موت جیسے مختلف مراحل سے گزرتے ہیں۔ اسی طرح اسپینگلر نے انسانی حیات کی زیادہ بڑی اکائیاں مثال کے طور پر کلچر کے لیے بھی اپنی مراحل کا اطلاق کیا۔ تاریخی ثقافتیں سوپر اجسام (Super Organisms) ہوتے ہیں جو جوانی' بالیدگی اور فنا(decay)کے مراحل و مدارج سے

گزرتے ہیں۔

9.6 تاریخی حقیقت کی تفہیم کا مسئلہ (The Question of Grasping Historical Reality)

اسپینگلر کے مطابق تاریخی حقیقت کو تجرباتی (Empirical) اور استخراجی (Deduction) طریقوں کے ذریعے سمجھا نہیں جاسکتا جیسا کہ انیسویں صدی اور ابتدائی بیسویں صدی کے مورخین کے ہاں یہ طریقے بہت مقبول تھے۔ اسے محض احساس (feeling)، وجدان (intuition)، تخیل اور اس سے بھی زیادہ علامتوں (symbolism) کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی رجحانات کو حقائق (facts)، ذاتی اثرات، قومی جذبات یا معاشی رجحانات کے ذریعے سمجھایا نہیں جاسکتا۔ یہ فی الفور ماضی میں وقوع ہونے والی کوئی شئے نہیں ہے جسے آج پیش آنے والے واقعہ کے طور پر بیان کیا جاسکے۔ اسپینگلر کے پیش کردہ نظریہ کے مطابق جو کچھ بھی آج واقع ہو رہا ہے وہ کلچر کے چکر دار اور ذی حیات منطق (Organismic Logic) کے ذریعے پہلے سے متعین کردہ ہے جس کی ایک طئے شدہ مدت ہے اور جو ارتقاو تنزل کے ادوار سے گزرتا ہے۔

9.7 ثقافتی امتیازات کی علامات (Symbols of Cultural Distinctions)

کلچر جو کچھ بھی پیدا کرتا ہے وہ کلچر کی ایک علامت کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک مخصوص بنیادی اصولوں کا ایک سیٹ (set) ہے کلچر سے جڑے تمام تصورات واقدار کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تمام اصول اور اقدار کلچر کی فطرت کے لیے کلید فراہم کرتے ہیں۔ کوئی بھی شخص ان کو جمالیات (Aesthetics) کے میدان میں بہ آسانی نشاندہی کر سکتا ہے۔ آرٹ، موسیقی اور اس سے زیادہ اہم فن تعمیر (آرکیٹیکچر)۔ یہ اصول واقدار خاص طور پر سیاسیات، معاشیات اور جنگ جیسے شعبہ جات پر اپنا زیادہ اثر دکھاتے ہیں۔ اسپینگلر چند علامات کو کلچر کی مثالیت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ ڈارک کالم (Doric Column) یونانی کلچر کی علامت ہوگا۔ باغ چینی کلچر کی علامت ہوگا اور کیورن (Cavern) ماگیان کلچر کی علامت ہوگا۔ ثقافتوں کی یہ تمام مختلف علامات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ کسی ایک کلچر سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے کلچر میں کیا کچھ ہو رہا ہے اس کی تہہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ لہٰذا مختلف ثقافتیں آپس میں ایک دوسرے کے لیے ناقابل فہم ہوتے ہیں۔

9.8 جدید مغربی کلچر کے چار اہم مدارج
(The Four Main Stages of Modern Western Culture)

جدید مغربی کلچر جو اسپینگلر کے کلچر کے لیے توجہ کا مرکز ہے اور جس کے موال پذیری کو وہ وضاحت اور پیش گوئی کرتا ہے، چار اہم مدارج سے گزرتا ہے۔ یہ چار مدارج ایک سال میں واقع ہونے والے چار موسموں سے مشابہہ ہے۔ بہار، گرما، پت جھڑ (خزاں) اور سرما۔ ان موسموں اور کلچر کے درمیان ایک مشابہت ظاہر کی گئی ہے۔ اس کے مطابق مغربی کلچر کے لیے عہد وسطیٰ موسم بہار تھا۔ یہ اس دور کی اہم

خصوصیات جیسے کہانت یا پادری کا عہدہ (Priesthood)، جنگجوئی، زمین سے جڑی یکسانیت (Peasantry)، محدود قصبے اور شہر، منفرد آرٹ (چرچوں اور محلات) اور شدید ترین روحانیت۔ یہ کلچر نشاۃ ثانیہ کے دور میں موسم گرما میں پہنچا جس کے دوران شہری ملک (City States) کا استحکام، تجارت وکامرس کا فروغ اور آرٹ میں بہت زیادہ ترقی جیسی خصوصیات اس دور کا اہم حصہ ہیں۔ مغربی کلچر کے لیے پت جھڑ کا موسم اٹھارویں صدی میں آیا جس میں کلچر کے اندرونی امکانات ختم ہونے شروع ہوئے۔ اور سطح مرتفع واقع ہوا جیسے موسیقی میں موزارٹ (Mozart) اور بیتھوون (Beethowan)، ادب میں گوئتھے (Goeth) اور فلسفہ میں کانٹ (Kant)۔ انیسویں صدی سے کلچر موسم سرما کے دور میں قدم رکھتا ہے۔ مغربی کلچر کے اس دور سرما کو اسپینگلر ''تہذیب'' (Civilization) کا نام دیتا ہے۔

9.9 انسانی فطرت کے تئیں اسپینگلر کا ادراک (Spengler's Perception of Human Nature)

انسانوں کی اخلاقی قوتوں کے بارے میں ہمیشہ فلاسفروں اور مفکرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسانی فطرت حقیقتاً اچھی ہوتی ہے جب کہ دوسرے اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس سوال کو حل کرنا یا کسی ایک نتیجے پر پہنچنا فلسفیانہ اور تجرباتی سطح پر مشکل امر ہے، پھر بھی مفکرین نے ان دونوں موقف میں سے کسی ایک موقف کو اپنی سمجھ اور ادراک کی بنیاد بنایا۔ اسپینگلر نے انسانی فطرت کو ایک الگ ہی نظریہ سے دیکھا۔ ان کا احساس تھا کہ انسانی تاریخ میں کوئی ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ تاریخ محض ظلم و جبر، جنگجوئی اور بربادی کی علامت ہے۔ اس مایوسانہ (Pessimistic) نظریہ کو لیتے ہوئے اسپینگلر اس وقت کے مشہور فلاسفروں اور مفکرین جیسے نیتشے (Nietzsche) اور فرائیڈ (Freud) کی صحبت میں تھا۔ انسانی محرکہ کے مرکز پر نیتشے نے انسانی قوت ارادی کو رکھا۔ اس کا استدلال تھا کہ انسان بالآخر اپنے نقطہ آغاز کو واپس پہنچتے ہیں اور پھر اپنے پچھلے چکر (Cycle) کی جانب بھاگتے ہیں۔

9.10 اسپینگلر کی سیاسی قدامت پسندی (Spengler's Political Conservatism)

انیسویں صدی کے دانشوروں کے ذہنوں میں ایک اور سوال بہت زیادہ ابھر رہا تھا۔ وہ سوال تھا ''جمہوریت کے تئیں ابھرتے شعور پر کوئی کیسے رد عمل ظاہر کر سکتا ہے'' دانشوروں کا وہ طبقہ جو سیاست اور سماج میں جمہوری اصولوں کی حمایت کرتا تھا وہ ترقی پسند (Progressives) اور انقلابی (Revolutionaries) کہلاتا تھا اور وہ دانشور جو جمہوریت کے کردار اور اس کی ماہیت کے تعلق سے منفی رجحانات رکھتے تھے قدامت پسند (Conservatives) کہلاتے تھے۔ واضح طور پر اسپینگلر کا تعلق قدامت پسند طبقہ سے تھا۔

9.11 اسپینگلر کے سیاسی قدامت پسند پیش رو

(Politically Conservative Predecessors of Spengler)

قدامت پسند خیالات رکھنے والے اسپینگلر کے کئی نامور پیش رو بھی تھے۔ ٹاکویل (Tocqueville) ایک فرانسیسی سیاسی مفکر

تھا جو باوجودیکہ آزاد پسند (Liberal) تھا۔ جمہوریت میں اکثریت پسندی کے خطرات کے تئیں فکر مند تھا۔ اپنے آخری سالوں میں وہ اور زیادہ مایوس پسند (Pessimistic) ہو گیا تھا۔ یعقوب برکہارڈٹ (Jacob Burckhardt) سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والا مورخ تھا۔ یہ بھی ایک بااثر قدامت پسند تھا جو 1846 کے انقلاب کی ناکامی سے پیدا ہونے والے نئے حالات سے کافی دلبرداشتہ تھا۔ اسے مستقبل سے کوئی امید نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جمہوریت پسند (Democratic) اور پرولتاریوں (Proletarians) کو بڑھتی ہوئی آمریت کے آگے جھک جانا چاہیئے جیسا کہ فرانس میں پیش آیا۔

نیتشے (Nietzsche) ایک اور بااثر فلاسفر تھا جس نے اسپینگلر پر کافی اثر ڈالا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جو سماجی افراتفری، مصیبت اور غیر یقینی حالات پیش آئے، اس کے مد نظر نیتشے کا ایقان تھا کہ باشعور اور پڑھے لکھے افراد کے ایک چھوٹے طبقہ کو سماجی امور میں بہتری لانے کے لیے آگے آنا چاہیئے۔ اسی طرح اس وقت کے ایک اور اہم قدامت پسند ولفریڈو پیریٹو (Vilfrado Pareto) تھا جو جمہوریت اور اشتراکیت (Socialism) دونوں کے تعلق سے شکوک وشبہات کا شکار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان کی سیاسی فطرت قابل تبدیل نہیں ہے اور انسویں صدی میں پھیلنے والی ترقی پسندی کی بیان بازی کے باوجود عوام کے مادی حالات میں خاطر خواہ بہتری نہیں پائی جاتی۔ اس نظریہ کے مطابق سماج کے اونچے پائیدان پر رہنے والے افراد کبھی بھی مستقلاً اسی مقام پر نہیں رہے۔ اور اس مقام پر وقت کے ساتھ دوسرے لوگ قابض ہو گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اپنے مقام پر فائز لوگ جن خصوصیات کی وجہ سے اس مقام پر تھے رفتہ رفتہ وہ خصوصیات کمزور پڑتی گئیں اور اسی دوران نچلے مقام پر فائز لوگ ان خصوصیات کو اپنا کر ان سے ان کا مقام چھین کر خود فائز ہو گئے۔ رابرٹ مشیل (Robert Michaels) ایک جرمن سوشلسٹ تھا جو پیریٹو سے کچھ حد تک متاثر تھا۔ اس نے اپنی ابتدائی بیسویں صدی میں شائع تصنیف "پولیٹیکل پارٹیز (Political Parties) میں بحث کی کہ تمام تنظیمیں بشمول ان کی جو جمہوری اصولوں اور پریکٹس (Practices) پر کاربند ہیں آگے چل کر بالآخر طبقہ اشراف کی حکومت کے سامنے دم توڑ دیتی ہیں۔ یہ تمام پس منظر قدامت پسندوں کے جمہوریت کی استعداد و قوت کے تئیں منفی رجحانات کو مستحکم کرتا ہے۔

9.12 جرمنی کے روایت پسند حکومتی طبقہ پر اسپینگلر

(Spengler on the Traditional Ruling Classes of Germany)

اسپینگلر کو یقین تھا کہ جرمنی کا روایت پسند حکومتی طبقہ جرمنی کو ایک عالمی جنگ (پہلی جنگ عظیم) کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔ اس نے سماجی یک جہتی کے لیے ایک نئی بنیاد کی تبلیغ کی اور جرمن قدامت پسندی کے لیے ایک نئی اخلاقی بنیاد کی داغ بیل ڈالی۔ وہ چاہتا تھا کہ قومی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے سماجی تنازعات کا دوستانہ طرز پر حل تلاش کرنا چاہیئے۔ انہوں نے Doctrine of Corporation کی تبلیغ کی جو حکومتی ساخت میں طبقاتی ضروریات کو شامل کرنے پر واضح طور پر زور دیا۔

9.13 جمہوریت اور ثقافتی اقدار کی بربادی

(Democracy and the Destruction of Cultural Values)

اسپینگلر کے سیاسی عالمی نقطہ نظر میں سماجی کلاس اور خصوصی طور پر States کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ان کے خیال میں اصلاً دو طبقات 'طبقہ امراء اور پادریت (Priesthood) نے سماج میں اہم تعمیری کردار ادا کیا۔ان کے وجود اور کام کے ذریعے پسندیدہ ثقافتی اقدار کو بامعنی اظہار کا موقع فراہم کیا۔ایک تیسرا گروپ جسے Urban Bourgeoisie کے نام سے جانا جاتا ہے، ثقافتی اقدار میں کمی کا شکار تھا اور وہ اپنے نظریات میں انفرادیت پسند (Individualist) اور علامت مخالفت (Anti-Symbolic) تھا۔اس گروپ کی ترقی سے تہذیب (Civilization) میں گراوٹ آئی اور وہ بالآخر ختم ہو گئی۔ سماج میں ایک اور نئے گروپ کی شروعات سے عوام کا گروپ یا عام لوگوں کا گروپ کہا جاتا ہے۔ ثقافت / کلچر کو مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا۔اسپینگلر کا ایقان تھا کہ تمام حقیقی حکومتوں کو ضرورتاً اشرافیہ طبقہ (Aristocracy) کی حکومت ہونا چاہیئے۔تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہر سیاسی دور میں محض چند اقلیت ہی حکومت کی نمائندگی کرتے رہے۔ لہٰذا طبقہ اشرافیہ ہی مملکت اور اس کے انتظامی امور میں اہم اقدار کو فروغ دے سکتا ہے۔

9.14 اسپینگلر کے ناقدین (Critiques of Spengler)

اسپینگلر کے کام اور ان کے نظریہ نے کئی ناقدین پیدا کیے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے تاریخ کو قبل از تعین (Predetermination) اور جبریت (Fatalism) کی نظر سے دیکھا۔ مثال کے طور پر ابتدائی بیسویں صدی میں پیش آئے واقعات کو صدیوں پرانی مغربی ثقافت کے چکر (Cycle) کی منطق کے حوالے سے وضاحت کی گئی نہ کہ یوروپ میں پچھلے پچاس سال یا سو سال میں پیش آئے واقعات کے حوالے سے۔ یہ غلط فہمی راست طور پر انسانی تاریخ کو ایک سوپر آرگنزم کے طور پر دیکھنے سے جڑی ہوئی ہے۔ تاریخ سماجی حرکیات سے جڑے واقعات کے مطابق اپنا کام انجام دیتی ہے یا پھر بعض اوقات اتفاقی اور بے ترتیب عوامل کے ساتھ بھی جن کا حیاتی اجسام کی زندگی اور ان کی منطق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

اسپینگلر کا یہ سوچنا کہ دنیا کی مختلف ثقافتیں چاہے متوازی ہوں یا ترتیب وار ہوں، ان کے درمیان معکوس اثرات یا آپسی ربط نہیں پایا جاتا، محض ایک غلطی تھی۔ حقیقت میں مختلف کلچروں کے درمیان بہت کچھ لین دین پایا جاتا ہے۔اسپینگلر خود اپنے بیان سے منحرف ہوئے جب انہوں نے کہا کہ عبرانی (مغربی کلچر کے نمائندے) نے ہمیں ہمارا مذہب دیا، یونانیوں نے ہمیں فلسفہ دیا، اور رومیوں نے ہمیں اپنا قانون دیا۔

آرنلڈ ٹوئین بی (Arnold Toynbee) جو بیسویں صدی کے پہلے نصف کے ایک مشہور و معروف مورخ ہیں، اپنی کتاب "A Study of History" میں اسپینگلر کے کام کے مماثل انداز میں مگر اسپینگلر کے خیالات کے برعکس اپنی بات کو پیش کیا۔ ٹوئین بی نے تہذیبوں کی درجہ بندی کی اور ان کی تعداد اکیس (21) بتائی جبکہ اسپینگلر کے مطابق وہ تعداد آٹھ تھی۔اسپینگلر کی طرح ٹوئین بی

کی تہذیبیں بھی چکر نما (Cyclical) ترقی کرتی ہیں اور پھر تنزل کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن ٹوئین بی تہذیبوں کر چکر (Cycle) کو حیاتی آرگنزم کے مماثل نہیں دیکھتا۔ ان کے نظریہ کے مطابق تہذیبوں کے زوال کی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی، جیسا کہ اسپینگلر کا خیال تھا۔ بیسویں صدی کا پہلا حصہ یوروپی تاریخ کا بلاشبہ ایک مشکل دور تھا لیکن جدید اختراعات (ایجادات) اور کوششوں سے حالات کو بدلا جاسکتا ہے اور پُر امید مستقبل کے لیے راستہ ہموار کیا جاسکتا ہے۔

حال کی دہائیوں میں ایک سیاسی سائنسداں جنہوں نے عالمی تاریخ کے وسیع causes کے بارے میں اسپینگلر اور ٹوئین بی کے انداز میں لکھا۔ وہ سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington) تھے۔ کمیونسٹ دنیا کے زوال اور سرد جنگ کے اختتام پر ہنٹنگٹن نے یہ پیش گوئی کی کہ مستقبل کی جنگیں کلچروں کے مڈبھیڑ کے سبب ہوں گی۔ اس نے اس طرح کے آٹھ کلچروں کی فہرست دی جس میں مغربی، اسلامی، سنیک اور ہندو کلچر اہم تھے۔ اس کی پیش گوئی میں اس نے عیسائی مغرب اور اسلامی مشرقِ وسطیٰ کے درمیان جھڑپوں کے زیادہ امکان کا اظہار کیا اور یہ پیش گوئی عرب اسرائیل جنگ سے ثابت ہوئی۔

ایک اور سیاسی سائنسداں فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyama) نے بھی عالمی تاریخ کے وسیع causes کے بارے میں لکھنے کا انتخاب کیا تاکہ عالمی سیاست کے مستقبل کے بارے میں اظہار کیا جاسکے۔ انہوں نے 1992 میں اپنی کتاب *The End of History and the Last Man* لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا کہ دنیا میں وہ واحد سیاسی و معاشی نظام جس کی آگے چل کر بقا کے امکانات ہیں وہ آزادانہ جمہوریت (Liberal Democracy) ہے جو سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کے ساتھ جڑی ہو اور یہ کہ آنے والی کئی دہائیوں تک دنیا بھر کے مختلف ممالک اس نظام کو اختیار کریں گے۔ فوکویاما نے جو کچھ کہا وہ اسپینگلر کی تقریباً پچھتر سال قبل کہی گئی بات کا بالکل برعکس تھا۔ اسپینگلر نے مغرب کے زوال کے بارے میں اپنے لکھے گئے مقالے میں جو کچھ بھی پیش کیا وہ محض جزوی طور پر صحیح ثابت ہوا۔

جب سویت روس بکھرا تو لوگ یک قطبی (Unipolar) دنیا کے بارے میں بات کرنے لگے تھے، لیکن پچھلے تیس برسوں میں چین کی معیشت کی تیز رفتار ترقی سے یہ قیاس آرائی کی جارہی ہے کہ چین سیاسی و معاشی اعتبار سے دنیا بھر میں اول مقام حاصل کرنے کے دہانے پر کھڑا ہے اور امریکہ کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اسے نمبر دو کے مقام پر پہنچا دے گا۔ روس کی جانب سے ڈکٹیٹر شپ کے احیاء اور نیوکلیئر ہتھیار کے ایک بڑے ذخیرے پر قبضہ رکھنے سے مغربی غلبے کے چیلنج میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ روس کے اس چیلنج کے ردعمل کے طور پر یوروپین یونین اور ناٹو (NATO) مزید قربت اختیار کر رہے ہیں۔ روس کے یوکرین پر حملے کے تناظر میں مغربی طاقتیں ملٹری صلاحیتوں کو بڑھانے میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ فی الوقت دنیا کی سیاست میں کوئی ایک بھی طاقت ایسی نہیں ہے جسے ہم واضح طور پر غالب کہہ سکیں۔

البتہ اسپینگلر نے مغربی طاقت کے زوال کی جو پیش گوئی کی تھی وہ مکمل طور پر غلط نہیں تھی۔ انیسویں صدی کے مقابلے میں بیسویں

صدی میں مغرب کمزور تھا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں مغرب بیسویں صدی کے مقابلے زیادہ کمزور ہے۔ انیسویں صدی میں مغرب کا جو خود اعتمادی رجحان تھا وہ بیسویں صدی میں بتدریج کم ہوتا گیا۔ اسپینگلر جو ایک دور اندیش مفکر اور مشاہدکار تھا۔ خود اعتمادی میں گراوٹ کو غور کرنے میں ناکام نہیں رہا۔ اپنی اس بصیرتوں کو اس نے ''زوال'' (decline) کے تصور میں شامل کیا۔ اس کی سب سے اہم خامی یہ تھی کہ اس نے اپنی صحیح بصیرت کے ادراک کو ایک جھوٹی منطق سے جوڑا یعنی ایک ایسی منطق جس کے تحت انسانی ثقافتیں حیاتی اجسام کے طور پر کام کرتے ہیں۔

ایک اور ادراکی بصیرت جو اسپینگلر نے فراہم کی لیکن اس کے وقت کوئی اور مفکر فراہم نہ کر سکا۔ *Decline* کے آخری حصے میں جس کا عنوان *The Machine* ہے اور پھر ایک اور کتاب جس کا عنوان *Man and Technics* ہے۔ اسپینگلر نے *Work of Men* کے متضاد نظریہ پیش کیا۔ ٹکنالوجی پر مبنی سماج کی ترقی سے انسان ایسے کام انجام دیتا ہے جو مصنوعی اور غیر فطری ہوتے ہیں۔ اسپینگلر کا کہنا تھا کہ انسان کی ٹریجیڈی کی شروعات یہیں سے ہوئی ہے کیونکہ فطرت (Nature) مصنوعیت کے مقابلے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ فطرت کے خلاف جنگ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اس جنگ کو آخری حد تک لڑا جانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر موجودہ موسمی تبدیلی کا بحران اسپینگلر کے تئیں تنقید اور خدشات کو ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

9.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے سیکھا کہ اوسوالڈ اسپینگلر نے کس طرح مغرب کے بطور تہذیب زوال پر بحث اور تشریح کی۔ آپ نے تاریخ، سوسائٹی اور کلچر کے بارے میں اس کے خیالات کو سمجھا۔ آپ نے یہ بھی سمجھا کہ اسپینگلر کی کتاب نے بہت ہی قلیل مدت میں کس طرح شہرت حاصل کی اور مغربی اسکالروں کے درمیان موضوع بحث بنی۔ آپ نے جمہوریت اور اس کی ضرورت کے بارے میں اسپینگلر کے خیالات سے بھی واقفیت حاصل کی۔ آپ پر یہ واضح ہو گیا کہ باوجودیکہ اسپینگلر کے خیالات اور تشریح بلاشبہ پُرکشش تھی، لیکن اس کی اپنی کمیاں اور خامیاں بھی پائی جاتی تھیں جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں اسکالروں نے اس پر تنقید کی۔

9.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

تاریخ کا استوائی طرز : (Linear Theory of History) تاریخ کے تئیں وہ نظریہ جو کہ تاریخی اعتبار سے ماضی کو تین ادوار قدیم، وسطیٰ اور جدید میں تقسیم کرتا ہے۔

اگادر تنازعہ : (Agadir crisis) جسے دوسرا مراقش تنازعہ بھی کہا جاتا ہے، اس وقت رونما ہوا جب جولائی 1911 میں بحر اوقیانوس میں واقع مراقش کی بندرگاہ کو جرمنی نے بندوق والی کشتی (Gun Boat) روانہ کی تا کہ اپریل 1911 میں مراقش میں فرانسیسی دستے کو چیلنج کیا جاسکے

9.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. *The Decline of the West* کے مصنف کون ہیں؟
2. *The Decline of the West* کتنی جلدوں میں شائع ہوئی؟
3. *The Decline of the West* کس زبان میں اصلاً لکھی گئی۔
4. "اگادر تنازعہ" (Agadir Crisis) سے کیا مراد ہے؟
5. تاریخ کے خطی نظریہ (Linear View) سے کیا مراد ہے؟
6. اسپینگلر نے تاریخ کی تقسیم کن بنیادوں پر کی؟
7. *Man and Technics* کے مصنف کون ہیں؟
8. *The End of History and the Last Man* کے مصنف کون ہیں؟
9. *A Study of History* کے مصنف کون ہیں؟

9.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اسپینگلر کے کام کے سیاسی پس منظر پر نوٹ لکھیے۔
2. اسپینگلر کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ پر بحث کیجیے۔
3. ثقافتی امتیازات کی علامات پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. اسپینگلر کے پیش کردہ جدید مغربی کلچر کے چار اہم مدارج پر نوٹ لکھیے۔
5. اسپینگلر نے انسانی فطرت کا ادراک کس طرح کیا؟

9.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اسپینگلر کے خلاف پیش کی گئی تنقیدوں پر بحث کیجیے۔
2. اسپینگلر کے سیاسی قدامت پسند پیش رو شخصیات پر مضمون لکھیے۔
3. اسپینگلر نے کیوں 'کلچر' کو تاریخی تجزیہ کی ایک قسم قرار دیا؟

9.18 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Engels, David, 'Oswald Spengler and the Decline of the West,' in Mark Sedgwick (ed.), *Key Thinkers of the Radical Right: Behind the New Threat to Liberal Democracy*, New York, Oxford University Press, 2019.
2. Frye, Northrop, 'The Decline of the West by Oswald Spengler,' *Daedalus* (Cambridge, Mass), Volume 103, No.1, Winter 1974.
3. Fukuyama, Francis, *The End of History and the Last Man*, New York, Free Press, 1992.
4. Hughes, H. Stuart, *Oswald Spengler: A Critical Estimate*, New York, Charles Scribner's Sons, 1962.
5. Huntington, Samuel P., *The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order*, New York, Simon & Schuster, 1996.
6. Michels, Robert, *Political Parties: A Sociological Study of the Oligarchical Tendencies of Modern Democracy*, London, Jarrold, 1916.
7. Spengler, Oswald, *The Decline of the West*, New York, Knopf, 1932 (translation from German to English by Charles Francis Atkinson).
8. Spengler, Oswald, *Man and Technics: A Contribution to a Philosophy of Life*, New York, Knopf, 1932.
9. Toynbee, Arnold, *A Study of History*, New York, Oxford University Press, 1947.

اکائی 10۔ آرنلڈ جوزف ٹوائن بی اور تہذیبوں کی تاریخ

(Arnold Joseph Toynbee and the History of Civilizations)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 آرنلڈ ٹوائن بی کا تعارف

10.3 ٹوائن بی کا نظریہ تہذیب

10.3.1 تہذیب، چیلنج ورد عمل

10.3.2 عالمگیر ریاست

10.3.3 تہذیبی دائرہ حیات

10.3.4 تہذیب کا انحطاط

10.3.5 تخلیقی اقلیت

10.3.6 مذہب اور روحانیت

10.3.7 مشکل کی گھڑی

10.3.8 زوال پذیر اور ناکام تہذیبیں

10.3.9 چیلنجز مواقع کے طور پر

10.4 تنقید اور تنازعات یا چیلنج اور رسپانس تھیوری کی تنقید

10.5 اثر اور میراث

10.6 چیلنج اور رد عمل نظریہ کی طاقت

10.7 چیلنج اور رد عمل نظریہ کی مطابقت اور اطلاق

10.8 آرنلڈ ٹوائن بی کے کام کے بارے میں کچھ اہم نکات

10.9 اکتسابی نتائج

10.10 کلیدی الفاظ

10.11 نمونہ امتحانی سوالات

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید (Introduction)

آرنلڈ جوزف ٹوائن بی (1889–1975) ایک تاریخ دان اور فلسفی تھے انھوں نے تاریخ اور تہذیب پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ان کا فلسفہ، فکر، تاریخی تجزیے، تہذیبوں اور ان کے عروج وزوال کے مطالعہ کے گرد گھومتا ہے۔ٹوائن بی کے نظریات نے، بشریات اور بین الاقوامی تعلقات کے شعبوں کو متاثر کیا خصوصاً تاریخ پر ان کے نظریات کا گہرا اثر پڑا اور یہ نظریات علمی بحثوں کا موضوع بنے ہوئے ہیں ۔ان کے فلسفے اور فکر کا ایک جامع جائزہ پیش کرنے کے لیے ان کے کلیدی تصورات، طریقہ کار، تنقید اور تاریخ کے مطالعہ پر اثرات کا احاطہ کرنے کی ضرورت ہے۔آرنلڈ ٹوائن بی کا "چیلنج ورد عمل " نظریہ ایک تاریخی ڈھانچہ ہے جو چیلنجوں اور ان پر قابو پانے کے لیے معاشروں کے تیار کردہ ردعمل کے درمیان تال میل کے ذریعے تہذیبوں کے عروج وزوال کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ نظریہ ٹوائن بی نے اپنی یادگار تصنیف "اے اسٹڈی آف ہسٹری "(تاریخ کا مطالعہ) میں پیش کیا ہے جو 1934 اور 1961 کے درمیان شائع ہوئی۔ٹوائن بی کے لیے اس منصوبے کو شروع کرنے کا سب سے بڑا محرک 1914 کے بعد تہذیب کی بقا کا خطرہ تھا۔انہوں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے کام شروع کیا کہ کچھ تہذیبیں کیوں پروان چڑھتی ہیں جب کہ دیگر کیوں فنا ہو جاتی ہیں۔ان کا کام تاریخ، مختلف تہذیبوں کی ابتدا، ترقی اور ترقی کے ساتھ ساتھ ٹوٹ پھوٹ کے بارے میں ایک فلسفیانہ تحقیق تھی۔اس کی اصل میں سائیکلیکل تھیوری تھی۔ٹوائن بی کا نظریہ وسیع ہے اور اس میں تاریخی، ثقافتی اور سماجی عوامل پر ایک وسیع مواد شامل ہے۔ اس باب میں ،"چیلنج ورد عمل" نظریہ کے کلیدی تصورات اور اصولوں کا جائزہ لیں گے،اس کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تلاش کریں گے اور تہذیبوں کے ارتقاء کو سمجھنے میں اس کی مطابقت کا جائزہ لیں گے۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے سے طلباء کو درج ذیل نکات سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

- انسانی تہذیب اور اس کی نشو ونما کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔
- سائیکلیکل تھیوری کی اہمیت کو سمجھ جائیں گے۔
- تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت عالمی تناظر کی ضرورت پر زور ٹوائن بی نے کیوں دیا،اس سے طلباء واقف ہو جائیں۔
- کس طرح ٹوائن بی نے مختلف معاشروں اور ثقافتوں کے تقابلی تجزیہ کی وکالت کی ہے،اس سے طلباء واقف ہوں گے۔

10.2 آرنلڈ ٹوائن بی کا تعارف (Introduction to Arnold Toynbee)

ٹوائن بی 14 اپریل 1889 کو لندن، انگلینڈ کے ایک دانشور خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم بالیول کالج، آکسفورڈ میں ہوئی تھی۔ بعد میں انہوں نے کنگز کالج، لندن میں بطور لیکچرر خدمات انجام دیں اور انہیں رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز (چیتھم ہاؤس) میں ڈائریکٹر آف اسٹڈیز کے طور پر مقرر کیا گیا۔ ان کا انتقال 22 اکتوبر 1975 کو ہوا، لیکن ان کے نظریات اور تحریروں پر تاریخ دانوں، فلسفیوں اور سماجی سائنسدانوں کی طرف سے مطالعہ اور بحث جاری ہے۔

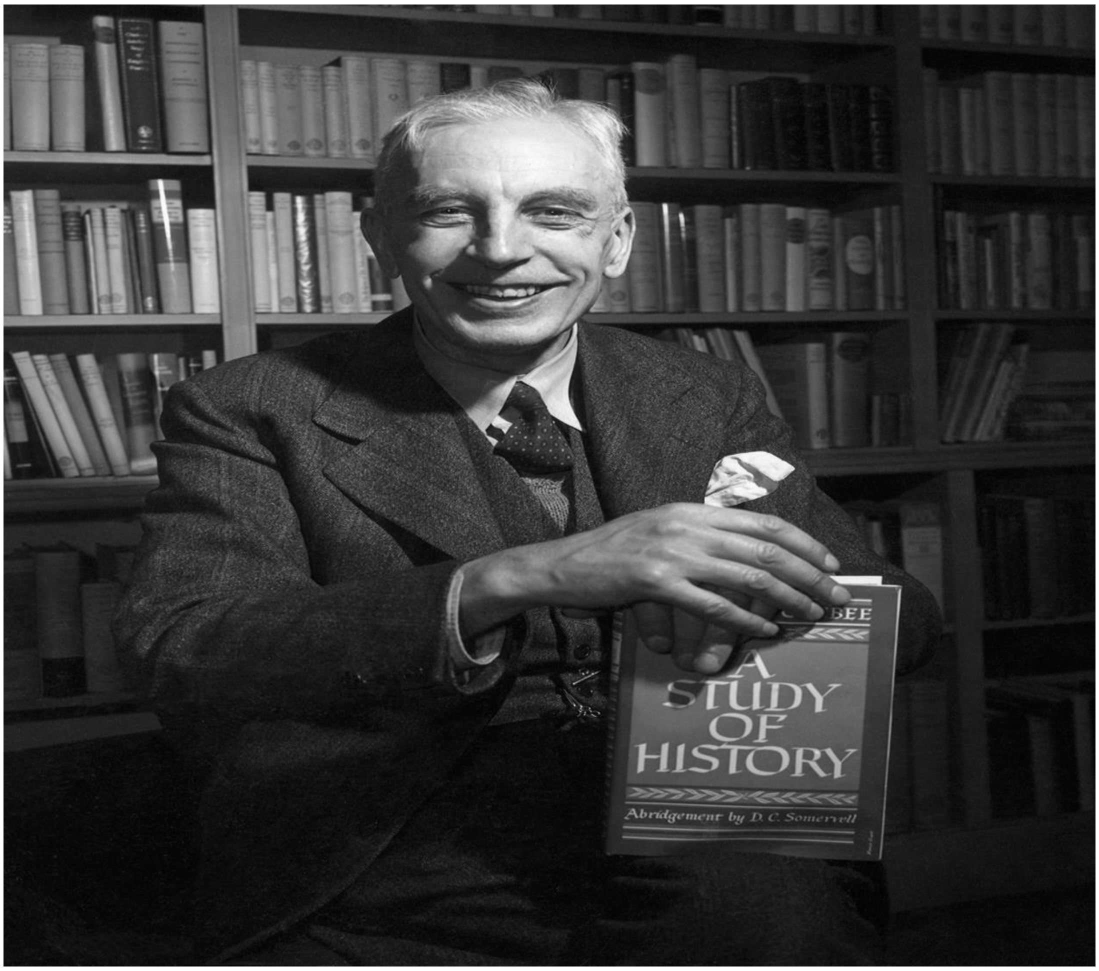

Arnold Joseph Toynbee (1889-1975)

Source: https://www.britannica.com/biography/Arnold-J-Toynbee

10.3 ٹوائن بی کا نظریہ تہذیب (Toynbee's Theory of Civilisation)

ٹوائن بی کا نظریہ تہذیبوں کی چکراتی نوعیت کے گرد گھومتا ہے، جس کا تجزیہ اس نے پوری تاریخ میں مختلف معاشروں اور ثقافتوں کے تقابلی مطالعہ کے ذریعے کیا۔ اس کے نظریہ کا خلاصہ درج ذیل اہم نکات میں کیا جا سکتا ہے:

10.3.1 تہذیب، چیلنج ورد عمل (Civilisation: Challenge-Response)

ٹوائن بی نے تہذیب کا مطالعہ انسانی تاریخ کے ایک حالیہ رجحان کے طور پر کیا۔ان کی رائے تھی کہ قدیم معاشروں سے تہذیبوں کی ابتداء کے پیچھے دو عوامل کارفرما تھے: اشرافیہ (یا تخلیقی اقلیت) کا وجود اور ایک متوازن ماحول جو نہ تو بہت زیادہ عمل کو فروغ دیتا ہے اور نہ ہی بہت سست مزاج کو۔ ٹوائن بی نے یہ نظریہ دیا کہ 'چیلنج اور رسپانس' وہ چیز ہے جو تہذیب کی ابتدا کے پیچھے ہے۔اس نے تخلیق کو تصادم کا نتیجہ سمجھا جب کہ ابتداء کو تعامل کا نتیجہ۔اس نے افریقی دلدل کی مثال دی جہاں صرف وہی لوگ بچ گئے جو نیل کے ڈیلٹا کے قریب دلدل اور جنگلوں کے قریب رہ رہے تھے ان تمام دلدلوں اور جنگلوں کو نکال کر اور صاف کر کے مصری تہذیب کی ابتداء ہوئی تھی۔

ٹوائن بی کے نظریہ "چیلنج اور رد عمل" کے تصور کا خلاصہ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

ٹوائن بی نے تہذیب کو ایک سماجی اکائی کے طور پر بیان کیا جس کی ایک الگ ثقافتی اور روحانی شناخت ہے۔اس نے پوری انسانی تاریخ میں مختلف تہذیبوں کی نشاندہی کی، جیسے مغربی، اسلامی، ہندوستانی اور چینی تہذیبیں۔ ٹوائن بی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ تہذیبیں وقت کے ساتھ ساتھ چیلنجوں کا ایک سلسلہ وار تجربہ کرتی ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبیں اپنے ماحول کی طرف سے پیش کردہ چیلنجوں کے جواب میں عروج و زوال کا شکار ہوتی ہیں۔ایک تہذیب کو اندرونی یا بیرونی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کے استحکام، ترقی، یا وجود کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ یہ چیلنجز مختلف شکلوں میں آ سکتے ہیں۔ یہ چیلنجز بیرونی ہو سکتے ہیں (جیسے فوجی خطرات، ماحولیاتی تبدیلیاں، سیاسی یا معاشی دباؤ) یا اندرونی (جیسے اخلاقی اور سماجی یا ثقافتی تنزل)۔ ٹوائن بی نے دلیل دی کہ تہذیب کی تقدیر ان چیلنجوں کے جواب پر منحصر ہے۔ ایک کامیاب تہذیب چیلنجوں کا تخلیقی اور موافقت کے ساتھ جواب دے گی، اختراعی حل تلاش کرے گی اور چیلنجوں سے مؤثر طریقے سے نمٹنے کے لیے اپنے اداروں، اقدار اور طریقوں کو ڈھال لے گی۔ کسی تہذیب کی کامیابی یا ناکامی کا تعین اس کی ان چیلنجوں کا موثر جواب دینے کی صلاحیت سے ہوتا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے، تہذیبیں تخلیقی رد عمل پیدا کر کے جواب دیتی ہیں۔اس میں قیادت، سماجی ہم آہنگی اور چیلنجوں پر قابو پانے کے لیے جدت کا امتزاج شامل ہے۔ کامیاب جوابات ترقی اور ترقی کا باعث بنتے ہیں۔

10.3.2 عالمگیر ریاست (The Universal State)

ٹوائن بی "عالمگیر ریاست" کے تصور پر یقین رکھتا تھا، جہاں اس کا مقصد وقت اور جگہ میں مختلف تہذیبوں کے مشترکہ نمونوں اور تجربات کو سمجھنا تھا۔اس نے ایک جامع تاریخی تفہیم پیدا کرنے کے لیے مغربی اور غیر مغربی دونوں تہذیبوں کے مطالعہ کی اہمیت پر زور دیا۔تاریخ کے بارے میں ٹوائن بی کا نقطہ نظر اس لحاظ سے "آفاقی" تھا کہ اس کا مقصد ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرنا تھا جس کا اطلاق تمام انسانی تہذیبوں پر کیا جا سکے، چاہے وہ ان کے جغرافیائی محل وقوع یا تاریخی تناظر سے قطع نظر ہو۔اس کا خیال تھا کہ تاریخ میں مشترکہ نمونوں کی نشاندہی کر کے، انسانی ترقی کے وسیع تر راستے پر بصیرت حاصل کرنا ممکن ہے۔اس نے تہذیبوں کی دو اہم اقسام میں درجہ بندی کی "عالمگیر ریاستیں" اور "عالمگیر گرجا گھر"۔ عالمگیر ریاستیں سیاسی اور فوجی طاقت سے متصف ہوتی ہیں، جبکہ عالمگیر گرجا گھروں کی تعریف مشترکہ روحانی عقائد اور اقدار سے ہوتی ہے۔اس نے تجویز کیا کہ تہذیبیں اکثر اپنی زندگی کے دوران ایک قسم سے دوسری قسم میں منتقل ہوتی ہیں۔

کچھ معاملات میں، ایک تہذیب چیلنجوں کے جواب کے طور پر ایک عالمگیر ریاست یا سلطنت تشکیل دے سکتی ہے۔ یہ ریاست متنوع خطوں کو ایک واحد حکومتی ڈھانچے کے تحت متحد کرنے کی کوشش کرتی ہے، جو استحکام کے ادوار کا باعث بن سکتی ہے لیکن انفرادی ثقافتی تنوع اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی محدود کر سکتی ہے۔ عالمگیر ریاست طاقتور ہستی ہے جو اکثر تہذیب کے زوال کے دوران ابھرتی ہے، جس کا مقصد ہے متنوع خطوں اور لوگوں کو ایک مشترکہ جھنڈے کے نیچے متحد کرنا۔

10.3.3 تہذیبی دائرہ حیات (Civilisational Life-Cycle)

ٹوائن بی کے سب سے زیادہ بااثر تصورات میں سے ایک یہ خیال ہے کہ تہذیبیں ترقی، پختگی، زوال اور آخر کار ٹوٹ پھوٹ کے طرز زندگی سے گزرتی ہیں۔ اس نے تہذیبوں میں چیلنج ورد عمل اور حتمی ٹوٹ پھوٹ کے بار بار چلنے والے نمونوں کی نشاندہی کی۔ جیسے جیسے تہذیبیں چیلنجز کا کامیابی سے جواب دیتی ہیں، وہ ترقی اور توسیع کے دور کا تجربہ کرتی ہیں۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ، وہ تخلیقی رد عمل جو مسلسل ترقی کرتے تھے، سخت روایات بن جاتے ہیں جو مزید موافقت میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ زوال کی مدت اور حتمی خاتمے کی طرف جاتا ہے۔ ٹوائن بی نے یہ بھی نوٹ کیا کہ تہذیبیں دستبرداری اور تجدید کے چکر سے گزر سکتی ہیں۔ چیلنج کے وقت، ایک تہذیب سکڑ سکتی ہے اور زیادہ انتشار کا شکار ہو سکتی ہے۔ تاہم، اگر یہ ایک نئی تخلیقی اقلیت پیدا کرنے کا انتظام کرتا ہے، تو یہ تجدید اور احیاء کے دور کا تجربہ کر سکتا ہے۔

تاریخ دانوں نے طویل عرصے سے تاریخ کی سائیکلیکل اکائی کو سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بار بار چلنے والی تاریخ ہے جو اپنے آپ کو دہراتی ہے، تمام مراحل ایک چکر سے دوسرے چکر تک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اوسوالڈ اسپینگلر نے استدلال کیا کہ خود مختار قومی ریاست تاریخ کی سائیکلیکل اکائی ہے، جس میں قومی ریاستیں جنم لیتی ہیں، جوانی سے ابھر کر عالمی طاقت کے مقام پر پہنچتی ہیں اور پھر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ قومی ریاستیں عالمی سطح پر اپنے لمحے کے بعد غائب نہیں ہوئیں بلکہ صرف "صرف ایک اور ملک" بن گئیں۔ قومی ریاستوں کے پروان چڑھنے اور اقتدار میں آنے کا یہ تصور ہیگل اور "عالمی روح" کے بارے میں اس کے نظریات سے متعلق ہے۔ تاریخ کے کسی بھی لمحے، ہیگل نے استدلال کیا کہ، ایک مخصوص قومی ریاست "عالمی روح" بن جاتی ہے اور اس وقت اس کے نظریات اور اعمال دنیا پر حاوی ہوتے ہیں۔ وہ قوم اس وقت تک غلبہ حاصل کرتی رہتی ہے جب تک کہ ایک حریف قومی ریاست اقتدار میں نہیں آتی۔

برطانوی مؤرخ آرنلڈ جے ٹوائن بی نے دلیل دی کہ سائکلیکل تھیوری کی تاریخ "تہذیب" تھی، قومی ریاستوں کا ایک گروہ جس کے خیالات اور کام کرنے کے طریقے "نامی گرامی دنیا" پر حاوی ہوتے ہیں۔ اکثر ایک قومی ریاست تہذیب میں سب سے زیادہ طاقتور رہنما ہوتی ہے اور اس پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کی علامت کے طور پر آتی ہے۔ تسلط کے ایک طویل عرصے کے بعد، تہذیب کا زوال ہوتا ہے، دنیا ایک نچلی سطح کی تنظیم کی حالت میں چلی جاتی ہے اور انسانیت اگلی تہذیب کے ابھرنے اور ایک نئے دور کے شروع ہونے کا انتظار کرتی ہے۔ ٹوائن بی کے نظریہ میں "نامی گرامی دنیا" وہ قومیں ہیں جو تہذیب کے بارے میں جاننے اور غلبہ حاصل کرنے کی تکنیکی طاقت رکھتی ہیں۔ اس طرح میکسیکو میں مایا تہذیب نے کرہ ارض پر غلبہ حاصل نہیں کیا لیکن وہ اپنے آس پاس کی تمام دیگر قومی ریاستوں پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب

رہی جن کے بارے میں اسے معلوم تھا۔ ٹوائن بی نے انسانی تاریخ کے کئی سالوں کا مطالعہ کیااور آخر کار یہ نتیجہ اخذ کیاکہ وہاں 21 بڑی تہذیبیں تھیں۔قدیم دنیامیں مصر کی تین تہذیبیں سب سے اہم تھیں، مسیح کی پیدائش کے آس پاس کلاسیکی دور میں ہیلینک تہذیب (یونان اوررومی سلطنت)اور موجودہ مغربی تہذیب۔ایک قومی ریاست کی قیادت میں چلنے والی تہذیب کی عمر طویل ہوسکتی ہے،جو سینکڑوں سال تک چل سکتی ہے۔اس طرح یونانی تہذیب (یونان اورروم) پر 400 سال سے زائد عرصے تک رومی سلطنت کا غلبہ اور قیادت رہی۔ایک بات واضح ہے۔سیارہ زمین ماضی کے کھنڈرات سے بھری پڑی ہے۔تہذیبیں مصر میں اہرام،ایتھنز میں پارتھینون،روم میں رومن فورم، میکسیکو میں مایاکے کھنڈرات اور پیرو میں انکاکے کھنڈرات بہت سی مثالوں میں سے چندایک ہیں۔ایک تعداددنیاکے مشہور سیاحوں کی توجہ کامرکز بن چکی ہے۔یونانی اور رومی آرنلڈ جے ٹوائن بی نے لکھاہے کہ کوئی بھی یونانیوں اوررومیوں کا مطالعہ کرکے تہذیبوں کے چکر کے بارے میں جاننے کے لیے سب کچھ سیکھ سکتاہے۔ ان دو قومی ریاستوں نے جس تہذیب کا غلبہ حاصل کیا۔ وہ بحیرہ روم کا طاس اور یورپ ہیں۔تقابلی طور پر،یہ ہیلینک تہذیب(یونان اور رومی سلطنت) ہے۔ روم نے بالآخر یونان کو شکست دے کر متحد تہذیب کی تخلیق کی جس ے رومن ایمپائر کے نام سے جاناجاتاہے۔دنیاعام طور پر پرامن ہوگئی، لیکن روم کو مختلف باغی گروہوں کے ساتھ مقابلہ کرناپڑا، سلطنت کے اندراوراس کے اطراف میں،جو کام کرنے کے یونانی-رومن طریقے کے مطابق نہیں ہوناچاہتے تھے۔ان باغی گروہوں نے بالآخر روم کا تختہ الٹ دیااوراس کے نتیجے میں یورپی عہد وسطیٰ کے نام سے وجود میں آیا۔

مغربی تہذیب بدقسمتی سے ٹوائن بی نے اسکے نام کے لیے "مغربی" کاانتخاب کیا۔وہ تہذیب جو یورپی عہد وسطیٰ سے نکلی۔یہ انتخاب بدقسمتی کا تھاکیونکہ لفظ "مغربی" 1800 اور 1900 کی دہائی کے اوائل میں یورپی سامراج کے ساتھ جڑاہوا تھا۔21ویں صدی تک یہ لفظ بعض گروہوں کے لیے منفی معنی میں تبدیل ہوچکااور مختلف حلقوں میں اس نے فکری طور پر کافی حدتک حملہ کیا۔ٹوائن بی کے مطابق،اٹلی نے تخلیقی اقلیت فراہم کی اور مغربی تہذیب کو جنم دیا۔یہ "اطالوی" دور تھا۔یہ نشاۃ ثانیہ اور اصلاح کے وقت رونماہوا۔ تخلیقی اقلیت نے سائنسی سوچ اور تکنیکی ترقی کا استعمال کرتے ہوئے مذہبی اور روایت کے زیر اثر چیزوں کو کرنے کے طریقوں سے الگ ہوناشروع کیا۔یہ جغرافیائی کھوج کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے تجربات کے دور کا آغاز تھا۔ایک سرمایہ دارانہ معیشت نے ترقی کی جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمہوری حکومتوں کے ذریعے بہت سے معاملات میں ریگولیٹ ہوتی گئی۔وہاں اس طرح بادشاہتوں کے ساتھ ساتھ عظیم جمہوریتوں کا عروج ہوا۔

ٹوائن بی نے صنعت کاری اور جمہوریت کو مغربی تہذیب کی دو بڑی پیشرفت کے طور پر دیکھا۔اس نے لکھا کہ مغربی صنعت کار اور تکنیکی ماہرین مغربی اقدار کو مغربی اقوام اور فوجوں سے زیادہ پھیلاتے ہیں۔ انہوں نے مغربی تہذیب میں جمہوریت کی پیدائش کا سراغ انگلینڈ میں پارلیمنٹ کی ترقی سے لیا۔ان کا خیال تھاکہ "جمہوریت انسانی ہمدردی کا سیاسی اظہار ہے۔" انہوں نے مغربی تہذیب کو ایک عالمی رجحان قرار دیا۔شروع میں بہت سی قومی ریاستیں تھیں،لیکن جنگوں کا ایک طویل سلسلہ جس میں دو عظیم عالمی جنگیں بھی شامل تھیں ان کے نتیجے میں 1945 میں دو بڑی اور آبادی والی قومی ریاستوں،ریاستہائے متحدہ اور سوویت یونین میں طاقت کا ارتکاز ہوا۔ان دو عظیم "عالمی طاقتوں" کے

درمیان مقابلہ اقتصادی توسیع کے ساتھ ساتھ فوجی ہتھیاروں تک پھیلا ہوا ہے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران جوہری اور ہائیڈروجن ہتھیاروں کی ترقی کی وجہ سے، دو قومی ریاستوں کے درمیان متوقع حتمی تصادم (تہذیب پر واحد قومی ریاست کا کنٹرول قائم کرنے کے لیے) تباہ ہونے والے شہروں اور انسانی ہلاکتوں کے حوالے سے سوچنا خوفناک تھا۔ 1945 سے 1991 تک، 46 سال کا عرصہ، یہ دو بڑی طاقتیں ،سوویت یونین اور ریاستہائے متحدہ، ''معروف دنیا'' (اب پوری کرہ ارض) کے کنٹرول کے لیے لڑے۔ان دونوں قومی ریاستوں کے پاس ایٹم اور ہائیڈروجن ہتھیار دستیاب اور استعمال کے لیے تیار تھے۔یہ صورتحال ٹوائن بی کی "مشکل کی گھڑی" کی تعریف پر پوری طرح پوری اترتی ہے۔ریاستہائے متحدہ، 1991 سے، ٹوائن بی طرز کی "عالمگیر ریاست" کے پہلے سالوں میں پورے کرہ ارض کی قیادت کر رہا ہے۔جیسا کہ ٹوائن بی نے پیش گوئی کی تھی، ریاستہائے متحدہ کویت، عراق اور افغانستان جیسی جگہوں پر تہذیب کے کنارے پر چھوٹی چھوٹی جنگوں سے پریشان ہے۔امریکہ کو شمالی کوریا اور ایران میں پریشان کن اور باغی چھوٹی طاقتوں سے نمٹنا پڑا ہے۔لیکن یہ عظیم قومی ریاست کا مخصوص کردار ہے جو کسی تہذیب کے آخری عالمگیر ریاست کے مرحلے پر حکمرانی کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

10.3.4 تہذیب کا انحطاط (Civilisational Disintegration)

ٹوائن بی کا تجزیہ کہ جیسے جیسے تہذیب اپنے زوال کے دور میں داخل ہوتی ہے، اسے اندرونی کشمکش اور بیرونی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر، ٹوٹ جاتا ہے. تاہم انہوں نے "تخلیقی اقلیتوں" کے کردار پر روشنی ڈالی جو تہذیب کی ترقی کو آگے بڑھاتی ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تاثیر کھو سکتی ہیں۔جب تک کہ ایک تخلیقی اقلیت اپنے وقت کے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ابھرے۔ خرابی اس وقت ہوتی ہے جب تہذیب چیلنجوں کا مؤثر طریقے سے جواب نہیں دے سکتی، جو اس کے خاتمے کا سبب بنتا ہے۔

10.3.5 تخلیقی اقلیت (Creative Minority)

ٹوائن بی نے ''تخلیقی اقلیت'' کا تصور متعارف کرایا۔یہ اقلیت اختراعی اور موافق افراد پر مشتمل ہے جو چیلنج کے وقت قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں۔اس سے مراد معاشرے کے اندر افراد کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو ایک منفرد نقطہ نظر اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں جو انہیں تہذیب کو درپیش چیلنجوں سے نمٹنے کی اجازت دیتا ہے۔وہ قیادت اور اختراعی حل فراہم کرتے ہیں، جو اکثر ترقی اور تبدیلی کے دور میں تہذیب کی رہنمائی کرتے ہیں۔ٹوائن بی نے 'ایتھری سازی' کا تصور بھی دیا جس کے مطابق ترقی تکنیکوں کو آسان بنانے کے ساتھ آتی ہے۔ان کے مطابق ترقی کی ابتدا اشرافیہ یا تخلیقی اقلیتوں سے ہوتی ہے۔یہ بات دلچسپ ہے کہ ٹوائن بی کے مطابق بہت سی تہذیبوں کے ٹوٹنے کے پیچھے معاشی استدلال اور تعیناتی وضاحتیں درست نہیں ہیں۔وہ درحقیقت اس رائے کا حامل تھا کہ اندرونی بے چینی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تخلیقی اقلیت مجبور ہو کر غالب ہو جاتی ہے تو بے عقل Proletariat ان سے الگ ہو جاتا ہے اور خود ارادیت کی راہ کھو دیتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب تہذیبیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ٹوائن بی کے خیال میں صرف مغربی تہذیب ہی باقی رہ گئی ہے باقی تمام تہذیبیں یا تو ٹوٹ چکی ہیں یا اس کے آثار ختم ہو رہے ہیں۔ٹوائن بی کے بہت سے نقاد تھے۔

10.3.6 مذہب اور روحانیت (Religion and Spirituality)

ٹوائن بی کا خیال تھا کہ مذہب اور روحانیت نے تہذیبوں کی تقدیر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے تہذیبوں کے اندر ثقافتی اور مذہبی تقسیم کے اثرات پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ جب یہ تقسیم بہت زیادہ اہم ہو جاتی ہے تو یہ تہذیب کے زوال میں معاون ہو سکتی ہے۔ تاہم مذہبی نظریات اور طرز عمل کو تہذیب کے چیلنجوں کا مؤثر جواب دینے کی صلاحیت کے لیے لازمی طور پر دیکھا۔

10.3.7 مشکل کی گھڑی (Time of Troubles)

اگر کوئی تہذیب چیلنجوں کا مؤثر جواب دینے میں ناکام رہتی ہے، تو وہ "مصیبتوں کے وقت" میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے کے دوران، قائم شدہ ادارے اور اقدار ناکافی ہو سکتے ہیں، جو سماجی ٹوٹ پھوٹ، بدامنی اور ممکنہ زوال کا باعث بن سکتے ہیں۔

10.3.8 زوال پذیر اور ناکام تہذیبیں (Arrested and Failed Civilisations)

بعض صورتوں میں، ایک تہذیب کو اس کے زوال کے دوران "گرفتار" کیا جا سکتا ہے، جہاں وہ مستحکم ہونے کا انتظام کر لیتی ہے لیکن اپنی سابقہ قوت کو دوبارہ حاصل نہیں کر پاتی ہے۔ زیادہ شدید صورتوں میں، تہذیبیں مکمل طور پر ناکام ہو سکتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

10.3.9 چیلنجز مواقع کے طور پر (Challenges as Opportunities)

ٹوائن بی نے چیلنجوں کو نہ صرف خطرات بلکہ تجدید اور ترقی کے مواقع کے طور پر دیکھا۔ کامیاب تہذیبیں وہ ہوتی ہیں جو تخلیقی طور پر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھل سکتی ہیں اور ترقی کی نئی راہیں تلاش کر سکتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی کامیاب تہذیب کا عروج اپنے وقت کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہونے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ وہ تہذیبیں جو ان چیلنجوں کا مؤثر جواب دینے میں ناکام رہتی ہیں انہیں زوال اور ممکنہ تباہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ٹوائن بی کے نقطہ نظر نے چیلنجوں، رد عمل اور تہذیبوں کی تقدیر کی تشکیل میں تخلیقی اقلیت کے اثر و رسوخ کے درمیان پیچیدہ تعامل کو سمجھنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے کام کا مقصد تہذیبوں کے عروج و زوال اور ان کی کامیابی یا ناکامی میں کردار ادا کرنے والے عوامل کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک جامع فریم ورک فراہم کرنا تھا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کا نظریہ ان کے اس عقیدے میں جڑا ہوا ہے کہ تہذیبوں کی کامیابی یا ناکامی پہلے سے طے شدہ نہیں ہے، بلکہ ان کی قسمت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ چیلنجز کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ان چیلنجوں کے جواب میں، معاشرے مخصوص رد عمل تیار کرتے ہیں۔ ٹوائن بی تین ممکنہ رد عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔

بہادرانہ رد عمل (Heroic Response)

اس منظر نامے میں، ایک معاشرہ ایک چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے، تہذیب کی اشرافیہ اور تخلیقی اقلیت مل کر رد عمل کا ایک نیا مجموعہ

تیار کرتی ہے۔اس سے پھر سے جوان ہونے اور نمو کی مدت ہو سکتی ہے، جو اکثر جدت، تلاش اور ثقافتی پھولوں کی خصوصیت ہے۔

نقلی رد عمل (Mimicry Response)

چیلنج سے براہ راست نمٹنے کے بجائے، ایک تہذیب دوسری کامیاب تہذیب کے طریقوں کی نقل کر سکتی ہے۔ یہ قلیل مدتی استحکام کا باعث بن سکتی ہے لیکن طویل مدت میں پائیدار نہیں ہو سکتی۔

علیحدگی کا رد عمل (Withdrawal Response)

ایک تہذیب خود کو الگ تھلگ کر کے یا دفاعی موقف اپنا کر چیلنج سے پیچھے ہٹنے کا انتخاب کر سکتی ہے۔ اگرچہ یہ تحفظ فراہم کر سکتا ہے، لیکن یہ جمود اور زوال کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

10.4 تنقید اور تنازعات یا چیلنج اور رسپانس تھیوری کی تنقید

(Criticisms and Controversies or, Critiques of the Challenge and Response Theory)

اگرچہ ٹوائن بی کے کام نے کافی توجہ اور تعریف حاصل کی، لیکن اسے تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کچھ مورخین اور دانشوران نے استدلال کیا کہ اس کا نقطہ نظر حد سے زیادہ متعصبانہ تھا اور یہ کہ اس کا ماڈل انفرادی تہذیبوں اور تاریخی واقعات کی انفرادیت کے لیے مناسب طور پر حساب نہیں رکھتا تھا۔ ناقدین نے متنوع معاشروں کی اتنی وسیع رینج پر ایک ہی ماڈل کو لاگو کرنے کی فزیبلٹی پر بھی سوال اٹھایا۔ مجموعی طور پر، آرنلڈ ٹوائن بی کے کاموں نے تاریخ، سماجیات اور تہذیبوں کے مطالعہ کے شعبوں میں ایک پائیدار میراث چھوڑی ہے۔ اس کے خیالات معاشروں کے عروج و زوال اور انسانی تاریخ کو تشکیل دینے والے چیلنجوں کے بارے میں بات چیت کی ترغیب دیتے رہتے ہیں ۔ٹوائن بی کے نظریہ کی علماء نے تعریف اور تنقید کی ہے۔ کچھ ناقدین کا استدلال ہے کہ اس کا نظریہ پیچیدہ تاریخی عمل کو زیادہ آسان بناتا ہے اور اس کی درجہ بندی ہمیشہ تمام تہذیبوں اور تاریخی حالات پر آسانی سے لاگو نہیں ہوتی۔ دوسرے لوگ تہذیبوں کی تقدیر کو تشکیل دینے میں نظریات، قیادت اور موافقت کے کردار پر اس کی توجہ کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ ٹوائن بی کے خیالات جہاں اثر انگیز اور فکر انگیز رہے ہیں، وہیں انہیں مختلف مورخین اور علماء کی تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ کچھ نے اس کے نظریات کی آفاقیت اور متنوع تہذیبوں کو عام کرنے کے اس کے رجحان پر سوال اٹھایا ہے۔

ایچ ای بارنس لکھتے ہیں: 'تہذیبوں کے عروج و زوال کا موازنہ کرنے کا ٹوائن بی کا تجویز کردہ پروگرام اس کے انتہائی مذہبی احاطے کی وجہ سے تباہ ہو گیا جس نے اس کے کام کو تاریخ بجائے نظریاتی بنا دیا'۔ بہت سارے ناقدین ایسے تھے جنہوں نے اس کے کام کو عیسائی اخلاقیات خیال کیا کیونکہ ٹوائن بی نے تہذیبوں کے ارتقاء اور انتہا کے لیے روحانی قوتوں کو کردار ادا کرنے پر غور کیا۔ اگرچہ بہت سے نقاد تھے، پھر بھی ایسے لوگ تھے جنہوں نے ٹوائن بی کی شاعری اور کاریگری کی تعریف کی۔

فرٹزسٹرن لکھتے ہیں: 'دانشور اس کو دیکھتا ہے اور اس کی بے وقوفی کو دیکھتا ہے، لیکن اسے ٹوائن بی کی کامیابی کے اسباب کا بھی اندازہ لگانا چاہیے، بجائے اس کے کہ کسی دوسرے فلسفی-پیغمبر کی نسبت کم نرمی ہو۔ فلسفیانہ وابستگی، جنہوں نے جنگ کے بعد کا سب سے مقبول نظام کھڑا کیا۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ ٹوائن بی کا کام تاریخ کی ایک نئی عالمگیر تفہیم کو گہرے تنگ یوروسینٹرک تاریخ نویسی کی جگہ، خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں تاریخ کی ایک نئی عالمگیر تفہیم کو تراشنے کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ آرتھر ماروک نے نوٹ کیا کہ: 'ہمیں ٹوائن بی سسٹم کے پورے صوفیانہ آلات کو نگلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہم شاید اس بات سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ، چیلنج اور جواب جیسے فریب دینے والے سادہ تصورات میں، ٹوائن بی نے حقیقت میں ماضی کے بارے میں ہماری سمجھ میں بہت حقیقی تعاون کیا ہے۔

یوروسینٹرزم (Eurocentrism)

ناقدین کا استدلال ہے کہ ٹوائن بی کا نظریہ یوروسینٹرک ہے اور مغربی تہذیبوں پر بہت زیادہ زور دیتا ہے، ممکنہ طور پر غیر مغربی معاشروں کی شراکت اور حرکیات کو نظرانداز کرتا ہے۔

تسہیل کا نمونہ (Simplicity of Model)

کچھ مورخین نے ٹوائن بی کے ماڈل پر تنقید کی ہے کہ وہ تہذیبوں کے مخصوص ردعمل میں نظریہ کی درجہ بندی پیچیدہ تاریخی حقائق کو زیادہ آسان بنا سکتا ہے اور عوامل کی باریک بینی کو پکڑنے میں ناکام ہو سکتا ہے۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ تمام تہذیبیں ان کے ماڈل میں صفائی کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتی ہیں۔

عقیدہ جبریت (Deterministic Tendencies)

تہذیبوں کی تشکیل میں چیلنجوں اور ردعمل کے کردار پر ٹوائن بی کے زور کو حد سے زیادہ عزم پرست ہونے اور انفرادی ایجنسی اور غیر متوقع واقعات کو کافی وزن نہ دینے پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

پیشین گوئی کی طاقت کا فقدان (Lack of Predictive Power)

ٹوائن بی کا نظریہ تہذیبوں کی مستقبل کی ترقی کی پیشین گوئی کرنے کی صلاحیت کو محدود کرتا ہے۔ یہ درست پیشین گوئی کرنے کے بجائے تجزیہ کے لیے زیادہ مفید ہے۔

10.5 اثر اور میراث (Impact and Legacy)

تاریخ نویسی (Historiography)

ٹوائن بی کے "تاریخ کا مطالعہ" نے تاریخ نویسی پر گہرا اثر ڈالا ہے، جس نے مورخین کو تنگ قومی تناظر سے باہر دیکھنے اور انسانی تاریخ کے وسیع نمونوں پر غور کرنے کی ترغیب دی ہے۔

بین الموضوعاتی نقطہ نظر(Interdisciplinary Approach)

ٹوائن بی کے کام نے تاریخ، فلسفہ اور سماجی علوم کے درمیان فرق کو ختم کیا۔ ان کے کثیر الثباتاتی نقطہ نظر نے علم بشریات، سماجیات اور مذہبی علوم سمیت مختلف شعبوں میں دانشوران کو متاثر کیا ہے۔

عالمی تناظر(Global Perspective)

مغربی اور غیر مغربی دونوں تہذیبوں کے مطالعہ پر زور دے کر، ٹوائن بی کے کام نے تاریخی تحقیق میں مزید عالمی تناظر میں حصہ لیا۔

بحث ومباحثہ (Debate and Discussion)

ٹوائن بی کے خیالات نے تاریخ دانوں، فلسفیوں اور علماء کے درمیان متعدد مباحث کو جنم دیا ہے۔ اس کے تصورات اب بھی تحقیق اور تعبیر کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ آخر میں، آرنلڈ ٹوائن بی کا فلسفہ اور فکر تاریخ اور تہذیبوں کے مطالعہ کے لیے ان کے اختراعی اندازِ فکر سے نمایاں ہے۔ چیلنج ورد عمل، تہذیبی طرز زندگی اور مذہب کے کردار، اس کے تصورات نے تاریخ کے میدان پر دیرپا اثر چھوڑا ہے۔ اگرچہ ان کے کام کو تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے، لیکن یہ تہذیبوں کے عروج وزوال کے مطالعہ میں ایک سنگ بنیاد ہے، جو انسانی تاریخ کی وسیع تر تفہیم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

10.6 چیلنج اور رد عمل نظریہ کی طاقت (Strengths of the Challenge and Response Theory)

جامع نقطہ نظر(Holistic Approach): ٹوائن بی کا نظریہ ثقافتی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور ماحولیاتی عناصر سمیت متعدد عوامل پر غور کرتا ہے، جو تہذیبوں کے عروج وزوال کا ایک جامع نظریہ پیش کرتا ہے۔

معرفت پر زور (Emphasis on Cognition): تہذیب کے چیلنج پر رد عمل پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے، یہ نظریہ تاریخ کی تشکیل میں انسانی معرفت کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ افراد اور معاشروں کے ذریعے کیے گئے انتخاب کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

موافقت اور لچک (Adaptability and Flexibility): یہ نظریہ رد عمل کے تنوع کا سبب بنتا ہے جو تہذیبیں اپنا سکتی ہیں، بقا اور نمو کے لیے ضروری خصوصیات کے طور پر موافقت اور لچک کو فروغ دیتی ہیں۔

تاریخی بصیرت (Historical Insight): ٹوائن بی کا تاریخی تجزیہ مختلف تہذیبوں کی حرکیات کے بارے میں قیمتی بصیرت فراہم کرتا ہے اور ان کی نشوونما میں نمونوں اور رجحانات کی شناخت میں مدد کرتا ہے۔

10.7 چیلنج اور رد عمل نظریہ کی معنویت اور اطلاق

(Relevance and Application of the Challenge and Response Theory)

اپنی کوتاہیوں کے باوجود، ٹوائن بی کا چیلنج اور رد عمل نظریہ تاریخی عمل اور حتیٰ کہ عصری واقعات کو سمجھنے میں مستقل مطابقت رکھتا

ہے۔ یہ نظریہ ہمیں چیلنجوں، رد عمل اور نتائج کے درمیان تعلق پر غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے جو کہ پیچیدہ مسائل جیسے کہ ماحولیاتی تبدیلی، تکنیکی ترقی اور عالمی تنازعات کا سامنا کر رہے معاشروں کے تناظر میں ہیں۔ آخر میں، آرنلڈ ٹوائن بی کی چیلنج اور رسپانس تھیوری ایک فکر انگیز عینک فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے ہم تہذیبوں کی ترقی اور ارتقاء کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ جب کہ نظریہ کو اس کی حدود کی وجہ سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، ان کا اداروں، موافقت اور تخلیقی اقلیتوں کے کردار پر زور انسانی تاریخ کی حرکیات کو سمجھنے کے لیے قابل قدر بصیرت فراہم کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی دنیا کی پیچیدگیوں کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں، ٹوائن بی کا نظریہ ہمیں اس بات پر غور کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ معاشرے کس طرح چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی تقدیر کو تشکیل دیتے ہیں۔

10.8 آرنلڈ ٹوائن بی کے کام کے بارے میں کچھ اہم نکات

(Some Key-Points about Arnold Toynbee, and His Work)

ٹوائن بی کا سب سے مشہور کام "اے اسٹڈی آف ہسٹری" (تاریخ کا مطالعہ) ہے، جو 1934 اور 1961 کے درمیان متعدد جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ انہوں نے "چیلنج اور رد عمل" کا تصور متعارف کرایا جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی تہذیب کی کامیابی یا ناکامی اس کی صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ وہ ان چیلنجوں کا مؤثر طریقے سے جواب دے سکتی ہے۔ اپنے تجزیے میں، ٹوائن بی نے "چیلنج اور رد عمل" کا تصور متعارف کرایا۔ انہوں نے استدلال کیا کہ تہذیب کی زندگی کا دار و مدار اس کی اندرونی اور بیرونی چیلنجوں کا مؤثر طریقے سے جواب دینے کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ یہ چیلنج سماجی، سیاسی، اقتصادی یا ماحولیاتی نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ کامیاب رد عمل ترقی اور ترقی کا باعث بنتے ہیں، جب کہ ناکام رد عمل زوال کا باعث بنتے ہیں۔ ٹوائن بی نے تہذیبوں کو اپنانے اور زندہ رہنے کے راستے کے طور پر چیلنجوں کے لیے تخلیقی رد عمل کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ تہذیبیں ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر زیادہ ہم آہنگی اور تعاون پر مبنی عالمی تہذیب کی طرف کام کر سکتی ہیں۔

"تاریخ کا مطالعہ" کے علاوہ، ٹوائن بی نے مختلف تاریخی، فلسفیانہ اور سیاسی موضوعات پر کئی دوسری کتابیں اور مضامین لکھے۔ وہ ایک قابل مفکر تھا جو اپنے بنیادی کام سے ہٹ کر بہت سے مضامین سے منسلک تھا۔ "تاریخ کا مطالعہ" کے علاوہ، ٹوائن بی نے بین الاقوامی تعلقات سے لے کر مذہبی علوم تک کے موضوعات پر متعدد کتابیں اور مضامین لکھے۔ وہ ایک ممتاز عوامی دانشور تھے اور جدید دنیا کو درپیش چیلنجز اور مواقع سمیت عالمی مسائل کے بارے میں بات چیت میں مصروف تھے۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے کام پر علمی حلقوں میں بحث ہوتی رہتی ہے، خاص طور پر تاریخ، سماجیات اور بین الاقوامی تعلقات کے شعبوں میں۔ اگرچہ اس کے نقطہ نظر کی اپنی حدود ہیں، تہذیبوں کے باہم مربوط ہونے اور تاریخی عمل کو سمجھنے کی اہمیت پر اس کا زور انسانی ترقی اور عالمی حرکیات کے بارے میں جاری بات چیت سے متعلق ہے۔ انکے کام نے تاریخ اور تہذیبوں کے مطالعہ پر ایک اہم اثر ڈالا ہے، جو ثقافتی ترقی، سماجی ترقی اور تہذیبوں کے عروج و زوال کا باعث بننے والے عوامل کے بارے میں اپنا موقف رکھتے ہیں۔ اپنی عظیم تخلیق کے علاوہ، ٹوائن بی نے تاریخ، مذہب اور فلسفہ پر کئی دوسری کتابیں اور مضامین لکھے جو ان کے کچھ قابل ذکر کاموں میں شامل ہیں:

(1922) *The Western Question in Greece and Turkey* : اس کتاب میں پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کے خاتمے اور یونان اور ترکی کے درمیان ہونے والے تنازعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(1934–1961) *A Study of History* : یہ 12 جلدوں پر مشتمل کام تاریخی فکر میں ٹوائن بی کی سب سے اہم شراکت ہے۔ ہر جلد میں مختلف تہذیبوں اور ان کے تعاملات کا احاطہ کیا گیا ہے، ان کے چیلنجوں، جوابات اور حتمی تقدیر پر بحث کی گئی ہے۔

(1948) *Civilization on Trial* : اس کتاب میں ٹوائن بی نے جدید مغربی تہذیب کو درپیش چیلنجوں اور روحانی تجدید اور اخلاقی تحفظات کی ضرورت پر غور کیا۔

(1976 *Mankind and Mother Earth: A Narrative History of the World* بعد از مرگ شائع ہوا، یہ تصنیف ''تاریخ کا مطالعہ'' سے ان کے خیالات کا زیادہ جامع اور قابل رسائی ورژن ہے۔

ٹوائن بی نے اکتوبر 1975 میں لندن میں آخری سانس لی۔ ان کے دیگر کاموں میں، نیشنلٹی اینڈ وار، ہیلینزم: اے اسٹری آف اے سولائزیشن، ایسٹ ٹو ویسٹ: اے جرنی راؤنڈ دی ورلڈ، خود نوشت اور سالانہ سروے آف انٹرنیشنل افیئر زہیں۔

10.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ٹوائن بی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ تہذیبیں چیلنجوں یا مسائل سے جنم لیتی ہیں اور ان چیلنجوں پر ان کے رد عمل ان کی ترقی کو تشکیل دیتے ہیں۔ انہوں نے تہذیبوں کی ترقی کے پیچھے انجن کے طور پر "چیلنج ردعمل" کے عمل کی نشاندہی کی۔ کسی تہذیب کے چیلنجوں سے مؤثر طریقے سے نمٹنے کی صلاحیت اس کی بقا اور ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ٹوائن بی نے مشورہ دیا کہ تہذیبیں عالمی سطح سے انخلاء اور اس کے بعد اثر ورسوخ کی طرف واپسی کے چکروں سے گزرتی ہیں۔ ٹوائن بی نے ثقافتی تبادلے کے کردار اور تہذیبوں کے درمیان ان کی ترقی کی تشکیل میں بات چیت پر زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ مختلف ثقافتوں کے درمیان ملاقاتیں قرض لینے، موافقت اور اختراع کے ایک متحرک عمل کا باعث بنتی ہیں، جو نئی تہذیبوں کے عروج میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ تاریخ کے بارے میں ٹوائن بی کا نقطہ نظر بین الموضوعاتی تھا، جس میں بشریات، فلسفہ، الہیات اور سیاسیات شامل تھے۔ اس کے اس اولوالعزم کام کی بڑی تعریف کی گئی اور اس کی عمومیت اور تمام تہذیبوں میں اپنے نظریات کو عالمی طور پر لاگو کرنے میں دشواری کے لیے تنقید کی گئی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ آرنلڈ ٹوائن بی کے نظریات پر برسوں سے بحث اور تنقید کی جاتی رہی ہے اور تاریخ دانوں کی نئی نسلوں نے تاریخ اور تہذیب کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے مختلف نقطہ نظر تیار کیے ہیں۔

10.10 کلیدی الفاظ (Key Words)

بشریات : انسانیت کا سائنسی مطالعہ ہے، جس کا تعلق انسانی رویے، انسانی حیاتیات، ثقافتوں، معاشروں اور لسانیات سے ہے۔

اشرافیہ : اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی طاقت کا استعمال، امراء، اعلی ترین اور دولت مند معاشرتی طبقات پر

مشتمل ہے۔

Proletariat	:	محنت کش طبقے کے لوگوں کو اجتماعی طور پر سمجھا جاتا ہے (اکثر مارکسزم کے حوالے سے استعمال کیا جاتا ہے)
تخلیقی اقلیت	:	ٹوائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب ہمیشہ کوئی تخلیقی اقلیت (creative Minority) پیدا کرتی ہے۔ یہ دراصل چیلنج کا جواب دینے کا عمل (Challenge-Response mechanism) ہے جو کسی قوم کا ابھرنا اور اس کو دنیا کا امام بناتا ہے۔
کھنڈرات	:	ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے نشان، کسی اجڑی ہوئی بستی کے آثار، اُجڑی بستی، ویرانی۔
یوروسینٹرزم	:	مغربی تہذیبوں پر بہت زیادہ زور دیتا ہے
تہذیب	:	تہذیب ایک پیچیدہ معاشرہ ہے جس کی خصوصیات ریاست کی ترقی، سماجی سطح بندی، شہری کاری، ایک کرنسی اور قدرتی بولی جانے والی زبان سے ہٹ کر مواصلات کے علامتی نظام سے ہوتی ہے۔

10.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. آرنلڈ ٹوائن بی کون تھا؟
2. ''اے سٹڈی آف ہسٹری'' کس کی تصنیف ہے؟
3. تاریخ نویسی کیا ہے؟
4. اے اسٹڈی آف ہسٹری (تاریخ کا مطالعہ) کب شائع ہوئی؟
5. آرنلڈ ٹوائن بی کس ملک میں پیدا ہوئے؟
6. تین تہذیبوں کے نام بتائے؟
7. یوروسینٹرزم کیا ہے؟
8. دوسری عالمی جنگ کب ہوئی؟
9. چیلنج اور ریسپانس تھیوری کس نے دی۔
10. مغربی تہذیب سے کون متاثر تھا؟

10.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. آرنلڈ ٹوائن بی کی کتاب "اے سٹڈی آف ہسٹری" کا مرکزی موضوع کیا ہے؟
2. آرنلڈ ٹوائن بی کا تہذیبی نظریہ کیا ہے؟

3. ٹوائن بی کی تاریخ میں کیا اہمیت ہیں۔وضاحت کریں۔

4. ’’تخلیقی اقلیت‘‘ کیا ہے؟

5. ٹوائن بی کا سماجی تبدیلی کا نظریہ کیا ہے؟

10.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ٹوائن بی کا "نظریہ تہذیب" کی وضاحت تفصیل سے کریں۔

2. آرنلڈ ٹوائن بی کی زندگی پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3. آرنلڈ ٹوائن بی کی کتاب ’’اے سٹڈی آف ہسٹری‘‘ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ali, Sheik B., *History*: *Its Theory and Method*, Macmillan, 1988 (first pub. in 1978).
2. Arnold, John H., *History*: *A Very Short Introduction*, Oxford University Press, New York, 2000.
3. Renier, G.J., *History*: *Its Purpose and Method*, George Allen & Unwin Ltd., London, 1950.
4. Rublack, Ulinka, *A Concise Companion to History*, Oxford University Press, UK, 2012.
5. Sreedharan, E., *A Textbook of Historiography, 500 B.C. to A.D. 2000*, New Delhi: Orient Longman Pvt. 2004.
6. Toynbee, Joseph Arnold, *A Study of History*, London: Oxford University Press, 1946.
7. Upadhyay, Shashi Bhushan, *Historiography in the Modern World: Western and Indian Perspectives*, London: Oxford University Press, 2016.
8. Wells, Colin, *A Brief History of History*: *Great Historians and the Epic Quest to Explain the Past*, The Lyons Press, Guilford, Connecticut, 2008.

اکائی 11۔مابعد جدیدیت: فوکو، دریدا اور ہیڈن وائٹ

(Postmodernism: Foucault, Derrida, and Hayden White)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 جدیدیت
11.3 مابعد جدیدیت کیا ہے؟
11.4 مابعد جدیدیت کی اصطلاح کی تاریخ
11.5 مابعد جدیدیت اور تاریخ
11.6 نظریہ مابعد جدیدیت کے مفکرین: فوکو دریدا اور وائٹ
11.7 اکتسابی نتائج
11.8 کلیدی الفاظ
11.9 نمونہ امتحانی سوالات
11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید (Introduction)

مابعد جدیدیت دراصل جدیدیت کے خلاف دانشوروں کی طرف سے ایک رد عمل ہے۔اسے جدیدیت کے خلاف بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ مابعد جدیدیت کو سادہ الفاظ میں جدیدیت کے خلاف نہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مابعد جدیدیت کا ظہور دانشوروں کی جدیدیت کے ساتھ ایک طویل تنقیدی مشغولیت کے بعد ہوا۔کیونکہ جدید مخالف روایت تقریباً اتنی یہ پرانی ہے جتنی کہ جدیدیت پسند ہے، لیکن جسے "مابعد جدیدیت" کہا جاتا ہے اسے 1970 کے دہائی میں اہمیت حاصل ہوئی۔ 1970 کے دہائی کے بعد ہی آنے والے تین دہائیوں میں عالمی پیمانے پر نظریہ مابعد جدیدیت کا پھیلاؤ ہوا، خاص طور سے اس نظریہ کا پھیلاؤ ترقی یافتہ مغربی دنیا میں ہوا۔مابعد جدیدیت کے نظریہ سازوں نے اس نظریہ کو فلسفہ، ثقافت اور سیاست پر تنقید کہا ہے جو جدیدیت کی وجہ سے ظاہر ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد جدیدیت نے خود کو بنیادی طور پر اس مقام پر رکھا ہے کہ سے سمجھنے کے بعد مابعد جدیدیت کو سمجھنا ممکن نہ ہو۔مابعد جدیدیت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دوسرے سماجی علوم کے ساتھ ساتھ اس نظریہ نے علم تاریخ اور تاریخ نویسی کو بھی کافی متاثر کیا۔اسی نظریہ کی وجہ سے عورتوں اور سماج کے دوسرے پسماندہ گروہوں کی تاریخ منظر عام پر آئی۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جدیدیت کے اہم پہلوؤں اور نظریات سے واقف ہوں گے۔
- جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین فرق کو سمجھ پائیں گے۔
- مابعد جدیدی کی اصطلاح کی تاریخی پس منظر سے واقفیت ہوگی۔
- نظریہ مابعد جدیدیت کا علم تاریخ یا تاریخ نویسی کے مابین رشتوں کو سمجھ پائیں گے۔
- اور مابعد جدیدیت کے تین اہم فلسفی، فوکو، دریدا اور ہیڈن وائٹ کے بارے میں جانیں گے۔

11.2 جدیدیت (Modernity)

جدیدیت دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک نیا نظریہ اور انداز ہے جسے اٹھارویں صدی کے روشن خیالی کے دور میں زبردست فروغ ملا اور بیسویں صدی کے اوائل میں اپنے عروج تک پہونچا۔اس کے نشانات کو نشاۃ ثانیہ یا عہد وسطیٰ کے آخری دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔جدیدیت کے ادوار سے متعلق سترہویں صدی کافی اہم ہے، کیونکہ یہ وہی دور تھا جب سائنس اور فلسفہ اپنی ابتدائی شکلوں سے ہٹ کر دنیا کے بارے میں ایک نئی علمی سوچ اور انداز کی تشکیل ہوئی اور اٹھارویں صدی میں سائنس کی طاقت، عقل کی آفاقیت، ترقی کرنے کی سوچ اور انسان کی آزادی جیسے عوامل کی وجہ سے جدیدیت کو کافی فروغ ملا۔یہی وہ عوامل اور خیالات تھے جن پر جدیدیت کی بنیاد تھی۔

نظریہ جدیدیت مختلف ذرائع سے ماخوذ ہے۔ یہ نظریہ اٹھارویں صدی میں ہونے والی سیاسی، اقتصادی، سماجی، تکنیکی اور سائنسی تبدیلیاں اس نظریہ کے اہم حصے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے ظاہر ہونے والا نظریہ کو جدیدیت کہا گیا۔ اس نے اقتصادی معاملات میں، صنعت کاری اور اس سے منسلک تکنیکی نشو نما نے دنیا میں انسانی غربت اور بدحالی کو ختم کرنے اور خوشحالی کے دور کا آغاز کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نظریہ نے زراعت پر مبنی معیشت کے روایتی نظم کو توڑ کر، یہ یقین دیا کہ انسان فطرت کا خود مالک ہے۔ اس کے ساتھ ہی طبوی علوم کے عروج نے دنیا کی تصویر ہی بدل دی۔ یورو پین توسیع، بڑھتی ہوئی آبادی، اندرونی بازار، شہروں کی آبادی میں تیزی، ابلاغ عامہ کی ترقی، قوم پرستی، طاقتور قومی ریاستوں کا عروج، نوکر شاہی کا سماج پر قابو، طبقاتی جدوجہد کی نئی شکلیں، کارپوریٹ اور سیاسی طقتوں کے لیے انقلابی چیلنج وغیرہ جدیدیت کے اہم حصے تھے۔

جدیدیت کو مستقل، دائمی اور مسلسل تبدیلیوں وال عہد بھی کہا گیا ہے۔ مارشل برمن () کے مطابق، جدیدیت کو صرف نئے دور کے طور پر بیان کیا جا سکتا ہے جس نے انسانی زندگی اور تجربات کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا۔ ہیبر مَس نے جدیدیت کو مسلسل تبدیلی والا عہد کے طور پر شناخت کیا ہے۔ ان کے مطابق، جدیدیت کا سیکولر تصور یہ ظاہر کرتا ہے کہ مستقبل کا آغاز ہو چکا ہے یعنی یہ وہ دور ہے جس میں انسان مستقبل کے لیے جیتا ہے اور خود کے لیے مستقبل کے نئے دروازے کھولتا ہے۔ اس کی ایک خاص حصہ خود شعوری () ہے اور ممکن ہے کہ اس بارے میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں کانت ()، شیلنگ ()، ہیگل () اور انکے معاصرین کے خود اضطراری خیالات میں واقع ہو۔ سیکولر موضوعیت بھی جدیدیت میں شامل تھا جو اسے مذہبی دنیا کے تمام نظریات سے الگ کرتا تھا۔ جدیدیت کے نظریہ میں خود اعتمادی بھی ہے جو انسان کو موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ موجودہ اور ماضی کی دنیا کو جانے، ان کی معروضی نمائندگی کرے اور سائنس، عقلیت اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے کسی بھی مسئلے کو حل کرنا مکمل طور پر ممکن ہے۔ جدید کو نہ صرف قدیم زمانے سے مختلف بلکہ اعلی بھی قرار دیا گیا۔ میکس ویبر کے مطابق جدیدیت ثقافت کی سیکولرائزیشن، چیزوں کی معقولیت اور تنظیموں کی بیوروکریٹائزیشن پر مشتمل ہے۔ جدیدیت میں عقل کی حکمرانی تھی۔ ہیبر مَس ()، کا خیال ہے کہ عقل اتنی زبردست شکل اختیار کر لیتی ہے کہ یہ نہ صرف جدیدیت کی خود اعتمادی کا مسئلہ حل کرتی ہے، بلکہ اسے بہت اچھی طرح سے حل کرتی ہے۔

جدیدیت میں اس طرح کے خیالات و نظریات تین مراحل سے گزر کر ظاہر ہوا۔ پہلا مرحلہ سولہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی کے آخر کا زمانہ شامل ہے جسمیں جدیدیت کا آغاز ہوئی اور سماج پر اپنی ابتدائی اثرات مرتب کیے۔ دوسرا مرحلہ میں اٹھارویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے اختتام تک کا زمانہ شامل ہے جس میں جدیدیت نے پورے مغربی ممالک کو اپنے لپیٹ میں لے لیا اور انسانی زندگی کے تمام اقسام و فنون کو متاثر کیا۔ اس کا آخری مرحلہ بیسویں صدی ہے جسمیں جدیدیت ایک عالمی نظریہ بن کر ظاہر ہوا اور سیاسی اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حالات کو پوری طرح سے بدل دیا۔ جدیدیت نے اپنے آپ کو قدیم دور یا قبل جدیدیت کے دور سے اپنے آپ کو واضح طور پر الگ کیا اور اسے جدیدیت کا نام دیا۔ اس سکے ساتھ ہی اس نظریہ نے مغربی ممالک اور باقیوں کے درمیان ایک بڑی حدبندی کی اور فرق کی بنیاد رکھی۔

حالانکہ انیسویں صدی کے وسط اور اس کے بعد سے ہی نظریہ جدیدیت کو تنقید کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ روشن خیلای کے نظریات کے ساتھ انسانی زندگی میں پریشانیاں اور تکلیفیں بھی بڑھیں۔ فرانس کے ایک عظیم شاعر، باؤڈیلیئر نے جدیدیت کو ایک 'عارضی دستہ' کے طور پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ جدیدیت کی اصطلاح سب سے پہلے نکاراگوں کے ایک شاعر، روبن ڈاریو نے 1890 میں وضع کیا تھا۔ انہوں نے مبہم پن، خود شعوری تجربہ اور اپنے انداز اور پیش کش کے ذریعے سامعین کے درمیان خلفشار اور صدمے کا شعور پیدا کیا۔ 1890 اور 1930 کے دوران جدیدیت سے متاثر ادب اور آرٹ کو فروغ ملا جو بنیادی طور پر اعلی طبقے کا فن تھا جس نے بڑے پیمانے پر ثقافت کی توہین کی اور اپنی خود مختاری پر اصرار کیا اور خود کو لوگوں کی دنیاوی زندگی سے دور رکھا۔ جدیدیت کے کچھ اہم ترین خصوصیات میں اظہار پسندی، داد پرستی، حقیقت پسندی، تعمیر پسندی اور مستقبل پرستی شامل تھے۔ فن وادب کے علاوہ اس کا اثر علم کے دوسرے شعبے جیسے فلسفہ، نفسیاتی اور سماجی علوم پر بھی پڑا۔ فرائیڈ، برگسن، پاریٹو، سوریل اور موسکا جیسے مفکرین نے عقلی، مفید اور خود غرض انسان کے تصور پر تنقید کی۔ اس کے بجائے بے عقلی اور لاشعوری پیدا ہوئیں، جس کے نتیجے تصوراتی طور پر جدیدیت جدیدیت کے خلاف ہوگئی تھی اور آخر کار ماس کلچر اور میڈیا اور صنعتوں کے متعلقہ ادارہ کے ظہور کے ساتھ ایک اشرافیہ کی ثقافتی تحریک کے طور پر جدیدیت ختم ہوگئی۔

11.3 مابعد جدیدیت کا تعارف (Introduction to Postmodernism)

مابعد جدیدیت ایک مبہم اور غیر واضح اصطلاح اور فکری تصور ہے جس کا استعمال چیزوں کو یا دنیا کو سمجھنے کے لیے مختلف سیاق وسباق میں ہوتا رہا ہے۔ اس اصطلاح کے غیر واضح ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ خود مابعد جدیدیت کے مفکرین عام طور سے اس کی واضح اور قطعی تعریف دینے سے گریز کرتے ہیں۔ بعض اوقات توان مفکرین نے بھی اس اصطلاح کو مسترد کیا ہے جنکے بارے میں مابعد جدیدیت کے مکتبہ فکر سے ملحق ہونے کا دعوی کیا گیا ہے۔ دراصل اس فکری اصطلاح کی درجہ بندی نہ صرف مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے بلکہ سمجھا بھی گیا ہے۔ اس فکری تصور کے مبہم اور غیر واضح ہونے کے باوجود، اکثر اسے موجودہ علم، سماجی اہمیت اور جدیدیت کی تنقید کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور اسطرح یہ فکری اصطلاح یا تصور دنیا کے تمام چیزوں کو سمجھنے کے لیے کسی ایک جہت، سماج کا کوئی خص اکثریت طبقہ یا کسی ایک معنی کے ذریعے سمجھنے کے بجائے چیزوں کو سمجھنے کے لیے مختلف جہت، طبقات، معنی اور پہلو کے استعمال پر زور دیتی ہے۔ اس مکتبہ فکر کے معنی کو اور واضح کرنے کے لیے انگلش زبان میں اکثریت (plurality)، کثیر مَعنوِیَت (polysemy)، ہمہ جہتی (multidimensionality)، عدم تسلسل (discontinuity)، زبان کا فنکارانہ استعمال (language game)، ابہام (indeterminacy) اور عارضیت (ephemerality) جیسے کچھ خاص الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

11.4 مابعد جدیدیت کی اصطلاح کی تاریخ (Defining Postmodernism)

مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔ جدیدیدت نے انسانوں کی جن مادی، ذہنی اور اخلاقی ترقی کا دعوی کیا تھا ان تمام دعوؤں کو پہلی جنگ عظیم کے واقعات نے لوگوں کو شک وشبہات میں مبتلا کر دیا۔ اس کے علاوہ جنگ میں

اپنے اپنے ملک کی حمایت کرنے والے یوروپین موٗرخین کی تاریخی تشریحات نے بھی تاریخی تحقیقات میں غیر جانبداری کے خیالات کو بھی مجروح کیا۔ جس کے نتیجے جدیدیت کا یہ خیال کہ سائنسی اور عالمی طور پر قابل قبول تاریخ ہوسکتی ہے برقرار نہیں رہ سکی۔ مزید برآں، نازیوں کے ظلم وستم اور دوسری جنگ عظیم میں ہونے والے ہلاکتوں نے جدیدیت سے پیدا شدہ عقلی ترقی کے تصور کو اور بھی زیادہ مجروح کردیا۔ ابعد جدیدیت کی اصطلاح کو اسی عالمی ماحول میں م تلاش کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے 1870 میں جان واٹکن چیپمین (John Watkins Chapman) نے جدیدیت پسند مصوروں کو تاثریت یا تاثرپسندی (impressionism) سے آگے بڑھنے کی اپیل کرنے کے لیے کیا تھا۔

بعد کے دہائیوں میں دانشوروں، ادیبوں، نقادوں اور دوسرے لوگوں نے اس اصطلاح کو مختلف پس منظر میں مختلف چیزوں کے لیے استعمال کیا۔ لیکن تمام لوگوں نے اسے جدیدیت کے رد عمل یا اس پر حملے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ 1934 میں ایک ہسپانوی مصنف فریڈرکو دے اونس (Fredrico De Onis) نے آرٹ سے متعلق بیسویں صدی کے اوائل کی جدیدیت پسند تحریک کے رد عمل میں اس اصطلاح کو استعمال کیا تھا۔ 1939 اور 1954 میں آرنلڈ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) نے مابعد جدیدیت کی اصطلاح کا استعمال 1875 اور 1914 کے بعد کے دور میں ہونے والی معاشی اور سماجی ترقی کو ظاہر کرنے لیے کیا تھا۔ 1950 کی دہائی سے یہ اصطلاح باقاعدہ طور سے استعمال کیا جانے لگا، جس کا ظہور مستقل طور پر 1960 کے اوائل میں مضبوط ہوا۔ یہ وہی دور تھا جب شاعری میں مابعد جدیدیت کا استعمال جدیدیت اور عقلیت پسندی کے رجحانات کی نشاندہی کرنے لے لیے کیا جارہا تھا۔ 1950 دہائی میں رائٹ ملس (Wright Mills)، پیٹر ڈرکر (Peter Drucker)، اور برنارڈ روزنبرگ (Bernard Rosenberg) نے سماجی علوم کے لیے اس اصطلاح کا استعمال کیا۔ جبکہ اس اصطلاح کو امریکہ میں ایک زبردست ثقافتی اشتہار اور ایک مضبوط وقتی نظریہ کے طور پر سمجھا گیا۔ مابعد جدیدیت کو اصل تقویت 1960 کے دہائی میں ملی جب لیونارڈ میئر (Leonard Meyer)، ایہاب حسن (Ihab Hasan) اور سوسن سونتاگ (Susan Sontag) جیسے ادب وفنون کے نقادوں نے مابعد جدیدیت کی طرف لوگوں کے رجحان کا تجزیہ کیا۔ ادیبوں اور نقادوں کے علاوہ اس اصطلاح کو کچھ معماروں نے بھی اپنے تعمیرات کے ذریعے جدیدیت پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً، 1972 میں رابرٹ وینٹری (Robert Venturi) اور انکے ساتھیوں کی فن تعمیر پر ایک مشہور کتاب، لرنِگ فرام دی لاس ویگس (Learning from Las Vegas) جدیدیت پر حملہ تھا۔ جبکہ چارلس جینک (Charles Jenck) کا خیال تھا کہ جدیدیت سماج کے اشرافیہ طبقے کا شکار رہا اور اس ضمن میں مابعد جدیدیت اس غالب طبقے پر مقامی زبان، روایت عام بول چال کے ذریعے قابو پانے کی ایک کوشش ہے۔

11.5 مابعد جدیدیت اور تاریخ (Post-Modernism and History)

'مابعد جدیدیت' کی اصطلاح مختلف نظریات اور رجحانات کا احاطہ کرتی ہے جو مرکزی دھارے کی تاریخ نویسی کے اصولوں پر پر

تنقید کرتے ہیں۔مابعد جدیدیت کے تنقید میں مختلف اقسام کے تنقید شامل ہیں مثلااس نظریہ میں اعتدالی، شدید، ہلکی اور صریح جیسی تمام اقسام کے تنقید شامل ہیں۔ اگرتاریخ یاتاریخ نویسی کے تناظر میں سمجھا جائے تومابعد جدیدیت تاریخ کو اسی جدید تحریک یا نظریہ جدیدیت کی پیداوار سمجھتی ہے جس نے سترھویں صدی میں جدید دنیا سے متعلق نظریاتی بنیادیں رکھی تھیں۔مابعد جدیدیت بذات خود تاریخ نویسی کے طریقہ کار یا اصول سے متعلق اصلاحات تجویز نہیں کرتی ہے، بلکہ اس کے برعکس تاریخ نویسی کے طریقوں اوراصولوں کو اکثر تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں خود تاریخ کو تصور کیا جاتا ہے۔تاریخ کے بارے میں مابعد جدیدیت کے اہم نظریات کو مندرجہ ذیل چھ باتوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مابعد جدیدیت تاریخ نویسی کے تمام اقسام کے عظیم بیانیات (grand narratives) کی مخالفت کرتی ہے۔مثال کے طور پر وہ اس غایاتی نمونہ (teleological model) کی مخالفت کرتی ہے جس میں مؤرخ انسانی تاریخ کو تحریر کرتے وقت تاریخی واقعات کو ایک عام نقطہ سے شروع کرکے ایک خاص مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مابعد جدیدیت کا نظریہ تاریخیت (historicism) پر تنقید کرتا ہے اور انسانی تاریخ میں موجود پیشرفت (progress) اور انداز (pattern) کے خیالات کو مسترد کرتا ہے۔اس کے برعکس یہ ایک ایسی ماضی پیش کرتا ہے جس میں کئی امکانات اور متعدد تاریخی عمل تصور کیا جاسکے۔

مابعد جدیدیت مرکزی دھارے کی تاریخ نگاری میں موجود سائنسی (scientistic)، آفاقی یا عالمی (universalistic) اور مرکزیت (centristic) جیسے دعووں کی سخت تنقید کرتا ہے۔ یہاں مرکزیت سے مراد فطرت یا معاشرے کے مطالعہ کے لیے کسی خاص مقام اور وقت کو اصل مرکز تسلیم کرنا۔ یعنی یہ یقین رکھنا کہ 'ایک واحد نقطہ نظر' کے ذریعے ماضی کے معنی کو واضح طور پر ظاہر کیا جاسکتا ہے۔تاریخ کو اس روسے لکھتے وقت مؤرخین کے لیے اکثر مقامی مرکز عام طور پر وہ جگہ ہوتی ہے جہاں فتح حاصل ہوئی ہو یا وہ قوم ہوتی ہے جس نے فتح حاصل کیا ہو۔اس طرح، دور جدید میں، یورپ مرکز رہا ہے اور زیادہ تر تاریخیں یوروپیائی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔تاریخ نویسی کے مرکزی رجحانات یا نظریات میں مؤرخین کے لیے انسان بھی ایک اور مرکز رہا ہے، جس پر مابعد جدیدیت نے بھی سوالیہ نشان لگایا ہے۔ در اصل مابعد جدیدیت کا نظریہ مرکزیت کے تصور کو مسترد کرتا ہے یعنی تاریخ لکھتے وقت کسی کو مرکز بنا کر تاریخی واقعات کی وضاحت کی مخالفت کرتا ہے۔مابعد جدیدیت مرکزیت مخالف نظریہ نے حقوق نسواں اور مابعد نوآبادیاتی کے مؤرخین کو بہت زیادہ تقویت بخشا ہے۔اسی نظریہ کی وجہ سے خواتین، نوآبادیاتی اور مقامی لوگ اور دیگر نظرانداز اور پسماندہ گروہوں نے تاریخ میں ایک موضوع کے طور پر اپنی جگہ بنائی۔

مابعد جدیدیت تاریخ کے دوہرے مفہوم یعنی ماضی اور ماضی کی تحریروں (تاریخ) کو بھی مسترد کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے مطابق ماضی صرف ایک بیانی شے ہے جسے مخصوص زبانوں میں نقش کیا گیا ہے۔ یہ نظریہ اس عقیدے پر بھی حملہ کرتا ہے جس میں تاریخ کو ماضی کے مترادف تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ مابعد جدیدیت اس بات پر بھی حملہ کرتا ہے کہ مؤرخین ماضی کو دریافت کر سکتے ہیں اور یہ کہ ماجی آرکائیوز یا کسی دستاویز میں موجود ہے۔ مابعد جدیدیت کے پیروکار یہ استدلال کرتے ہیں کہ اصل ماضی ایک ایسی چیز ہے جو ہم

دستاویزات سے باہر اور دور موجود ہے اور اسے کبھی جانا نہیں جا سکتا ہے۔تاریخ کے شکل میں ماضی کو ایجاد کیا جا سکتا ہے نہ کہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح،ماضی کو پانے یا حاصل کرنے کے بجائے تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

مابعد جدیدیت کے مطابق بیرونی دنیا کو حقیقی طور سے بیان یا پیش نہیں کیا جا سکتا اور کسی کو علم تک براہ راست رسائی نہیں ہو سکتی۔ یعنی علم تک صرف ان علامات کے ذریعے رسائی ہو سکتی ہے جو اپنے آپ میں ایک مستحکم کردار کے مالک ہوں۔مابعد جدیدیت کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا سے متعلق تمام پیشکش یا بیانات اصل میں مخصوص معاشروں کے ثقافتی ضابطوں کے مطابق ایک لسانی تعمیر ہے۔اس نظریہ کے مطابق دنیا کا کوئی نقشہ دنیا میں موجود ہر چیز کو نہیں دکھا سکتا اور یہ کہ دنیا خود یہ واحد نقشہ ہے۔اسی طرح تاریخ کی کوئی کتاب ماضی کو اس طرح نہیں تخلیق سکتی جیسا کہ وہ تھا یا واقع ہوا۔اسی طرح وقت اور جگہ دونوں حقیقی پیش کش کے دائرے سے باہر ہیں،یعنی ان دونوں کو حقیقی طور سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔اس نظریہ میں حقیقت جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے صرف نسخے اور ترجمانی ہیں۔اسی طرح کوئی حقائق نہیں ہیں بلکہ صرف تشریحات ہیں،کوئی اصل نہیں ہے بلکہ صرف نقلیں ہیں اور کوئی ماضی نہیں ہے بلکہ صرف اس کے اکاؤنٹس کو تاریخ کہا جاتا ہے۔

مابعد جدیدیت کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ ماضی کی حقیقت تک کی رسائی مختلف شواہد کی بنیاد پر منقطع جملوں سے آگے ممکن نہیں۔اس عمل میں جیسے ہی مورخین ان منقطع جملوں کو ایک قابل فہم بیانیہ کی صورت میں جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اسی وقت اس بیان میں تخیل اپنی جگہ لے لیتا ہے، یا بیان میں مؤرخ کا خیال اپنے آپ داخل ہو جاتا ہے۔اسی طرح ماضی کی سچائی سے متعلق کوئی 'عکاسی حوالہ' نہیں ہے۔مابعد جدیدیت کے لیے تاریخ فکشن کی طرح ایک بحث (discourse) ہے اور تاریخ 'سچائی تلاش کرنے والی گفتگو کے بجائے سچائی تشکیل دینے والی گفتگو ہے۔

نظریہ مابعد جدیدیت 'مائکرو ہسٹری' کو فروغ دیتی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ مورخین آزادانہ اور قانونی طور پر اپنی تحریری بیانات کو متنوع نقطہ نظر کے علاوہ بہت سے پہلوؤں کے ساتھ بیان کر سکتے۔مابعد جدیدیت میں تاریخ وہ بنیاد فراہم کر سکتی ہے جس پر حقوق نسواں کا تصور عالمی طور پر مقبول مرد کے موضوع کو چیلنج کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ مابعد جدیدیت بھی جدیدیت کے تصور کردہ غیر جانبدار، ترقی پسند اور یکساں وقت کو بکھرے ہوئے وقت سے بدلنا چاہتی ہے۔الزبتھ ارمارتھ (Elizabeth Ermarth) نے وقت کا ایک باترتیب نظریہ پیش کیا ہے جو واقعات سے الگ اور خارجی نہیں ہے۔

یہ تمام باتیں دراصل تاریخ نویسی سے متعلق مابعد جدیدیت پسندوں اور مفکروں کا نظریہ ہے۔کچھ مابعد جدیدیت پسندوں میں ایسے بھی ہیں جو تاریخ کو بالکل ہی مسترد کرتے ہے۔مثال کے طور پر سینڈی کوہن ()،تاریخ کو یہ کہ کر مسترد کرتے ہیں کہ تاریخ رد عملی سوچ کا ایک مظہر ہے،جو موجودہ دور میں مؤرخین کے سوچنے کے عمل کو روکتی ہے۔اسی طرح تاریخ تضادات پر روشنی ڈال کر سیاسی غیر جانبداری اور ثقافتی استحکام کو فروغ دیتی ہے۔کیتھ جینکنز نے یہ بھی استدلال کیا کہ اگر مابعد جدیدیت کے دلائل کی منطق کو اس کے نتیجے تک پہنچایا جائے تو

ماضی کا کوئی معتبر تشریح نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی تاریخ جیسی کوئی موضوع یا شعبہ ہوگا۔ یعنی کسی بھی قسم کی تاریخ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

11.6 نظریہ مابعد جدیدیت کے مفکرین: فوکو، دریدا اور وائٹ

(The Ideologues of Post-Modernism: Foucault, Derrida, and Hayden White)

اس سیکشن میں ہم ان فلسفیوں اور مفکروں پر گفتگو کریں گے جنہوں نے تاریخ کے حوالے سے مابعد جدیدیت کے نظریہ کی تشکیل میں اہم کردار نبھایا ہے۔ ان مفکرین میں مشیل فوکو، دردا و ہیڈن وائٹ شامل ہیں۔

مشیل فوکو (Michel Foucault, 1984–1926)

فوکو، ایک فرانسیسی فلسفی کے ساتھ ساتھ ایک پیچیدہ مفکر تھا۔ ان کے خیالات و نظریات مختلف موضوعات اور متعدد نظریات سے متعلق ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ روشن خیالی کے نظریات اور نظریہ جدیدیت کے سخت ناقد تھے جسکی وجہ سے انہیں نظریہ مابعد جدیدیت کا اہم مفکر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی تحریروں اور تصانیف کا انسانیت اور سماجی علوم پر زبردست اثر تھا اور اب بھی جاری ہے۔ ان کے تصانیف کا اکثر تاریخ، ثقافتی مطالعہ، فلسفہ، سماجیات، ادبی نظریہ اور تعلیم جیسے مضامین میں حوالہ دیا جاتا ہے۔ وہ مختلف سماجی اداروں پر تنقید کے لیے مشہور ہیں جنہیں وہ یورپی جدیدیت کی پیداوار سمجھتے تھے۔ نفسیات، طب اور جیل جیسے اداروں اور مضامین نے انہیں جدیدیت پر تنقید کرنے کی دعوت دی۔ اپنے تصانیف کے علاوہ، وہ طاقت و اقتدار سے متعلق اپنے عمومی نظریات اور طاقت اور علم کے درمیان ایک گہرا تعلق کے ساتھ ساتھ مغربی فکرین کی تاریخی نظریات اپنے خیالات کے لیے بھی مشہور ہیں۔ حالانکہ بعد کی زندگی میں انہوں نے جنسیت کی تاریخ پر بھی کام کیا۔ انہوں نے اپنے نظریات و خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل تصانیف میں کیا ہے۔ ان کی سب سے پہلی کتاب، میڈنیز اینڈ سولائزیشن (*Madness and Civilization*) 1961 میں شائع ہوئی، دی برتھ آف دی کلینک (*The Birth of the Clinic*) جس کی اشاعت 1963 میں ہوئی ان کی دوسری اہم کتاب ہے، جبکہ ان کی تیسری کتاب دی آرڈر آف تھنگز (*The Order of Things*) 1966 میں شائع ہوئی۔ دی آرکیالوجی آف نالج (*The Archaeology of Knowledge*)، ڈسپلن اینڈ پنش: دی برتھ آف پریزن (*Discipline and Punish: The Birth of the Prison*) اور دی ہسٹری آف سیکسوالٹی (*The History of Sexuality*) جیسی اہم تصانیف بالترتیب 1969، 1975، 1986 میں شائع ہوئی۔ انہیں اہم کتابوں اور تصانیف کی ایک سیریز کے ذریعے سے ہی انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

انہوں نے تاریخی مطالعات کے ایک سلسلے کے ذریعے اپنے نظریات کا اظہار اور پیش کیا۔ اسی لیے بعض اوقات انہیں فلسفی مؤرخ (Philosophical Historian) بھی کہتے ہیں۔ پھر بھی انہوں نے روایتی تاریخ کی اس بات پر تنقید کیا ہے کہ اس میں تسلسل پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ انہوں نے دو قسم کی تاریخ پیش کی اور ان دونوں میں فرق کیا۔ پہلی تاریخ پرانی تاریخ ہے جس میں تاریخ نویسی کے لیے تسلسل اور مستحکم ڈھانچے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور عدم تسلسل کو دنیاوی انحطاط کا اہم وجہ سمجھی جاتی ہے اور اس وجہ کو ہٹانے کی ذمہ

داری مؤرخین کو سمجھا جاتا ہے۔دوسری قسم میں نئی تاریخ آتی ہے، جس میں تسلسل تاریخی تجزیہ کا بنیادی عناصر میں سے ایک اہم عنصر سمجھا جاتا ہے۔انکے مطابق جہاں روایتی یا پرانی تاریخ ماضی کی باقیات کو دستاویز میں تلاش کرتی ہے، تو دوسری طرف نئی تاریخ دستاویزات کو باقیات میں تلاش کرتی ہے۔ان کا یہ نظریہ علم آثار قدیمہ کو ایک نظم وضبط کے طور پر منظر عام پر لاتا ہے۔

فوکو کی تحریریں اور تصانیف زیادہ تر تاریخی نظریہ سے لکھی گئیں ہیں۔ لیکن انہوں نے تاریخ میں موجود نظریہ تسلسل کے تصور کو مکمل طور پر مسترد کرتے ہیں۔اس کے برعکس انہوں نے تاریخ میں عدم تسلسل کے خیالات کو اہمیت دیتے ہیں۔انکے اس طرح کے خیال کے مطابق تاریخ مسلسل اور یکساں نہیں ہے اور نہ ہی تاریخ کا عالمگیر ہونا ممکن ہے۔تاریخ اور معاشرے سے متعلق ان کا خیال علم آثار قدیمہ کے تصور سے لے کر نسب نامہ کے خیال تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اپنے تمام تحریروں میں انہیں نے فرق کے خیال پر زور دیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے روشن خیالی کے اس خیال کو مسترد کیا ہے کہ عقل کی حکمرانی کو آزادی اور ترقی کے ساتھ مساوی کیا جاسکتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ علم طاقت پر مرکوز ہے جو جدید دور میں تسلط کی نئی شکلیں پیدا کرنے میں مدد کرتا ہے۔اس طرح انہوں نے علم اور طاقت کو الگ کرنے کی کوششوں پر تنقید کر کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ علم کی جستجو، خاص طور پر جدید دور میں، طاقت کے حصول اور تسلط کی جستجو سے ملحق ہے۔

جیکس ڈریڈا (Jacques Derrida, 1930–2004)

فوکو کی طرح وہ بھی ایک فرانسیسی فلسفی اور مفکر ہیں۔ انہوں نے ایک فلسفی کی حیثیت سے نظریہ مابعد جدیدیت میں خاص طور پر لسانی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔مابعد ساختیات اور مابعد جدیدیت کے نظریات کی ترقی میں ڈریڈا کی بنیادی کارنامہ ان کا نظریہ ڈکنسٹرکشن کا منظر عام پر لانا تھا۔انہوں نے تمام تحریری متن کو ایک پیچیدہ ثقافتی عمل کی پیداوار کے طور پر دیکھا ہے۔ڈریڈا کے مطابق، انسانی علم صرف نصوص تک محدود ہے۔ نصوص سے باہر کچھ نہیں ہے۔ حقیقت زبان سے ضرور بنتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان سے باہر کوئی دنیا ہے ہی نہیں۔انکے مطابق ہم جس دنیا کو جانتے ہیں وہ صرف زبان کے ذریعے ہی ہمارے لیے قابل رسائی ہے۔یہ زبان ہی ہے جو ہماری دنیا کو تشکیل دیتی ہے اور اس لیے حقیقت سے پہلے زبان کا درجہ ہے۔ حقیقت کا علم زبان اور اس کے اصولوں سے باہر نہیں ہے۔ڈی کنسٹرکشن سے متعلق ایک اور خیال نظری فرق ہے جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کسی بھی چیز کا مفہوم دوسری چیزوں کے فرق سے ہی معلوم ہوتا ہے۔کوئی بھی متن صرف دوسرے متن کے فرق کے ذریعے ہی قابل فہم ہے۔اس لحاظ سے فرق چیزوں کے وجود سے پہلے ہے۔

ہیڈن وائٹ (Hayden White)

ایک امریکی مورخ، فلسفی اور مفکر ہیں۔تاریخ کے حوالے سے انہیں مابعد جدیدیت کے مکتبہ فکر کا ایک اہم مفکر سمجھا جاتا ہے۔ان کی کتاب، میٹاہسٹری: دی ہسٹوریکل امیجنیشن ان نائنٹینتھ سنچری یورپ، 1973 میں شائع ہوئی، جو کافی مقبول ہوئی۔ان کی اس کتاب کو بہت سے لوگوں نے تاریخ کے فلسفے کے تعلق سے ایک وقفے کی طرح دیکھا ہے۔ان کی کتاب تاریخ نویسی کے میدان میں ایک لسانی موڑ کا آغاز کرتی ہے۔یہ سوال پوچھنے کے بجائے کہ تاریخ سائنس سے کیسے مشابہت رکھتی ہے؟ان کی کتاب کی اشاعت کے بعد اب کوئی یہ پوچھ سکتا

ہے کہ علم تاریخ کا افسانے سے کیا اور کیسی مشابہت ہے؟ وائٹ اس بات پر دلیل پیش کرتے ہین کہ ماضی ہمارے لیے محض مختلف اور منقسم تواریخ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مورخ ہے جو اس سے ایک بامعنی کہانی کی شکل میں تخلیق کرتا ہے۔ ان کے مطابق تاریخی واقعات میں ایک مربوط داستان تلاش کرنا ممکن نہیں، اگر بہت زیادہ تلاش کیا بھی جائے تو ایک مؤرخ کہانی کے عناصر پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ مورخ یہ ہے جو دستیاب ریکارڈز میں سے کچھ واقعات کو چھپا کر اور کچھ کو نمایاں کر کے ایک مربوط کہانی تیار کرتا ہے۔ یہ عمل اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ دانوں کی سیاسی یا دیگر پیشین گوئیوں کے مطابق واقعات کے ایک ہی مجموعہ کو المناک، ستم ظریفی یا مزاحیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا، وائٹ کے مطابق، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخ کوئی سائنسی مشق نہیں ہے، بلکہ ایک ادبی ہے اور تاریخی بیانیے سائنسی مقالے نہیں ہیں بلکہ زبانی افسانے ہیں۔ وائٹ کا کہنا ہے کہ تاریخ کی تحریروں میں ناول لکھنے کی تمام تکنیکوں اور طریقوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ واقعات کا انتخاب، کردار نگاری، لہجے کی تبدیلی اور نقطہ نظر کی تکنیک ہیں۔ ناول لکھنے اور تاریخ دونوں کے لیے مشترک۔ تاریخ لکھنے میں، جیسا کہ ناولوں کی تخلیق میں، تخیل بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ صرف تخیل کے ذریعے ہی ہے کہ مورخ ماضی کے واقعات کو سمجھتا ہے اور ان میں سے کچھ کو ایک معتبر کہانی بناتا ہے۔

11.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

نظریہ مابعد جدیدیت دراصل نظریہ جدیدیت کی تنقید ہے۔ نظریہ جدیدیت کے دو طرح کے ناقد ہیں: انتہا پسند اور اعتدال پسند نظریہ نگار۔ انتہا پسند نظریہ نگار جدیدیت کو مکمل طور سے مسترد کرتے ہیں جبکہ اعتدال پسند جدید نظریات کو از سر نو تشکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے اندر سے مجموعی اور جابرانہ عناصر کو ختم کیا جا سکے۔ جب کہ انتہا پسند روشن خیالی کی ترقی پسند خصوصیات کو اس کے جابرانہ پہلوؤں کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اعتدال پسند روشن خیالی کے نظریات کی آزادی کی قوت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظریہ مابعد جدیدیت ان بنیادی باتوں پر سوال اٹھاتے ہیں جن پر تاریخ کا نظم وضبط قائم ہے۔ وہ تعلیم و تعلم کے معاملے میں انضباطی حدود کو نہیں مانتے، جیسے کہ تاریخ اور ادب کے درمیان، یا معاشیات اور بشریات وغیرہ کے درمیان موجود ہیں۔ درحقیقت وہ حقائق اور واقعات کے وجود پر بھی سوال اٹھاتے ہیں۔ ان کے خیال میں لسانی نمائندگی ماضی کا نچوڑ اور تاریخ کا محور بن جاتی ہے۔ یہ اکائی سے آپ کو نہ صرف نظریہ مابعد جدیدیت سے متعلق معلومات ہوئی بلکہ مابعد جدیدیت کا جدیدیت، علم تاریخ اور دوسرے علوم پر انکے اثرات، مختلف مابعد جدیدیت کے مفکرین کے خیالات سے بھی واقف ہوئے۔

11.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

روشن خیالی : (Enlightenment) یہ سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں ظاہر ہونے والی ایک یورپیکری تحریک تھی جس نے مذہب اور توہم پرستی کے خلاف عقلیت پسندی، لامذہبیت اور انسانیت پسندی کا دعویٰ کیا۔ انگلینڈ میں لاک اور بینتھم، فرانس میں والٹیئر، مونٹیسکو ئیو اور ڈیڈ یروٹ اور امریکہ میں تھامس جیفرسن اس کے اہم حامی تھے۔

انسان پسندی : (Humanism) ہیومنزم کی تعریف اس نظریے کے طور پر کی جاتی ہے جو خدا یا فطرت کی جگہ انسان کو کائنات کا مرکز سمجھتا ہے۔

عقلیت پرستی : (Rationalism) یہ وہ نظریہ ہے جو صرف تجربے اور استنباطی اور دلکش استدلال پر مبنی عقائد کو قبول کرتا ہے۔ یہ مافوق الفطرت کے عقیدہ کے بھی خلاف ہے۔

رومانویت پسندی : (Romanticism) اٹھارویں صدی کے آخر میں، زیادہ تر فرانسیسی روشن خیالی کی مخالفت میں اور ابھرتی ہوئی قوم پرستی کے فیڈر کے طور پر، رومانویت مغربی یورپ اور روس میں تیار ہوئی۔ اس کے ابتدائی نمائندے فرانس میں روسو اور جرمنی میں ہرڈر، کانٹ، فِختے اور شیلنگ تھے۔ اس کا اثر تقریباً 1790 سے 1840 کی دہائی تک محسوس کیا گیا۔ یہ فرانس کے انقلاب اور انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کا ردعمل تھا جس کے نتیجے میں سماجی اور سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا۔ رومانوی سوچ کے لیے اہم انسان اور فطرت کے درمیان ایک نامیاتی رشتہ تھا۔

سائنسیت : (Scientism) یہ عقیدہ ہے کہ فطری علوم میں استدلال کے طریقے ہی حقیقیحقائق کے علم کا واحد ذریعہ ہیں اور ان کے ذریعے ہی انسان اور معاشرے کی صحیح معرفت ممکن ہے۔

کثیر جہتی : (Multidimensionality) فلسفہ مابعد جدیدیت میں کثیر جہتی کا تصور انسانی تجربات کی پیچیدگی اور تنوع کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ تصور اس خیال کو مسترد کرتا ہے کہ ایک واحد، معروضی حقیقت ہے جسے پوری طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بجائے، یہ نقطہ نظر کی کثرتیت کی تعریف اور اس تسلیم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ سچائی اکثر مستقل اور سیاق وسباق پر مبنی ہوتی ہے۔

عدم تسلسل : (Discontinuity) عدم تسلسل کی اصطلاح فلسفہ مابعد جدیدیت میں نظریہ جدیدیت کے تسلسل کے اس خیالات کو مسترد کرتی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ انسانی وجود کی پیچیدگیوں کو ایک واحد، متحد بیانیہ یا وضاحت کے ذریعہ اظہار کیا جا سکتا ہے۔ یہ نقطہ نظر، تجربات اور سچائیوں کے تنوع کے لیے تعریف کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور یہ حقیقت کی مکمل نمائندگی کے لیے کسی بھی وسیع بیانیے کے اختیار کو چیلنج کرتا ہے۔

11.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو جان واٹکن چیپمین (John Watkins Chapman) نے کس کے لیے کیا تھا؟
2. مابعد جدیدیت کے طرف لوگوں کے رجحان کا تجزیہ کن دو فلسفیوں نے کیا ہے؟
3. مشیل فوکو کی کتاب *Madness and Civilization* کب شائع ہوئی؟
4. ڈریڈا کا تعلق کس ملک سے تھا؟

5. مابعد جدیدیت کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

6. مائکرو ہسٹری کا تصور کس مورخ کا ہے؟

7. مائکرو ہسٹری پر ہیڈن وائٹ کی کون سی کتاب ہے؟

8. علم اور طاقت کا تصور کس نے دیا ہے؟

9. فلسفی مورخ کسے کہا جاتا ہے؟

10. کس مفکر نے تاریخ کو ایک افسانوی کہانی کہا ہے۔

11. جدیدیت کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

11.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. نظریہ جدیدیت کو پانچ جملوں میں بیان کیجیے۔

2. فوکو کے تین اہم کتابوں کا نام بتائیے۔

3. کثیر جہتی کی تصور کو پنچ جملوں میں لکھئے۔

4. تاریخ کے بارے میں دریدا کے خیالات کو پانچ جملوں میں لکھئے۔

5. فوکو کے عدل تسلسل کے تصور پر پانچ جملے لکھئے۔

11.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. "مابعد جدیدیت" کیا ہے؟ اس کے بارے میں چند اہم مفکرین کے خیالات پر تبادلہ خیال کیجیے۔

2. نظریہ جدیدیت پر ایک نوٹ لکھئے۔ مابعد جدیدیت اس سے کیسے مختلف ہے؟

3. علم تاریخ کے تعلق سے مابعد جدیدیت کے نظریات پر بحث کیجیے۔

11.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Thompson, Willie, *Postmodernism and History*, Palgrave Macmillan, New York, 2004.
2. Smart, Barry, *Modern Conditions, Postmodern Controversies*, Routledge, New York, 2006.
3. Southgate, Beverley, *History: What and Why? Ancient, Modern and Postmodern Perspectives*, Routledge, London, 2001.
4. Anderson, Perry, *The Origin of Postmodernity*, Aakar Books, Delhi, 2013.
5. Upadhyay, Shashi Bhushan, *Historiography in the Modern World: Western and Indian Perspectives*, Oxford University Press, New Delhi, 2016.
6. Evans, Richard J., *In Defence of History*, Granta, 2001.

اکائی 12۔ نوآبادیاتی تاریخ نویسی: مستشرقین اور افادیت پسند مؤرخین

(Colonial Historiography: Orientalists and Utilitarians)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 نوآبادیاتی/سامراجی طریقہ کار
12.2.1 رومانویت پسند
12.2.2 افادیت پسند/سامراجی
12.3 افادیت پسند مؤرخین
12.3.1 چارلس گرانٹ
12.3.2 جیمس مل
12.3.3 ماؤنٹ اسٹورٹ ایلفنسٹن
12.3.4 تھامس بابنگٹن میکالے
12.3.5 سرہنری مین
12.3.6 ونسنٹ اسمتھ
12.3.7 ولیم ہیریسن مورلینڈ
12.4 ہندوستانی تاریخ کی زمانی تقسیم
12.5 ہندوستان پر نوآبادیاتی تاریخ نویسی کا اثر
12.6 اکتسابی نتائج
12.7 کلیدی الفاظ
12.8 نمونہ امتحانی سوالات
12.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

تاریخ لکھنے کا جدید طریقہ، جو مستند آخذ کی تنقیدی جانچ اور منطقی توضیح پر مبنی ہو، تاریخ نویسی کہلاتا ہے۔ یہ ایک جدید تصور ہے جس کو18ویں صدی کے آخر اور19ویں صدی کے اوائل میں فروغ ملا۔اس کا مقصد حقائق کو سائنسی انداز میں پیش کرتے ہوئے ماقبل جدید معاشروں کی تاریخ لکھنا ہے۔ہندوستان میں جدید طرز پر قدیم اور عہد وسطیٰ ہند کی تاریخ لکھنے کی شروعات نوآبادیاتی تاریخوں سے ہوئی۔البتہ بعد میں تاریخ کے مطالعہ میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اس دوران تاریخ نویسی کے مختلف مکاتب فکر بھی وجود میں آئے۔جن پر ان کے سیاسی اور علمی ماحول کا گہرا اثر تھا۔ان مکاتب فکر اور ان کے نقطہ نظر میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ وہ مصادر و مآخذ ہیں جو ان کے زیر مطالعہ تھے۔اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو تاریخ نویسی کے نوآبادیاتی مکتب فکر کے بارے میں سمجھانا ہے جس نے ہندوستان میں ماقبل جدید دور کی تاریخ لکھنے کی روایت کو وجود بخشا۔نوآبادیاتی تاریخ نویسی کے اندر ہمیں دو اہم نقطہ نظر دکھائی دیتے ہیں: مستشرقین اور افادیت پسند۔اس اکائی میں ہم ان رجحانات کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ تاریخ لکھنے کا کام نوآبادیاتی مصنفین نے کیوں اور کیسے کیا۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- نوآبادیاتی مؤرخین کے ذریعہ ہندوستان کی منظم اور ترتیب وار تاریخ لکھنے کا رواج کس طرح پروان چڑھا۔
- ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے افادیت پسندوں اور مستشرقین کے طریقہ کار کیا ہیں۔
- مختلف نوآبادیاتی مؤرخین اور ان کے کاموں سے واقف ہو سکیں گے۔

12.2 نوآبادیاتی/سامراجی نظریہ (Colonial/ Imperialist Approach)

تاریخ نویسی میں "نوآبادیاتی یا سامراجی طریقہ کار" سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس میں نوآبادیاتی فکر کے زیر اثر مؤرخین مقبوضہ ممالک کی تاریخ لکھتے ہیں۔ہندوستانی تناظر میں دیکھا جائے تو نوآبادیاتی طریقہ کار کا ظہور18ویں اور19ویں صدی میں ہوا جب برطانوی نوآبادیاتی حکام اور مؤرخین نے ہندوستانی عوام کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی۔نوآبادیاتی نظریہ کی بنیاد اس سوچ پر تھی کہ کس طرح برطانوی سامراج قائم ہوا اور اسی سوچ نے چند ایسے تصورات کو جنم دیا جن کی مدد سے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو جائز ٹھہرایا گیا۔نوآبادیائی مصنفین نے جس مقصد کے لیے تاریخ لکھنا شروع کیا وہ مقبوضہ ہندوستان کے ماضی کو سمجھنا تھا۔تاہم انہوں نے اس دوران وہ اصول و مبادیات بھی وضع کیے جو ہندوستان میں فن تاریخ کے لیے معیار قرار پائے۔انہوں نے تاریخ نویسی کے لیے "اثباتیت پسندی" (Positivism) کو ایک فریم ورک کے طور پر اپنایا۔تاریخ نویسی میں "اثباتیت پسندی" سے مراد وہ فلسفہ ہے جس میں سختی سے (strictly) حقائق پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔لیوپولڈ ون رانکے (Leopold von Ranke) کے مطابق حقائق کی ہو بہو پیش کش ہی تاریخ نویسی کا اولین

قانون ہےاور اس سے مؤرخ کی معروضیت(objectivity)میں یقین پیدا ہوتا ہے۔یوروپ میں "اثباتیت پسند"تاریخ نویسی کا طریقہ کار کتنا مقبول تھا،اس کا اندازہ ہندوستانی تاریخ پر مستشرقین اور ماہرین ہند کی تحریروں سے نمایاں طور پر لگایا جاسکتا ہے۔

شروع میں یوروپیوں نے ہندوستان اور اس کے ماضی کے بارے میں لکھنے میں اس لیے دلچسپی لی کیوں کہ انہیں نام نہاد "مقامی" قوانین،رسم ورواج اور روایات کو سمجھنے کی ضرورت تھی جو مقبوضہ نوآبادی کے موثر نظم ونسق کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے یوروپی دانشوروں نے،بشمول ولیم جونس،چارلس ولکنس(Charles Wilkins)، ایچ ٹی کولبروک (H.T. Colebrooke) اور ایچ ایچ ولسن (H.H. Wilson) ہندوستان کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا اور سنسکرت اور یوروپی زبانوں کے درمیان نمایاں لسانیاتی مماثلت ڈھونڈ نکالی۔ان کی تحقیق کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ادبی آخذ کا ایک وسیع ذخیرہ شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔مگر ہندوستانی فلسفیانہ اور ادبی آخذ کے تئیں ان کے رویہ نے مستشرقین کی جماعت میں سے دو مکاتب فکر کو جنم دیا۔ایک کی قیادت کم ظرف افادیت پسندوں (Utilitarians) نے کی،اور دوسرے کی قیادت رومانویت پسندوں (Romanticists)نے کی جن میں ولیم جونس(William Jones)، میکس میولر(Max Muller) اور کئی دوسرے دانشوران شامل تھے،جنہوں نے ہندوستان کے ماضی کے بارے میں تنقیدی اور ہمدردانہ دونوں طرح کے نظریات کی وکالت کی۔

12.2.1 رومانویت پسند (The Romanticists)

رومانویت پسند مؤرخین کی تحریروں میں ہندوستان کو روحانیت اور مثالی کردار کے عظیم نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا،جو ہندوستان کو مغربی دنیا کی مادہ پرستی سے ممتاز کرتا تھا۔ان کے خیال میں سنسکرت اور دوسری یوروپی زبانوں میں قریبی مماثلت نے ایک مشترکہ آریائی نسل کے تصور کو مضبوطی فراہم کی،یعنی یہ کہ اہل یوروپ اور برہمن دونوں کا تعلق آریائی نسل سے ہے۔چنانچہ اس طرح ہندوستانی ماضی کے مطالعہ کے لیے برہمن اور ان کی کتابوں کو ثالث یعنی فیصلہ کن سمجھا گیا۔تاہم ہندوستانی تہذیب کے تئیں اپنی تمام تر ہمدردی کے باوجود،ایک اہم تضاد جو ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے اس مکتب فکر کے اندر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اس نے ذات پات،مذہب اور اس جیسے دوسرے عوامل پر جو ہندوستان کو موجودہ یوروپ سے منفرد بناتے تھے،بہت زور دیا اور ان کو ہندوستان کی بنیادی خامی بنا کر پیش کیا۔نتیجتاً ہندوستانی تہذیب کو جامد(static)، غیر متغیر(unchanging) اور غیر فعال(passive) اور کسی بھی طرح کی ترقی نہ حاصل کر پانے کے قابل قرار دے دیا۔اس وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ گرچہ رومانویت پسند مؤرخین ہندوستانی تہذیب کے ہمدرد معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ انہیں ہندوستان اور اس کی زبان (سنسکرت) سے پیار اور احترام تھا،لیکن ان کی بحث کا مرکزی نکتہ یہی تھا کہ ہندوستان یوروپ سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔

12.2.2 افادیت پسند/سامراجی (The Utilitarians/Imperialists)

دوسرا اہم مکتب فکر جو مشرقی تہذیب کے مطالعہ کے ضمن میں اُبھرا وہ نوآبادیاتی یا سامراجی مکتب فکر تھا۔نظریاتی طور پر ان کی حمایت افادیت پسندوں نے کی۔اس مکتبہ فکر کے مؤرخین ہندوستان اور اس کے ماضی کے بارے میں گھٹیا سوچ رکھتے تھے۔

سامراجی مؤرخین اور برطانوی ملازمین۔ مصنفین نے، جو اثباتیت پسندی (Positivism) اور عالم گیریت (Universalism) کے اصولوں سے متاثر تھے، ہندوستان کے ماضی کی تحقیق کے لیے ایک سخت سائنسی طریقہ کار کو اختیار کیا۔ اس کا ایک فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کو روحانیت میں گم ایک پرکشش ملک و تہذیب کے طور پر پیش کیا گیا جو مادہ پرست اور پسند مغرب کے بالکل برعکس تھا۔ چنانچہ اس نقطہ نظر کی رو سے، ہندوستان کو اکثر مغرب سے کمتر خطہ ارض کی طرح دیکھا گیا، خاص طور سے تاریخی شعور کی کمی کے حوالے سے۔ مزید برآں، اپنی نوآبادیاتی کوششوں میں اس مکتب فکر نے ہندوستان کو ایک غیر مہذب، وحشی اور ناشائستہ قوم کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو مشرق و مغرب کے تہذیبی تناظر میں "اپنے"(Self) اور "غیر"(Other) کے اس "دورخی تضاد" (binary opposition) کا مقصد 18ویں اور 19 ویں صدی میں ہندوستان پر برطانوی اقتدار کو جائز ٹھہرانا تھا۔ سامراجی مؤرخین کا پختہ یقین تھا کہ ہندوستانی سماج میں کوئی بھی تبدیلی بنیادی طور پر حکومتی قانون سازی کے ذریعہ اور ہندوستانیوں کے لیے ان کی تہذیب و تاریخ کی از سرِ نو دریافت کے ذریعہ ہی لائی جاسکتی ہے۔ بہر حال دونوں کوششوں کا مقصد ہندوستانی عوام پر اپنا تسلط اور غلبہ قائم کرنا تھا۔

12.3 افادیت پسند مؤرخین (The Utilitarian Historians)

12.3.1 چارلس گرانٹ (Charles Grant)

اٹھارویں صدی میں تاریخ کے صف اول کے مصنفین میں ایک چارلس گرانٹ تھا جو ایک عیسائی مشنری (Evangelist) تھا۔ اس کا پختہ یقین تھا کہ ہندوستان میں برطانوی راج خدا کی طرف سے مقدر تھا۔ اس کی نظر میں انگریز ہندوستان کو قدیم مذہبی عقائد اور توہمات کے اندھیروں سے نکالنے آئے تھے۔ یعنی نجات عیسائیت کی روشنی سے ہی ممکن تھی۔ یہ خیال 1792ء میں لکھی گئی اس کی کتاب *Observations on the State of Society Among the Asiatic Subjects of India* میں نظر آتا ہے۔ 19ویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کے دوران ہندوستان میں برطانوی حکومت کافی مستحکم ہوچکی تھی۔ یوروپ میں برطانیہ نہ صرف ایک بڑی طاقت کے طور پر، بلکہ دنیا کے پہلے صنعتی ملک کی حیثیت سے ابھر چکا تھا۔ یہی رجحان ہندوستان کے حوالے سے برطانوی تحریروں میں صاف جھلکتا ہے، یعنی ایک ایسا ملک جس پر برطانیہ کا غلبہ تھا اور جسے برطانیہ پسماندہ (backward) سمجھتا تھا۔

12.3.2 جیمس مل (James Mill)

جیمس مل سامراجی مؤرخین اور برطانوی ملازمین۔ مصنفین میں سب سے نمایاں شخص تھا جس نے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق اپنی متعدد تصنیفات میں افادیت پسند نظریہ کا استعمال کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا۔ جیمس مل نے اپنی یادگار زمانہ اور انتہائی مؤثر کتاب *The History of British India* (1817) میں ہندوستانی سماج کی ایک ایسی تصویر پیش کی جس پر ذات پات اور مذہبی نظریہ کا غلبہ تھا اور مل کے مطابق، اسی وجہ سے ہندوستانی سماج توہمات اور کمتر درجہ کی دقیانوسی رسومات (Primitivism)

سے باہر نکلنے میں ناکام رہا۔اس طرح مل نے ہندوستانی سماج کو قدامت پسند سماج کے طور پر پیش کیا جس میں ترقی کرنے کا حوصلہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک جامد اور غیر متغیر سماج تھا۔

ہندوستانی سماج کی سست رفتار سیاسی اور معاشی ترقی کے اسباب کی تعین کرتے وقت، ہندوستانی معاشرے کی تمام برائیوں کو ذات پات کے نظام سے منسوب کرنا ایک پسندیدہ موضوع بن چکا تھا جو بعد کے مورخین نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ جیمس مل کی یہ پختہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں میں تاریخی شعور کی کمی کی اصل وجہ ثقافتی پچھڑا پن تھا۔ہندوستان کے ماضی کے بارے میں جیمس مل کے خیالات بہت حد تک ہندستانی معاشرے کے ان نظریاتی اصولوں سے ماخوذ تھے جن کا ذکر دھرم شاستروں یا قدیم قانونی کتابوں میں کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس نے ہندوستان کے ماضی کو افادیت پسند معیارات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی جن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔افادیت پسندوں کی نظر میں قانون کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ان کے نزدیک قانون اور انصاف پر مبنی حکومت سے زیادہ کوئی چیز عوام کو فائدہ نہیں دلا سکتی تھی۔ جیمس مل کے مطابق، پہلے کی حکومتیں، بالخصوص ہندو ریاستیں، سماجی انصاف میں ناکام رہی تھیں۔اس لیے جب جیمس مل کو ہندوستانی تہذیب میں مغربی اقدار و قوانین نظر نہیں آئے، تو اس نے اس کی شدید مذمت کی۔

حقیقت میں جیمس مل کے طاقت ور تاریخی بیانیہ کا مقصد "غیر" (ہندوستانی تہذیب) کو "خود" (مغرب) سے بالکل مختلف دکھاتے ہوئے مشرق پر مغرب کی ثقافتی برتری ثابت کرنا تھا۔مل نے ہندوستانی تاریخ کی جو زمانی تقسیم کی (periodisation)، وہ بنیادی طور پر مذہبی غلبہ میں ہونے والے ہیر پھیر پر مبنی تھی۔اس طرح اس نے ہندوستانی تاریخ کو ہندو، مسلم اور برطانوی (نہ کہ عیسائی) دور میں تقسیم کیا۔اس طرح کی تاریخ لکھنے میں جیمس مل نے Robert Orme کی تاریخ جس کا تعلق زیادہ تر فوجی مہمات سے تھا، Buchanan کے ہندوستان کے تئیں متعصبانہ رویہ اور Abbe Dubois کے مشنری نقطہ نظر سے مدد لی۔مزید یہ کہ مل نے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے ان کتابوں سے اکثر منفی بیانات مستعار لیے۔ جیمس مل کے کام میں بہت سی خامیاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے ہندوستان کا دورہ ہی نہیں کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اسے سنسکرت زبان کا کوئی علم نہیں تھا۔اور تیسری بات یہ کہ دوسروں کے کاموں پر اور سنی سنائی باتوں پر اس نے اس قدر بھروسہ کر لیا کہ وہ ہندوستان کے حقیقی ماضی سے کوسوں دور ہو گیا۔ لہٰذا وہ ایک ایسی صورت حال کا شکار ہو گیا جہاں اسے غلط فہمیوں اور افسانوں کی بنیاد پر ہندوستان کی ابتدائی تاریخ کا خاکہ کھینچنا پڑا۔

معروضیت اور صداقت کے معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود، جیمس مل کی کتاب بہت مقبول ہوئی۔ یہ برٹش انڈین سول سروس کے ان افسروں کے لیے ہندوستانی تاریخ پر ایک معیاری کتاب بن گئی، جو Haileybury میں موجود ایسٹ انڈیا کالج میں زیر تربیت تھے۔ہندوستان کے ماضی کے بارے میں اس کا یہ دعویٰ کہ ہندوستان ایک جامد اور غیر متغیر تہذیب تھی جہاں جابر حکمرانوں کا غلبہ تھا، 19ویں صدی کے یوروپ میں رائج مختلف مکاتب فکر کے درمیان ایک معیاری سند قرار پایا۔ جیمس مل نے سامراجیت کے پیغام کو اچھی طرح پھیلایا، جو بالکل وہی تھا جو انگلینڈ کا تعلیم یافتہ طبقہ سننا چاہتا تھا۔

12.3.3 ماؤنٹ اسٹورٹ ایلفنسٹن (Mount Stuart Elphinstone)

جہاں ایک طرف جیمس مل نے تاریخ کی توضیح افادیت پسندانہ نقطہ نظر سے کی،وہیں دوسری طرف ماؤنٹ اسٹورٹ ایلفنسٹن نے ایک گراں قدر تاریخ تصنیف کی۔ وہ ہندوستان میں سرکاری ملازم تھا۔ وہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کے حوالے سے جیمس مل کے مقابلہ میں زیادہ اچھی طرح تیار اور بہتر طور پر باخبر تھا۔اس کی کتاب *History of Hindu and Muhammadan India* (1841) جو ہیگل کے جدلیاتی نظریہ کے مطابق لکھی گئی تھی،ہندوستانی یونیورسٹیوں میں (1857 کے بعد سے) ایک معیاری کتاب بن گئی تھی۔ اگر مل کی کتاب تاریخ نویسی کے روشن خیالی مکتب فکر (Enlightenment School of Historiography) سے تعلق رکھتی تھی، تو ایلفنسٹن کی تاریخ رومانوی مکتب فکر کی ترجمان تھی، جو انسانیت پسند زیادہ اور منطقی کم تھی۔اس نے تاریخ کے بارے میں Vico کے اس تصور سے اتفاق کیا کہ انسانی فطرت کو کبھی بھی ایک عام پیمانہ سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ لہٰذا اس نے افادیت پسندوں کے تاریخی نظریے کی تردید کی، جو ہندوستانی تاریخ کے ہندو اور مسلم دور سے ناواقف تھے۔اس کی کوشش تھی کہ برطانوی ہندوستان کی ایک ایسی تاریخ لکھی جائے جو انگریز عوام میں دلچسپی پیدا کر سکے۔ لہٰذا ایک دوسری کتاب بنام *History of the British Power in the East* میں اس نے منظم طریقے سے لارڈ ہیسٹنگز کے عہد تک برطانوی حکومت کی توسیع اور استحکام کا احاطہ کیا۔اس نے ہندوستانی تاریخ کو "عہد قدیم" اور "عہد وسطی" میں تقسیم کیا، جس کا اطلاق بالترتیب "ہندو" اور "مسلم" دور پر کیا گیا۔اس تصور کا مستقبل میں فروغ پانے والی ہندوستانی تاریخ نویسی پر گہرا اور دیرپا اثر پڑا۔

جیمس مل کی تاریخ اور ایلفنسٹن کی تاریخ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مل کا قیاس یہ تھا کہ انسانی فطرت پوری دنیا میں ایک جیسی ہے اور اسے قانون اور حکومت کے ذریعہ بہتر بنایا جا سکتا ہے اور یہ ثابت کرنا مورخ کا فریضہ ہے۔اس کے برعکس ایلفنسٹن کا خیال تھا کہ انسانی فطرت پوری دنیا میں یکساں نہیں ہے بلکہ یہ ہر خطے اور زمانے کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے اور مورخ کا کام صرف انسانی فطرت کے پہلوؤں کا بیان کرنا ہے، نہ کہ ان کے بارے میں صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنا۔ اگر مل نے ہندوستانی مورخین کو چیلنج کر کے ان کے اندر بحث کرنے کا مادہ پیدا کیا، تو ایلفنسٹن کے نرم لہجے نے ایک تنقیدی مزاج پیدا کیا جس نے ہندوستانیوں کو ملک کے مسائل کا صحیح تناظر میں مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا۔اس دوران، جیمس مل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، ہنری ایلیٹ اور ڈاوسن (Elliot and Dowson) جیسے متعدد برطانوی دانشوران نے مسلمانوں پر سخت تنقید کی، جو ہندوستان میں فرقہ پرستی کا بیج بونے میں نقصان دہ ثابت ہوا۔

حالانکہ ایلفنسٹن کی کتاب ایک نصابی کتاب کی حیثیت سے انتہائی مقبول رہی، خاص طور سے ہندوستان میں 1860 کی دہائی میں ایک اور زیادہ مستند اور پیشہ ورانہ تاریخ J. Talboys Wheeler کے ذریعہ منظر عام پر آئی۔ J. Talboys Wheeler نے 1867 سے 1876 کے درمیان پانچ جلدوں میں ایک جامع کتاب بنام *History of India* لکھی۔اس نے 1886 میں *India Under British Rule* بھی لکھی تھی۔

12.3.4 تھامس بابنگٹن میکالے (Thomas Babington Macaulay)

میکالے ایک مؤرخ، مضمون نگار اور سیاست داں تھا، جس نے 1826ء میں قانونی پیشے میں قدم رکھا۔ 1834ء میں اسے حکومت ہند کا رکن مقرر کیا گیا، جہاں اس نے پریس کی آزادی کا اعلان کیا، یوروپیوں اور ہندوستانیوں کو قانون کی نظر میں برابر قرار دیا، قومی تعلیم کے نظام کی شروعات کی، انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر متعارف کرایا، فوجداری قانون کو باضابطہ منظم کیا اور 1838ء میں انگلینڈ واپس چلا گیا۔ ہندوستان پر میکالے نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر Robert Clive اور Warren Hastings کے بارے میں تحریر کیے گئے مضامین ہیں۔ اگرچہ اس کے مضامین میں غلط فہمیاں بھری ہوئی ہیں، لیکن پھر بھی وہ پڑھنے والے کے اندر دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ ان مضامین نے انگریز عوام کی توجہ اس طرح اپنی طرف کھینچی کہ ہندوستان ان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ان دونوں مضامین میں میکالے نے ایک قسم کی سیاسی خود احتسابی (Political Self-Introspection) سے کام لیا جو برطانوی تاریخ نویسی میں ایک صحت مند رجحان تھا۔ تھامس میکالے نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ تمام مشرقی زبانوں میں موجود سارا علم، خواہ وہ سنسکرت میں ہو یا فارسی میں، مغربی دنیا کی لائبریری کے ایک شیلف میں موجود علم کے برابر نہیں ہے۔ اگرچہ یہ خیال حقیقت سے بہت دور تھا، لیکن یہی تصور رائج ہو گیا۔ میکالے نے راجہ رام موہن رائے جیسے بے شمار ہندوستانیوں کو متاثر کیا۔

12.3.5 سر ہنری مین (Sir Henry Maine)

قانونی تاریخ کے میدان میں Sir Henry Maine کی خدمات بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک عظیم قانونی مؤرخ کے طور پر مین (Maine) نے خود کو قدیم ہندوستانی قوانین کے مطالعہ میں لگایا۔ اس کی کتاب *Ancient Law* (1861) اور ہندوستانی دیہی آبادیوں پر اس کی تحقیق تاریخ میں معرکۃ الآراء تصانیف کا مقام رکھتی ہیں۔ اس نے قانون اور قانونی اداروں کو رومی قانون کے محدود دائرے سے نکال کر قانون کے سلسلہ میں اہل یوروپ کی سوچ کو تبدیل کیا۔ اگرچہ اس کے کاموں نے 19ویں صدی کے یوروپی دانشوران پر زیادہ اثر نہیں ڈالا پھر بھی وہ علم سماجیات (Sociology) کو متاثر کرنے میں ضرور کامیاب رہا جو میکس ویبر (Max Webber) وغیرہ کے ہاتھوں مزید پروان چڑھا۔ یوروپی تاریخ کے سائنسی مطالعہ میں ہونے والی علمی اور تکنیکی ترقی نے 19ویں صدی کے آخر میں ہندوستان پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے علوم جیسے علم آثار قدیمہ (Archaeology)، علم کتبات شناسی (Epigraphy) اور علم مسکوکات (Numismatics) سامنے آئے جنھوں نے تاریخ کا ایک مجموعی اور کلی طور پر مطالعہ کرنے کے ضمن میں ایک نئی راہ دکھائی۔ 1837ء میں جیمس پرنسپ (James Princep) نے براہمی (Brahmi) رسم الخط کو پڑھنے میں کامیابی حاصل کی جس کی وجہ سے کتبات کے مطالعہ کے لیے ایک نیا دروازہ کھل گیا۔

اس کے بعد سے ماہرین ہند نے قدیم ہندوستانی کتابوں اور کتبات کو جمع کرنے، ترجمہ کرنے اور شائع کرنے کے لیے انتھک محنت کی ہے۔ اس کام میں بے شمار "مقامی" دانشوروں نے بھی ان کی مدد کی۔ اسی طرح سکوں کے تجزیہ نے سیاسی اور خاندانی تاریخ کے مطالعہ میں

اہم رول ادا کیا۔Geological Survey کے افسران نے بہت سے ماقبل تاریخی مقامات اور اوزار دریافت کیے۔جن سے ماقبل ہندوستانی تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پڑی۔اسی طرح Alexander Cunningham کے ذریعہ 1871ء میں Archaeological Survey of India کے قیام کے ساتھ قدیم ہندوستان کے مادی باقیات کو تلاش کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں اہم پیش رفت ہوئی۔تاہم ان مآخذ کی دریافت چونکہ نوآبادیاتی تناظر میں ہوئی تھی،اس لیے ان پر مغربی نقطہ نظر کا غلبہ تھا۔

12.3.6 ونسنٹ اسمتھ (Vincent Smith)

ونسنٹ اسمتھ ہندوستان میں ایک برطانوی ملازم تھا۔اس کی جامع کتاب *The History of India* کو جو 1911ء میں شائع ہوئی تھی، تقریباً تمام ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نصاب میں مستند نصابی کتاب کے طور پر شمار کیا جاتا تھا۔جب اسمتھ نے اپنی کتاب لکھی اس وقت تک اچھا خاصا تاریخی مواد، جو کتبات، آثار قدیمہ، مسکوکات اور عمارتوں سے حاصل کیا گیا تھا، منظر عام پر آچکا تھا۔کلاسیکی یونانی اور رومی تہذیبوں کا اسمتھ اس قدر دلدادہ تھا کہ اس نے ان کے کارناموں کو ہندوستانی تاریخ کے مطالعہ کا پیمانہ بنالیا۔لہٰذا اس نے "ہیروز کا زمانہ" اور "سلطنت کا زمانہ" جیسے تصورات کا استعمال کیا۔اس طرح ہندوستانی تاریخ کی تشریح کرتے وقت اشوک (تیسری صدی قبل مسیح) اور چندر گپت دوم (چوتھی صدی عیسوی) کے دور کو زمانہ قدیم ہندوستان کے شاندار دور کی طرح پیش کیا۔اس کے برعکس اسمتھ نے درمیانی ادوار کو "تاریک دور" کے طور پر دیکھا جس میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئی تھیں۔اس کی نظر میں یہ دور اس لیے افراتفری اور لاقانونیت کا دور تھا کیونکہ اس میں مرکزی بادشاہت نہیں تھی۔عہد قدیم اور عہد وسطی میں بڑی ریاستوں کے اختتام پر پیدا ہونے والا سیاسی انتشار، اسمتھ کے مطابق، ہندوستانیوں کے لیے ایک واضح سبق تھا۔اس کی تحریروں سے یہ بالکل ظاہر تھا کہ اس کی نظر میں یہ برطانوی حکومت کا مضبوط سیاسی اقتدار ہی تھا جس نے ہندوستان کو ترقی کے ساتھ استحکام کی راہ پر گامزن رکھا اور اس کے مطابق اگر ہند برطانوی حکومت ختم ہو جاتی ہے تو ایک ایسا سیلاب آئے گا جو انگریزوں کے دور میں حاصل ہونے والی تمام ترقی کو الٹ کر رکھ دے گا۔اسمتھ کا پیغام بالکل واضح تھا۔

12.3.7 ولیم ہیریسن مورلینڈ (William Harrison Moreland)

مورلینڈ نے ہندوستان کی معاشی تاریخ نویسی کا آغاز کیا۔اس نے Land Record and Agriculture کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں اور 1914ء میں ICS سے سبکدوش ہوا۔اس نے بستیوں اور آبادیوں کے مطالعہ میں گہری دلچسپی دکھائی۔اس کی کئی کتابیں ہیں جن میں (1904) *The Agriculture of the United Provinces*، *The Revenue Administration of the United Provinces* (1911)، *The Agrarian System of Moslem India* (1929) شامل ہیں۔مورلینڈ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ برطانوی محصول کا نظام مغلیہ نظام کی پیداوار تھا جس کی جڑیں ہندو نظام میں پیوست تھیں۔مغل ریاست کے معاشی حالات کے بارے میں اس کا تجزیہ انتہائی جانبدارانہ تھا۔اس کی تحقیقات نے ایک ریاست کے سیاسی استحکام میں معاشی عوامل و محرکات (economic forces) کے اہم کردار کی نشاندہی کی۔

12.4 ہندوستانی تاریخ کی زمانی تقسیم (Periodisation of Indian History)

جہاں تک ہندوستانی تاریخ کی زمانی تقسیم (periodisation) کا تعلق ہے، سامراجی دانشوروں اور مستشرقین نے جن بنیادوں پر ہندوستانی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا، ان میں حکمراں خاندانوں اور مذہب میں تبدیلی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ایک طرف جیمس مل نے ہندوستانی تاریخ کو ہندو، مسلم اور انگریزوں میں تقسیم کیا، تو دوسری طرف اسمتھ نے عہد قدیم، عہد وسطی اور عہد جدید میں بانٹا۔ لیکن اسمتھ کی تحریروں میں بھی عہد قدیم کو ہندو اور عہد وسطی کو مسلم دور کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ ابتدائی عہد وسطی ہند کو اسمتھ نے "تاریکی کا دور" (Period of Darkness) کہا کیوں کہ اس دور میں بڑی بڑی شاہی ریاستیں موجود نہیں تھیں۔ اس طرح جیمس مل سے لیکر اسمتھ تک ہندوستانی تاریخ نویسی پر یوروپ مرکوز نظریہ (Euro-centric Approach) بہت حاوی رہا۔ ان کی تحریریں "مشرقی مطلق العنانیت" (Oriental Despotism) کے تصور سے متاثر تھیں جو کارل مارکس کے Asiatic Mode of Production کے ماڈل میں بھی پایا جاتا ہے جسے مارکس نے ہندوستانی ریاست اور معاشرے کی نوعیت کو بیان کرنے میں استعمال کیا تھا۔

اوپر جن کتابوں پر بحث ہوئی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام برطانوی تاریخی تحریریں یکساں طور پر نوآبادیاتی فکر کی حامل نہیں تھیں، بلکہ 19 ویں اور 20 ویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی نوآبادیاتی تحریروں کے اندر مختلف نقطہ نظر اور توضیحی فریم ورک پائے جاتے تھے۔ البتہ کچھ خصوصیات ایسی ضرور تھیں جو زیادہ تر تاریخی تحریروں میں مشترک تھیں۔ ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل سطور میں بیان کیا جاتا ہے۔

- اکثر برطانوی تحریروں میں ہندوستان کو بطور ایک "مشرقی تہذیب" (Orient) کے پیش کرنا عام بات تھی اور اس طرح نوآبادی (یعنی ہندوستان) کے مقابلہ میں جدید مغربی تہذیب کی برتری کو فروغ دیا گیا۔
- ہندوستان کو ایک کمتر ملک سمجھا گیا جس میں اتحاد کی کمی تھی۔ اس تصور کو برطانوی تاریخی بیانیہ میں بہت اہمیت دی گئی۔ اس کے علاوہ ان تحریروں میں 18 ویں صدی کے ہندوستان کو "تاریک صدی" (Dark Century) کے طور پر پیش کیا گیا جہاں لاقونیت، افراتفری اور بربریت کا دور دورہ تھا۔ اور انگریز اس ملک کو اس طرح کے انتشار سے نجات دلانے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے "مسیحا" بن کر نازل ہوئے تھے۔
- ہندوستان کو ایک جمود کا شکار سماج کے طور پر دیکھا گیا جہاں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ یہ انگریزوں کی حکومت تھی جس نے ترقی کی راہ دکھائی۔
- معروف مؤرخ Eric Stokes نے صحیح کہا ہے کہ نوآبادیاتی تاریخ نویسی فی الحقیقت ایک نظریاتی کوشش تھی جس میں تاریخ کو ثقافتی بالادستی قائم کرنے اور ہندوستان پر برطانوی حکمرانی کو جائز ٹھہرانے کے لیے بطور آلہ کے استعمال کیا گیا۔

12.5 ہندوستان پر نوآبادیاتی تاریخ نویسی کا اثر

(Impact of Colonial Historical Writings on India)

ہندستان کے ابتدائی برطانوی مؤرخین کی تاریخ نویسی نے چند مثبت اثرات بھی مرتب کیے۔اس نے اثباتیت پسند طریقہ کار (Positivist Methodology)پر تاریخ نویسی کی بنیادیں رکھیں۔نوآبادیاتی مؤرخین نے Asiatic Society اور Archaeological Survey of India جیسے ادارے قائم کرکے بھی اہم خدمات انجام دیں۔بہت سے ہندوستانی مؤرخین کو ان اداروں میں کام کرنے کا موقع ملا اور اس طرح انہیں تحقیق کے میدان میں ضروری تربیت ملی۔اس کے ساتھ ساتھ برطانوی نوآبادیاتی مؤرخین نے معلومات کا وسیع ذخیرہ اکٹھا کیا اور دستاویزات کو احتیاط سے محفوظ کیا جو آج بھی ہندوستان کے ماضی کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک اہم ماخذ ہے۔اس کے علاوہ، کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں قائم کی گئی پہلی تین یونیورسٹیوں میں (جو 1857-58 کے دوران قائم ہوئی تھیں)تاریخ کو بطور علم متعارف کرایا گیا۔اگرچہ ان یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ برطانوی سامراج کے حق میں انتہائی متعصب تھی، تاہم اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔پہلا تو یہ کہ جیمس مل اور ایلفنسٹن کی کتاب کے ساتھ ساتھ ہندوستانی طلباء انگلینڈ اور یوروپ کی تاریخیں بھی پڑھتے تھے۔اس طرح بہت سے نوجوان تعلیم یافتہ ہندوستانی آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نظریات سے واقف ہوئے، جن کی مثالیں یوروپی تاریخ میں موجود تھی۔

دوسرا یہ کہ ہندوستانیوں کو تحقیق کرنے اور تاریخ لکھنے کی پیشہ وارانہ تربیت ملی۔چنانچہ ہندوستانی مؤرخین بھی تاریخ کو جدید طرز پر لکھنے اور پڑھانے میں مشغول ہوگئے۔تیسرا اور اہم پہلو یہ کہ ہندوستانی طلبا کو جو تاریخ پڑھائی جاتی تھی، یعنی 19ویں صدی کے برطانوی افسر مؤرخین کی لکھی گئی کتابیں، اس نے برطانوی تاریخ نویسی کے خلاف طلبا میں ایک تنقیدی ردعمل پیدا کیا۔ایسی تاریخی کتابوں سے غیر مطمئن ہو کر ہندوستانی یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ بنکم چندر چیٹرجی نے بار بار یہ سوال اٹھایا کہ "ہم اپنی تاریخ کب لکھیں گے"؟ ربندناتھ ٹیگور نے بڑی وضاحت اور فصاحت سے کہا کہ "دوسرے ملکوں میں تاریخ ملک کے باشندوں کے سامنے ملک کی اصل تصویر پیش کرتی ہے، جب کہ ہندوستان کی تاریخ جو انگریزوں نے ہمیں تحفہ میں دی ہے، ہندوستان کو ہماری نظروں سے اوراوجھل کر دیتی ہے۔ہم اس تاریخ میں اپنے مادر وطن کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں۔" یہی ہندوستانی دانشوروں کا عام ردعمل تھا اور اس ردعمل نے چند ذہین قومیت پسندوں کو تاریخ کے تجزیہ کے لیے آمادہ کیا۔اس طرح ہندوستانی تاریخ کی ایک قومیت پسند توضیح (Nationalist Interpretation) سامنے آئی، جس نے برطانوی نوآبادیاتی تاریخ نویسی کی بالادستی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔تاریخ لکھنا قومی تشخص کا شعور پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

12.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے ہندوستانی تاریخ کے تئیں نوآبادیاتی نقطہ نظر سے واقفیت حاصل کرلی ہے۔ان کی تحریروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی مکتب فکر کے افادیت پسند مؤرخین نے ہندوستانی تہذیب کو پسماندہ تصور کیا، جس میں تاریخ کا شعور نہیں تھا۔ان

تحریروں نے ایک طرف فرقہ پرستی کا بیج بھی بویا اور دوسری طرف قوم پرستی کے احساس کو بھی جنم دیا۔نو آبادیاتی تاریخ نویسی نے بیشتر ہندوستانیوں کو اپنے ماضی کی طرف دیکھنے کے لیے بیدار کیا۔لہٰذا نو آبادیاتی تاریخ نویسی کا مقصد اگرچہ انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی بالا دستی قائم کرنا تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے قومی اور علاقائی تاریخ نویسی کی ترقی کے لیے خوش آئند محرک بھی فراہم کیا۔ مختصراً یہ کہ آپ نے ہندوستانی ثقافت اور انتظامیہ کے بارے میں برطانوی مؤرخین کے تاثرات کے بارے میں جان لیا ہے۔یہ بھی سمجھ لیا ہے کہ کس طرح برطانوی مؤرخین نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہندوستانی ثقافت پر غلبہ قائم کرنے کی کوشش کی۔اس کے ساتھ ساتھ آپ کے اندر برطانوی دانشوران کی خدمات کے تئیں ستائش کا جذبہ بھی پیدا ہوا ہوگا جنہوں نے بے شمار ہندوستانی آ‌ماخذ جیسے کتبات، سکے اور آثار قدیمہ وغیرہ کی دریافت کر کے تاریخی تحقیق میں نئے رجحانات پیدا کیے۔

12.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

نو آبادیاتی یا سامراجی طریقہ کار	:	وہ طریقہ کار جس کے تحت نو آبادیاتی نقطہ نظر کے حامل مؤرخین مقبوضہ نو آبادی (جیسے ہندوستان) کی تاریخ لکھیں۔
ایشیائی طریقہ پیداوار	:	(Asiatic Mode of Production) کارل مارکس نظریہ جس کی مدد سے اس نے ایشیائی ممالک کے نظام پیداوار کو سمجھایا۔
ہیل بری کالج	:	(Haileybury College) وہ کالج جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی افسروں کو تربیت دی جاتی تھی۔

12.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. *Observations on The State of Society Among the Asiatic Subjects of India* کس نے لکھی؟
2. *The History of British India* کا مصنف کون تھا؟
3. ماؤنٹ ایلفنسٹن کی کتاب *History of Hindu and Muhammedan India* کب شائع ہوئی؟
4. میکالے کا پورا نام کیا ہے؟
5. 'Archeological Survey of India' کس نے اور کب قائم کیا؟
6. براہمی (Brahmi) رسم الخط کو کس نے پہلی بار پڑھا؟
7. مورلینڈ کا پورا نام کیا ہے؟

8. 'Asiatic Mode of Production' کا تصور کس نے پیش کیا؟
9. "ہم اپنی تاریخ کب لکھیں گے؟" یہ سوال کس نے اٹھایا؟
10. رابندر ناتھ ٹیگور نے برطانوی مؤرخین کی لکھی ہوئی ہندوستانی تاریخ کے بارے میں کیا کہا؟

12.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جیمس مل پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. ہندوستان کے بارے میں مستشرقین کی تحریروں کی خصوصیات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. W.H. Moreland کون تھا اور تاریخ نویسی میں اس کی کیا خدمات ہیں؟
4. 'ہندوستانی تاریخ کو نو آبادیاتی مؤرخین نے ادوار میں تقسیم کیا'۔ تبصرہ کریں۔
5. رومانویت پسند مؤرخین پر ایک مضمون لکھیے۔

12.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستانی تاریخ نویسی کے حوالے سے سامراجی مؤرخین کی خدمات پر ایک مضمون تحریر کریں۔
2. ہندوستانی قومیت پسند مؤرخین کو ایسا کیوں محسوس ہوا کہ انہیں اپنی تاریخ خود لکھنی چاہیے؟
3. کیا آپ اس بات سے متفق ہیں کہ تمام مشرقی زبانوں میں موجود سارا علمی سرمایہ یوروپی لائبریری کے ایک شلف میں موجود علم کے برابر نہیں ہے۔ اگر ہاں یا نہیں، تو کیوں؟

12.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ali, Sheik B., *History: Its Theory and Methods*, MacMillan, Delhi, 1978.
2. Carr, E.H., *What is History?* Harmondsworth, Penguin, New York, 1961, 1977.
3. Davies, Stephen, *Empiricism and History*, Palgrave, New York, 2003.
4. Marwick, Arthur, *The Nature of History*, Palgrave, New York, 1989 (1970).
5. McCullagh, Behan C., *The Truth of History*, Routledge, London & New York, 1998.
6. McCullagh, Behan C., *The Logic of History*, Routledge, London & New York, 2004.

اکائی 13۔ قوم پرست اور فرقہ وارانہ تاریخ نویسی

(Nationalist, and Communal Historiography)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 قوم پرست تاریخ نویسی کی ابتدا

13.3 ما قبل نوآبادیاتی تاریخ سے متعلق قوم پرست نقطہ نظر

13.4 قوم پرست تاریخ نویسی کی حدود

13.5 فرقہ وارانہ تاریخ نویسی

13.6 فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی ابتداء

13.7 ہندوستانی تاریخ کی فرقہ پرست تشریحات

13.7.1 ہندوؤں اور مسلمانوں کو مخالف برادریوں کے طور پر تقسیم کرنا

13.7.2 تاریخی دشمنی

13.7.3 عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کو حکمران اور ہندوؤں کو رعایا کے طور پر دیکھنا

13.7.4 ہندوستانی تاریخ کا سنہرا اور تاریکی دور

13.8 قوم پرست بمقابلہ فرقہ وارانہ تاریخ نویسی

13.9 فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی تنقید

13.10 اکتسابی نتائج

13.11 کلیدی الفاظ

13.12 نمونہ امتحانی سوالات

13.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں تاریخ نویسی ہمیشہ عصری سیاست اور نظریات سے متاثر رہی ہے۔ تاریخ میں قوم پرست اور فرقہ پرستانہ نقطہ نظر کا عروج اسی طرح اپنے عہد کی سیاست اور نظریات سے متاثر ہوا۔ ہندوستانی تاریخ میں قوم پرستانہ نقطہ نظر کا مقصد قوم پرستی کے احساس کو فروغ دینا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو ان کے مذہب، ذات، طبقے یا زبان سے قطع نظر متحد کرنا تھا۔ اس قسم کی تاریخ نویسی ہندوستانی قومی تحریک کے دوران سامنے آئی جس نے ہندوستانیوں سے اتحاد کا مطالبہ کیا ساتھ ہی اس اتحاد کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی متاثر کن تاریخ کو اجاگر کرنا بھی ضروری سمجھا۔ قوم پرست تاریخ نویسی کے جواب کے طور پر فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ اس نے تاریخ کے مرکزی موضوع کے طور پر 'مذہب' پر توجہ دی۔ ہندوستان میں، تاریخ کے اس نقطہ نظر نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ بیداری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ در حقیقت یہ 'تاریخ' کی نصابی کتب اور تاریخ کی تعلیم ہی ہے جس نے فرقہ واریت کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس اکائی میں، آپ کو ہندوستانی تاریخ نویسی کے ان دو طریقوں سے متعارف کرایا جائے گا، جو 20ویں صدی کے اوائل میں نمایاں تھے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ان حالات کو سمجھیں گے جن کی وجہ سے قوم پرست اور فرقہ پرست تاریخی نقطہ نظر کا ظہور ہوا۔
- ان تاریخی نقطہ نظر کے اہم پہلوؤں کو دریافت کریں گے۔
- قوم پرست مورخین اور ان کے قابل ذکر کاموں سے واقفیت حاصل کریں گے۔

13.2 قوم پرست تاریخ نویسی کی ابتدا (Genesis of Nationalist Historiography)

ہندوستانی تاریخ کے بارے میں قوم پرست نقطہ نظر کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ، ایسا نقطہ نظر، جس کا مقصد قومی شناخت کے احساس کو فروغ دینا اور متنوع ثقافتوں، مذاہب، زبانوں کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی طبقات اور ذاتوں کے لوگوں کو اکٹھا کرنا ہے۔ ابتدائی طور پر، ہندوستانی مورخین نے ہندوستانی تاریخ کے بارے میں لکھتے وقت نو آبادیاتی تاریخ نویسی کے طریقوں کی پیروی کی۔ پچھلے حصے میں، ہم نے بحث کی تھی کہ کس طرح برطانوی مورخین نے ایشیاٹک سوسائٹی (Asiatic Society) اور آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (Archaeological Survey of India) جیسے ادارے قائم کر کے ہندوستانی مورخین کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ ان اداروں نے نہ صرف تاریخی اعداد و شمار کے وسیع ذخیرہ کو جمع کرنے میں سہولت فراہم کی بلکہ نوجوان ہندوستانیوں کو جدید سائنسی طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے تاریخی تحقیق، تدریس اور تاریخ کی کتابیں لکھنے میں تعلیم اور رہنمائی بھی فراہم کی۔ بہت سے نو آبادیاتی مصنفین اور منتظمین کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں میں قومی یکجہتی، جمہوری روایات، اختراع، تخلیقی صلاحیت، اقتصادی ترقی اور تاریخی بیداری جیسی کچھ خصوصیات کی کمی ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ ان کوتاہیوں نے ہندوستانیوں کے لیے غیر ملکی حملوں کے خلاف اپنا دفاع کرنا مشکل بنا دیا۔ انیسویں

صدی کے دوران برطانوی سرکاری ملازم مورخین کی کتابوں میں ہندوستان کی اس تصویر کشی نے نوآبادیاتی تاریخ نویسی کے خلاف سخت رد عمل کو جنم دیا۔ہندوستانی یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ،بنکم چندر چٹرجی نے بار بار یہ سوال اٹھایا کہ ،"ہم اپنی تاریخ کب لکھیں گے ؟" یہ جذبہ ہندوستانی دانشوروں میں عام تھااوراس نے کچھ ممتاز قوم پرست مفکرین کو ہندوستانی تاریخ پر ایک نیا تناظر تلاش کرنے کی ترغیب دی۔ اس نے برطانوی نوآبادیاتی تاریخ نویسی کے غلبے کو چیلنج کرتے ہوئے ہندوستانی تاریخ کی ایک قوم پرست تشریح کو پیش کیا۔تاہم،تاریخ نویسی قومی تشخص کے شعور کی تعمیر کاایک بڑاذریعہ بن گیا۔

13.3 ماقبل نوآبادیاتی تاریخ سے متعلق قوم پرست نقطہ نظر

(Nationalist Approach to Pre-Colonial History)

ہندوستان میں،تاریخ کے بارے میں نیشنلسٹ نقطہ نظر کی جڑیں اس طرح سے تلاش کی جاسکتی ہیں جس طرح برطانوی اور یوروپی دانشوران نے ابتدامیں ہندوستانی تاریخ کی تشریح کی۔ان کی تحریروں نے 19ویں صدی کے آخراور20ویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی مورخین کو متاثر کیا، اس دور میں ہندوستانی مورخین کی زیادہ تر تحریروں کو ہندوستانی تاریخی اسکول (Indian Historiographical School) یانیشنلسٹ اسکول (Nationalist School) کہاجاتاہے۔اس اسکول کے اندر،دو اہم رجحانات تھے۔ایک رجحان نے نوآبادیاتی تاریخ نویسی (Colonial Historiography) کے نقطہ نظر کو جاری رکھا، جبکہ دوسرارجحان ہندوستانی تاریخ پر مستشرقین (Orientalist) اور سامراجی (Imperialist) تحریروں کے جواب میں ابھرا۔آیئے ان دورجحانات پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔

نوآبادیاتی نقطہ نظر(colonial approach)کے بعد،ابتدائی رجحان کے ہندوستانی مورخین نے ہندوستانی تاریخ کو بنیادی طور پر اشرافیہ کے نقطہ نظر(elitist perspective) سے لکھاہے۔ان کے نقطہ نظر میں حقائق کو سائنسی انداز میں پیش کرنا شامل تھا، جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں بڑے حکمران خاندانوں (major ruling dynasties) کی سیاسی تاریخ پر زور دیا گیا تھا۔انہوں نے مذہب،ذات پات اورزبان سے تعلق جیسے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا۔یہ ابتدائی مورخین سنسکرت کے ماخذ مواد کواستعمال کرنے میں ماہر تھےاور متن(texts)،سکوں (coins)، نوشتہ جات (inscriptions) اور دیگر ذرائع سے احتیاط سے معلومات اکٹھی کرتے تھے۔ تاہم،انہوں نے نوآبادیاتی نقطہ نظر کااشتراک کیاکہ ہندوستانی سیاسی،انتظامی، یااقتصادی طور پر خود حکمرانی کے قابل نہیں تھے اوران میں تاریخ کااحساس نہیں تھا۔یہ نقطہ نظر بنکم چندراور آر جی بھنڈار کرجیسی شخصیات کی ابتدائی تحریروں میں واضح تھا۔ان کاخیال تھاکہ ہندوستانیوں کے پاس تاریخی شعور، قومیت کااحساس یاقومی اتحاد کاتصور نہیں ہے۔

20ویں صدی کے اوائل میں چیزیں بدلناشروع ہوگئیں۔ہندوستانی مورخین، قوم پرستی اور قوم پرست تحریک سے متاثر ہوکر، تاریخ کے نوآبادیاتی ورژن کو چیلنج کرنے لگے۔انہوں نے نوآبادیاتی مورخین کے پیش کردہ دقیانوسی تصورات کا مقابلہ کرنے کے لیے نئ

داستانیں تخلیق کیں۔ان کا مقصد اپنی تاریخی تحریروں کے ذریعے ہندوستانی قوم کا سر فخر سے بلند کرنا تھا۔کچھ قابل ذکر مورخین جنھوں نے قوم پرست تاریخ نویسی کے اس رجحان کی پیروی کی ان میں ایچ سی رے چودھری(H.C. Ray Chaudhari)، کے پی جیسوال (K. P. Jayaswal)، آر سی مجمدار (R.C. Majumdar) آر کے مکھرجی (R.K. Mukherjee)، اے ایس الٹیکر(A.S. Altekar)، اور ایچ سی اوجھا (H. C. Ojha) شامل تھے۔

انہوں نے نوآبادیاتی مصنفین سے سخت اختلاف کیا جو یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں میں قومیت اور جمہوری روایات کا احساس نہیں ہے، جیسا کہ قدیم یونان اور روم میں یورپیوں کے پاس تھا۔مزید برآں، برطانوی حکمرانوں کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں میں جدت اور تخلیقی صلاحیتوں کی کمی ہے۔اس کے نتیجے میں، وہ سمجھتے تھے کہ قانون کے سامنے مساوات، معاشی ترقی، سماجی مساوات کے نظریات، ادارے، رسم و رواج، فنون اور دستکاری جیسی زیادہ تر مثبت چیزیں ہندوستان کے باہر سے لائی پڑتی ہیں۔ان منفی خیالات نے نہ صرف ہندوستانی قوم پرست مورخین اور دانشوروں کے فخر کو ٹھیس پہنچائی بلکہ ہندوستانی دانشوروں میں خود حکومت، جمہوریت اور قانون سازی کی اصلاح کے بڑھتے ہوئے مطالبے کو بھی ہوا دی۔ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے ماضی کا مطالعہ ان مقاصد کی کلید ہے۔اس لیے انھوں نے بنیادی ذرائع پر تفصیلی تحقیق کی اور ہندوستان کی تاریخ کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے نئے اور تازہ ذرائع کی تلاش کی۔ہندوستانی مورخین نے اپنی کوششوں میں، نوآبادیاتی تاریخی واقعات میں پیش کی گئی غلط اور جھوٹی کہانیوں کو درج ذیل دلائل کا استعمال کرتے ہوئے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی:

1. انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہندوستان کی روحانی روایت، جو اس کی تاریخ میں جڑی ہوئی ہے، اسے مغرب سے برتر بناتی ہے جو مادیت سے زیادہ اخلاقی اقدار پر زور دیتی ہے۔
2. وہ اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ ہندوستانیوں نے صرف روحانیت پر توجہ مرکوز کی بلکہ مختلف شعبوں جیسے حکمرانی، سلطنتیں بنانے، سفارت کاری، ٹیکس، فوج، زراعت، صنعت اور تجارت میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔
3. بیسویں صدی کے اوائل میں، مورخین نے ہندوستان کے تاریخی سیاسی اور سفارتی نظاموں کے بارے میں ایک اہم دریافت کی۔ انہوں نے ان قدیم ہندوستانی اداروں اور معاصر یورپ کے اداروں میں مماثلت پائی۔ان مورخین نے اس خیال سے سخت اختلاف کیا کہ قدیم ہندوستانی مؤثر طریقے سے حکومت کرنے کے قابل نہیں تھے۔انہوں نے کوٹیلیا کے لکھے ہوئے "ارتھ شاستر" کی دریافت کو سراہا اور ثابت کیا کہ ہندوستانیوں کو حکومت چلانے، سفارت کاری کو سنبھالنے اور معیشت کو سنبھالنے میں اعلیٰ سطح کی مہارت حاصل ہے۔یہاں تک کہ، بہت سے لوگوں نے کوٹیلیہ کی تعریف کی اور اس کا موازنہ میکیاولی اور بسمارک سے کیا۔
4. انہوں نے ریاست پر مذہب کے غالب اثر سے بھی انکار کیا اور مؤخر الذکر کے سیکولر کردار پر زور دیا۔انہوں نے اس نظریے کی بھی تردید کی کہ قدیم ہندوستانی ریاست مطلق العنان اور جابر تھی۔
5. کچھ دوسرے لوگوں نے اس نظریے کی تردید کی کہ ہندوستانی حکمرانوں کو عوام کی فلاح و بہبود کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔انہوں نے ریاست میں مقبول عنصر کی مضبوط موجودگی پر زور دیا اور قدیم دور کا سیاسی ڈھانچہ جدید جمہوریتوں سے مشابہت رکھتا تھا، جس میں

بادشاہ کے اختیارات زیرِ نگرانی تھے اس پر بھی زور دیا۔

6. کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی بادشاہوں کے پاس زیادہ طاقت نہیں تھی اور بعض اوقات ان پر 'منتری پریشد' کہلانے والی کونسل کا کنٹرول ہوتا تھا، جیسا کہ برطانیہ کی پریوی کونسل (Privy Council of Britain) ۔انہوں نے اکثر مقامی خود حکومتوں کی موجودگی کا بھی ذکر کیا، جیسے جمہوری طور پر منتخب گاؤں پنچایتیں وغیرہ۔ کچھ مصنفین نے اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ چندر گپتا، اکبر اور شیواجی کے دور میں کابینہ کے نظام کے بارے میں بھی بات کی۔

7. 1915 میں کے۔پی۔ جیسوال نے "ہندو پولیٹی" (*Hindu Polity*) نامی کتاب لکھی۔اس کتاب میں، اس نے دلیل دی کہ قدیم ہندوستانی جمہوریہ کا سیاسی نظام یونانی شہری ریاستوں جیسا تھا، جس میں جمہوریت اور نمائندہ حکومت کے تصورات شامل تھے۔

8. بنیادی طور پر، قوم پرستانہ نقطہ نظر یہ بتاتا تھا کہ مغرب میں سیاسی طور پر مثبت ہر چیز ہندوستان میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ مثال کے طور پر، آر سی مجمدار نے اپنی کارپوریٹ لائف ان اینشینٹ انڈیا (*Corporate Life in Ancient India*) میں لکھا ہے کہ وہ ادارے جن کو ہم مغربی ترقی کے طور پر دیکھنے کے عادی ہیں، وہ بھی ہندوستان میں بہت پہلے پروان چڑھ چکے تھے۔

9. ہندوستانیوں پر اپنی بالادستی کا جواز پیش کرنے کے لیے، نوآبادیاتی مورخین نے اکثر اس بات پر زور دیا کہ ہندوستانیوں کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی اتحاد صرف نوآبادیاتی حکومت سے ہی ممکن ہے۔ قوم پرست مورخین نے اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ ثقافتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی اتحاد اور ہندوستانی قومیت کا احساس موریہ دور سے ہی غالب تھا۔ان کے خیال میں چندر گپت موریہ، اشوکا، چندر گپت وکرمدتیہ اور اکبر عظیم تھے کیونکہ انہوں نے عظیم سلطنتیں بنائیں۔ قوم پرست مورخین نے اس بات پر زور دینے کے لیے 'سنہرا دور' کے تصور کو بھی اجاگر کیا کہ کلاسیکی ہندوستانی ثقافت اور تہذیب نے ایسے سیاسی اور سماجی ادارے پیدا کیے جو اپنے سامراجی حکمرانوں کے مساوی، یا اس سے بھی برتر تھے۔

اس طرح 1930 کی دہائی کے اوائل تک ہندوستانی مورخین اپنی قدیم تاریخی تحریروں کے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اسی دور کے دوران، ہندوستان میں قوم پرست مورخین نے عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کا ایک مختلف بیانیہ تیار کرنا شروع کیا۔انہوں نے ایسا نوآبادیاتی اور تفرقہ انگیز طرزِ عمل کے جواب میں کیا جو رائج تھے۔ قوم پرست مورخین نے عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ لکھنے کا وہی طریقہ اختیار کیا جو قدیم ہندوستانی تاریخ نویسی کے وقت اپنایا گیا تھا۔ان مورخین نے، عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے، عام آبادی اور حکمران طبقے دونوں کے درمیان، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل تعامل کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں مشترکہ ثقافت کی تشکیل پر زور دیا۔ انہوں نے اس نوآبادیاتی دعوے کو مسترد کر دیا کہ مسلمان حکمران، ہندوستان میں آباد ہونے کے بعد بھی، ہمیشہ کے لیے غیر ملکی اور فطری طور پر جابر تھے۔ ہندوستان کے ماضی کی تعریف کرنے اور نوآبادیاتی بدنامی کے خلاف ہندوستانی ثقافت کا دفاع کرنے کے ان کے رجحان کے باوجود، بہت سے قوم پرست مورخین اس بارے میں متجسس تھے کہ کس طرح ایک چھوٹی تجارتی کمپنی، جسے ایک دور دراز ملک کی حمایت حاصل تھی، ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئی، جو ایک وسیع اور تاریخی طور پر امیر ملک تھا۔ انہوں نے ہندوستانی ثقافت، اس کے سماجی

ڈھانچے اور معیشت کا تجزیہ کرنا شروع کیا، جو پہلے خود کفیل سمجھی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے کے اندر ذات پات کے نظام کا مطالعہ ہوا، جس کے نتیجے میں، سماجی تاریخ، بشمول ذات پات کے نظام اور خواتین کی حیثیت کے ساتھ ساتھ معاشی تاریخ کی تحقیق کا آغاز ہوا۔

قوم پرست مورخین نے ماضی میں سخت علمی وظائف کی ایک مضبوط روایت قائم کی۔ اگرچہ انہیں قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں لکھتے وقت محدود ذرائع کی وجہ سے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے اپنے کام میں مکمل تحقیق اور سچائی کو ترجیح دی۔ نتیجتاً، ان کی تحریریں اکثر تجرباتی طور پر درست پائی جاتی تھیں۔ مزید برآں، ان کی پیچیدہ تحقیقی کوششوں کے نتیجے میں نئے ذرائع کی دریافت اور موجودہ ذرائع کی تشریح کے لیے اختراعی طریقہ کار پیدا ہوا۔ انہوں نے تاریخی تحقیق اور تحریر کو عصری دنیا سے متعلقہ بنانے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ تاہم، جب جدید ہندوستانی تاریخ کی تحریر کی بات آتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی قوم پرست مورخین نے ہندوستانی تاریخ کو ہندو، مسلم اور برطانوی ادوار میں تقسیم کرنے کے جیمز مل کے طریقے کی پیروی کی۔ چونکہ اس وقت انگریز حکمران تھے اور تعلیم کو متاثر کرتے تھے، ہندوستانی علماء نے بنیادی طور پر قدیم اور عہد وسطیٰ کے ادوار پر توجہ مرکوز کی، ہندوستانی تاریخ کے جدید دور پر نہیں۔ نتیجے کے طور پر، قومی تحریک کے حوالے سے تاریخ کے بارے میں قوم پرستانہ نقطہ نظر 1947 میں ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ نصابی کتب میں قومی تحریک یا نوآبادیاتی معیشت کی کوئی تاریخ موجود نہیں تھی۔

تاہم، یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی معیشت کے نوآبادیاتی استحصال کو بے نقاب کرنے کی جرات مندانہ کوشش ماہرین تعلیم نے نہیں بلکہ 19ویں صدی کے غیر تعلیمی، قوم پرست ماہرین اقتصادیات جیسے دادا بھائی نوروجی، جسٹس ایم جی۔ راناڈے، جی وی جوشی، آر سی دت، کے ٹی تلنگ، جی کے گوکھلے اور ڈی ای واچا نے دلیری سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح نوآبادیاتی استحصال نے ہندوستان کی معیشت کو متاثر کیا۔ انہوں نے ایک تفصیلی اور سائنسی تجزیہ پیش کیا کہ برطانوی حکمرانی نے ہندوستانی عوام پر کس طرح اثر ڈالا۔ 20ویں صدی کے پہلے نصف میں، تعلیمی ماہرین معاشیات جیسے کے ٹی شاہ، وی سی کالے، سی این وکیل، ڈی آر گاڈگل، گیان چند، وی کے آر وی راؤ، واڈیا اور دیگر ان کے نقش قدم پر چل پڑے اور یہ کام جاری رکھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی تنقیدیں 1947 تک تاریخ کی کتابوں سے بڑی حد تک غائب تھیں۔ بہر حال، اس تنقید نے 1920 کے بعد کی عوامی تحریکوں کے دور میں قومی تحریک کی بنیاد بنائی۔ تلک، گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، سردار پٹیل، سبھاش بوس اور دیگر جیسے قومی لیڈروں نے ہندوستانی معیشت پر اس تنقید کا استعمال کیا۔ تحریک آزادی کے لیے جدید مورخین کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ہندوستان 19ویں صدی سے ایک قوم کے طور پر ترقی کر رہا ہے، جبکہ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ہندوستان قدیم زمانے سے ایک قوم رہا ہے۔

13.4 قوم پرست تاریخ نویسی کی حدود (Limitations of Nationalist Historiography)

قوم پرست تاریخ نویسی کچھ سنگین حدود کا شکار تھی اور ذیل میں ان پر بحث کی گئی ہے۔ قوم پرستی کے جنون میں مبتلا، قوم پرست مورخین نے ہندوستان کے ماضی کے سیاسی، انتظامی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی پہلوؤں کی تعریف کی۔ چونکہ قوم پرست مورخین کی بنیادی فکر

ایک مفصل خاندانی اور سیاسی تاریخوں کی تعمیر کرنا تھی جس کے تحت تمام شعبوں میں خوشحالی کا تصور کیا گیا تھا،اس لیے انھوں نے ان خاندانوں پر توجہ مرکوز کی جنہیں ہندوستان کی تاریخ میں 'سنہرا دور' کے طور پر درجہ بند کیا گیا تھا۔اس مکتب کی زیادہ تر تاریخی تحریریں قدیم دور اور ہندو ثقافت سے وابستہ سیاسی اور خاندانی تاریخوں کی تفصیل ہی تک محدود تھیں۔مزید،انہوں نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک محدود جغرافیائی حدود کے اندر رکھا اور اس کی شان وشہرت بیان کرنے کی کوشش کی اور جنوبی ہندوستانی خاندانوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بنیادی طور پر شمال کے ہند-گنگا کے میدانی علاقوں پر توجہ مرکوز کی جس نے فرقہ پرستی اور بعد میں علاقائیت کو جنم دیا۔

قوم پرست مورخین کو اس دور کے بارے میں لکھتے وقت ایک اور اہم چیلنج کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے پاس محدود ذرائع تھے۔وہ بنیادی طور پر تحریری ریکارڈوں پر انحصار کرتے تھے،حالانکہ Epigraphy اور Numismatics زیادہ اہم ہونے لگے تھے۔آثار قدیمہ (Archaeology) ابھی اچھی طرح سے ترقی یافتہ نہیں تھا اور بشریات اور سماجیات کا استعمال کم سے کم تھا۔مزید برآں، معاشیات کو عام طور پر اکیلے ماہرین اقتصادیات کا ہی ڈومین سمجھا جاتا تھا۔جدید ہندوستانی تاریخ کے بارے میں بات کرتے وقت، قوم پرست مورخین اکثر اس کے آغاز پر توجہ مرکوز نہیں کرتے تھے جو استعمار کی معاشی تنقید سے منسلک تھے۔انہوں نے ہندوستانی معاشرے کے اندرونی تنازعات کو نظرانداز کیا ہے،جو طبقاتی،ذات پات اور صنفی تفریق اور عورتوں اور قبائل کے خلاف جبر اور امتیاز پر مبنی تھے۔

قوم پرست مورخین نے نوآبادیاتی دور میں طبقاتی اور ذات پات کی ناانصافیوں کے خلاف تحریکوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ انہوں نے قومی تحریک کا بھی اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا،اکثر تنقیدی تجزیہ کیے بغیر اس کی تعریف کی۔وہ سماجی اصلاحات، قبائلی اور نچلی ذات کی تحریکوں کو سمجھنے سے محروم رہے۔مجموعی طور پر،انہوں نے نوآبادیاتی ہندوستان میں اقتصادی،سماجی اور ثقافتی تاریخ پر توجہ نہیں دی۔ جب انھوں نے ان موضوعات کو شامل کیا،تو انھیں الگ سمجھا اور انھیں مرکزی بیانیہ میں ضم نہیں کیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی معاشرے کے اندر تنازعات کو نظرانداز کرتے تھے لیکن اس خیال پر یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کی تاریخ باقی دنیا کے مقابلے میں منفرد ہے۔

13.5 فرقہ وارانہ تاریخ نویسی (Communal Historiography)

فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کو تاریخ نویسی کے اس حصے سے تعبیر کیا جاتا ہے،جہاں بیانیہ کے مرکز میں 'مذہب' ہوتا ہے۔اس نقطہ نظر کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مذہبی شناخت کے احساس کو فروغ دینا ہے جبکہ ہندوستان کے تاریخی ماضی کو مسخ کرنا اور خوف کا احساس پیدا کرنا ہے۔اس رجحان نے 1930 کی دہائی میں تاریخ کی نصابی کتابوں اور تدریس کے ذریعے اہمیت حاصل کی، جس سے فرقہ واریت کے فروغ میں مدد ملی۔مہاتما گاندھی کا پختہ یقین تھا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا حصول اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اسکولوں اور کالجوں میں مسخ شدہ تاریخ پڑھائی جائے۔فرقہ وارانہ تاریخ صرف نصابی کتابوں تک محدود نہیں ہے۔اس کی تبلیغ شاعری،ڈرامے،تاریخی ناولوں، اخبارات اور رسائل کے مشہور مضامین،بچوں کے ادب، پمفلٹ اور عوامی تقاریر کے ذریعے بھی کی جاتی ہے۔اس قسم کی فرقہ وارانہ تاریخ بنانے کا ذمہ دار کون ہے؟اس کی ابتداء کو سمجھنے کے لیے ہمیں قدیم اور عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ پر نوآبادیاتی تحریروں کو دیکھنا ہوگا۔

13.6 فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی ابتداء (Genesis of Communal Historiography)

نوآبادیاتی دور کے فرقہ وارانہ مورخین نے اپنی تحریروں کو مکمل طور پر عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی نوآبادیاتی تاریخ نویسی اور برطانوی مورخین اور منتظمین کی طرف سے تصنیف کردہ نصابی کتب پر مبنی بنایا۔ نوآبادیاتی مصنفین نے مندرجہ ذیل کی بنیاد پر ہندوستان میں اپنی حکمرانی کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے، برطانوی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جس پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ اس لیے انھوں نے تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کیا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو علاقے، زبان اور ذات کی بنیاد پر تقسیم کیا۔ تاہم، انھوں نے خاص طور پر مذہبی اختلافات پر زور دیا۔ دوسری بات یہ کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکمرانی کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا کہ ہندوستانیوں پر ہمیشہ غیروں کی حکومت رہی ہے، بشمول مسلمان۔ اس لیے برطانوی راج محض ایک اضافی غیر ملکی راج ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ان کی حکمرانی غیر انسانی، وحشی اور ظالم مسلمانوں جیسے غیر ملکی حملہ آوروں سے مختلف تھی۔ تیسرا، انھوں نے اپنی تحریروں میں بتایا کہ کس طرح ہندو مسلم حکمرانوں کے شکار ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو ہندوؤں کو مسلمانوں کے جبر سے آزاد کرنے والوں کے طور پر دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی برطانوی حکومت میں بہتر زندگی تھی۔ چوتھی بات، برطانوی مورخین نے دعویٰ کیا کہ ہندو اور مسلمان مسلسل لڑتے رہے، یہ مانتے ہوئے کہ وہ صرف اس وقت پرامن طریقے سے رہ سکتے ہیں جب برطانوی حکومت تھی۔ ایچ ایم ایلیٹ کی تحریروں نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ کس طرح جابر مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ہندوؤں کو نقصان اٹھانا پڑا، ان کے مندروں کو تباہ کیا گیا، بتوں کو نقصان پہنچایا گیا اور جبری تبدیلی مذہب کی گئی۔ اس نظریے کے مطابق انگریزوں کو محافظ کے طور پر دیکھا جاتا تھا جو مقامی لوگوں کے ساتھ مسلمان حکمرانوں سے زیادہ منصفانہ سلوک کرتے تھے۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایم اے جناح اور وی ڈی ساورکر وہ پہلے شخص نہیں تھے جنھوں نے دو قومی نظریہ پیش کیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی تقسیم ہوئی۔ ان سے پہلے بھی، برطانوی مصنفین نے اس نظریے کی تشہیر و تبلیغ کی تھی کہ ہندوستانی قوم بنیادی طور پر ایک ہندو قوم ہے اور ترک، افغان اور مغل حکمران اور ان کی حکمرانی 'غیر ملکی' ہے۔ لہٰذا یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ تاریخ کی فرقہ وارانہ تشریح یقیناً 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی برطانوی پالیسی کا حصہ تھی۔ فرقہ وارانہ تقسیم پر مبنی اس قسم کی تاریخ لکھنے کے لیے، برطانوی مصنفین اور بعد میں ہندوستانیوں نے عہد وسطیٰ کی تاریخ کی تعمیر نو کے لیے اپنے بڑے ماخذ کے طور پر عہد وسطیٰ کی تاریخ پر انحصار کیا۔ ان ذرائع کی اپنی اپنی حدود ہیں۔ اول، عہد وسطیٰ کے بہت سے مورخین اور مصنفین اکثر بادشاہوں، امرا، راجاؤں اور زمینداروں کے حمایت یافتہ پادری تھے۔ وہ حکمرانوں اور لیڈروں کو 'دیوتاؤں کے منتخب کردہ' کے طور پر بیان کرتے تھے۔ جنگیں، عدالتی سازشیں، روزمرہ کی سیاست اور فتوحات کو مذہبی مقاصد کے تحت پیش کیا کرتے۔ بادشاہوں کی بہادری کو عقیدت کا کام سمجھا جاتا تھا، جس سے وہ روحانی قابلیت حاصل کرتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ نوآبادیاتی اور کچھ جدید ہندوستانی مورخین نے اشوکا، چندر گپتا، سلاطین، مغلوں، مراٹھا سرداروں اور راجپوت راجوں جیسی

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी Estd. 1998 MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

شخصیات کے اعمال کو بھی مذہبی عینک سے دیکھا، جس سے ہندوستانی تاریخ کی فرقہ وارانہ تشریح میں مدد ملی۔

یہ خیالات اس وقت اور واضح ہو جاتے ہیں جب مورخین، ہندو اور مسلم دونوں، محمود غزنی کے حملوں کو مذہبی طور پر کارفرما قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح، وہ اکثر عہد وسطیٰ کے حکمرانوں، جیسے مہارانا پرتاپ اور اکبر یا شیواجی اور اورنگ زیب کے سیاسی تنازعات کو مذہبی لڑائیوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ قدیم اور عہد وسطیٰ کے زمانے کی تاریخی تحریریں بنیادی طور پر حکمران طبقوں کے کارناموں پر مرکوز ہیں، نہ کہ عام معاشرے پر۔ وہ شاذ و نادر ہی ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح مختلف مذاہب کے لوگ پرامن طور پر ایک ساتھ رہتے تھے۔ نتیجتاً، ہندو اور مسلم فرقہ پرست دونوں ہی تاریخ کی اس طرح تشریح کرتے ہیں جو اپنے پیروکاروں میں عدم اعتماد، نفرت، خوف، عدم تحفظ اور تقسیم جیسے منفی جذبات کو ابھارتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ، اگر فرقہ وارانہ تاریخ نے فرقہ واریت کو جنم دیا اور اس کی تشہیر کی تو اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ سیاست نے فرقہ وارانہ تاریخ نویسی میں مدد کی اور اس کی تشہیر کی حوصلہ افزائی کی۔

13.7 ہندوستانی تاریخ کی فرقہ پرست تشریحات
(Communalist Interpretations of Indian History)

آیئے ہم مندرجہ ذیل حصے میں ہندوستانی تاریخ کی فرقہ پرست تشریحات کی کچھ بنیادی خصوصیات پر بات کرتے ہیں۔

13.7.1 ہندوؤں اور مسلمانوں کو مخالف برادریوں کے طور پر تقسیم کرنا
(Dividing Hindus and Muslims as Hostile Communities)

فرقہ وارانہ پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے والے مورخین نے ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ کو ہندو و مسلم تنازعات کی مسلسل داستان کے طور پر دیکھا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دائمی دشمنوں کے طور پر دکھایا، جو تلخی، بداعتمادی اور دشمنی کی وجہ سے متضاد دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ کس طرح ان دونوں برادریوں کی ثقافتیں الگ الگ ہیں، جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے خصوصی اور باہمی طور پر مخالف ثقافتی اور سیاسی گروہوں کی تشکیل ہوئی۔ اس نقطہ نظر کو فرقہ پرست سیاسی رہنماؤں کے ذریعے تقویت ملی۔ مثال کے طور پر، مارچ 1940 میں، مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران، ایم اے جناح نے کہا، "گزشتہ 1200 سالوں میں، ہندوستان اتحاد حاصل کرنے میں ناکام رہا اور یہ ہمیشہ ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم رہا یہ بات اشتیاق احمد قریشی نے 1950 کی دہائی میں لکھتے ہوئے مزید کہی تھی کہ "پوری تاریخ میں، برصغیر کے مسلمانوں نے مقامی آبادی کے ساتھ الحاق نہ کرنے کا عزم کیا اور اپنی الگ شناخت کو فعال طور پر محفوظ رکھا۔"

دوسری طرف، ہندو فرقہ پرست عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کی حکمرانی کو غیر ملکی سمجھتے تھے کیونکہ وہ اسلام پر عمل کرتے تھے، جو ہندوستان کی سرحدوں سے باہر پیدا ہونے والا مذہب تھا۔ وہ مسلمانوں کو باہر کے لوگوں کے طور پر دیکھتے تھے جو ہندوستانی معاشرے میں ضم

نہیں ہوئے تھے، انہیں ان کے مذہب کی وجہ سے مستقل غیر ملکی سمجھتے تھے۔ ایم ایس گولوالکر، *We or, Our Nationhood Defined* کے مصنف اکثر مسلمانوں کو غیر ملکی کہتے ہیں اور انکا خیال تھا کہ مسلمان جو ہندوستان کو سرائے ہی سمجھتے ہیں، گھر نہیں۔ در حقیقت دوسری جانب، مسلم فرقہ پرستوں نے بھی کچھ اختلافات کے ساتھ اسی طرح کا نظریہ ہی اپنایا تھا۔ ان کے لیے 'غیر ملکی' کی اصطلاح مسلمانوں کی ہندوؤں سے مکمل علیحدگی پر زور دیتی ہے۔

13.7.2 تاریخی دشمنی (Historical Antagonism)

'تاریخی دشمنی' کے نام سے مشہور ایک تصور نے ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کو یہ یقین دلایا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ مسلمان فرقہ پرست 'دو قومی نظریہ' پر یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے، اس لیے انہوں نے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا، جو آزادی کے بعد پاکستان بن گئی۔ دوسری طرف ہندو فرقہ پرستوں نے 1937 کے بعد ایک ہندو ریاست کے قیام کی دلیل دی جس میں مسلمان ایک ماتحت مقام پر رہیں گے، یہ خیال کیا گیا۔

13.7.3 عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کو حکمران اور ہندوؤں کو رعایا کے طور پر دیکھنا

(Seeing Muslims as the Rulers, and Hindus as the Ruled in Medieval India)

فرقہ وارانہ نظریے کا ایک بنیادی حصہ یہ عقیدہ تھا کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کو حکمران گروہ کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جب کہ ہندوؤں کو رعایا کی آبادی سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو، ان کی سماجی یا معاشی حیثیت سے قطع نظر، حکمرانوں کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ دوسری طرف، تمام ہندو، بشمول بادشاہ، سردار، امرا، جاگیر دار اور اعلیٰ عہدے داروں کو رعایا طبقے کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس خیال کو ایم اے جناح کے 1941 میں لاہور کے طلباء سے خطاب میں تقویت ملی جب انہوں نے کہا کہ "ہمارا مطالبہ ہندوؤں سے نہیں ہے کیونکہ ہندوؤں نے کبھی بھی پورے ہندوستان پر حکومت نہیں کی، مسلمانوں نے ہی ہندوستان پر قبضہ کیا اور 700 سال حکومت کی۔ یہ انگریز ہی تھے جنہوں نے ہندوستان کو مسلمانوں سے چھین لیا۔" ہندو فرقہ پرستوں نے بھی آسانی سے اس خیال کو قبول کر لیا کہ ہندو 'مسلم حکمرانی' کے تحت 'غلام' تھے۔ مثال کے طور پر، 1937 میں، وی ڈی ساورکر نے مسلم لیڈروں کی حکمرانی کو 'ہندو قوم کے لیے حقیقی موت کا وارنٹ' قرار دیا۔

13.7.4 ہندوستانی تاریخ کا سنہرا اور تاریکی دور

(The 'Golden' and the 'Dark' Ages of Indian History)

ماضی میں فرقہ پرست اعلیٰ طبقے کی پیروی کرنے والے مذاہب کی بنیاد پر ثقافتوں کی درجہ بندی کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندو مت اور اسلام بنیادی طور پر اتنے مختلف ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی مشترکہ ثقافتی بنیاد یا باہمی تعامل نہیں ہو سکتا۔ ہندو فرقہ پرستوں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی معاشرے کو ہندو مت اور ہندوؤں کے خلاف دشمنی کے طور پر دیکھا اور انہوں نے "مسلم ظلم" کو حکمرانوں یا حکمران

طبقوں کے کردار سے نہیں بلکہ خود اسلامی مذہب کے بنیادی اصولوں سے منسوب کیا۔ ہندو مہاسبھا کے رہنما اندرا پرکاش نے اپنی 1942 کی کتاب *Where We Differ* میں اس خیال کی وضاحت کی۔ اس نے دلیل دی کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کو نقصان پہنچانے کی ترغیب دیتا ہے اور اسلامی عقائد کے مطابق، کسی کافر یا دوسرے عقیدے سے تعلق رکھنے والے کو قتل کرنے سے ان کی برادری میں قاتل کا درجہ بلند ہو جاتا ہے اور ان کی جنت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

اس کے برعکس مسلم فرقہ پرستوں کا نقطہ نظر مختلف تھا۔ انہوں نے عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں اور لیڈروں کی حمایت کی۔ ان کے نزدیک اورنگ زیب ایک قابل احترام شہنشاہ تھے اور ہندوستان میں دارالاسلام کے قیام کے لیے ان کی تعریف کی جاتی تھی، جب کہ اکبر کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا کہ وہ اسلام کو کمزور کرتے ہیں۔ مسلمان فرقہ پرستوں نے ہندوستان میں 'اسلامی تباہی' کے نظریے کو بھی مسترد کر دیا، یہ دلیل دیتے ہوئے کہ اسلام نے ہندو معاشرے کے مقابلے میں 'مساوات پر مبنی' معاشرے کو فروغ دیا ہے، جسے وہ توہم پرستی، ذات پات، اچھوت اور عدم مساوات سے دوچار سمجھتے تھے۔

دوسری طرف، ہندو فرقہ پرستوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی معاشرہ اور ثقافت نے زمانہ قدیم میں عظمت حاصل کی، لیکن عہد وسطیٰ کے دوران ان میں کمی واقع ہوئی جس کی وجہ وہ 'مسلمانوں کی مداخلت اور تسلط' کے طور پر دیکھتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی ثقافت کو ہندومت، سنسکرت اور قدیم برہمنی روایات سے جوڑا۔ وہ گپتا دور کو ہندوستان کا سنہرا دور سمجھتے تھے۔ ان مورخین نے ہندوستان کی سماجی، ثقافتی اور معاشی پسماندگی کو 'مسلم حکمرانی' اور عہد وسطیٰ کے دور میں اسلام کے اثر و رسوخ کو مورد الزام ٹھہرایا، جس کی وجہ سے وہ اس دور کو تاریکی دور قرار دیتے ہیں۔ مسلمان فرقہ پرستوں کا اپنا سنہرا دور بھی تھا، جسے انہوں نے 'اسلام کے سنہرے دور' اور مغربی ایشیائی عہد وسطیٰ کی عرب اور ترکی شخصیات کے بہادرانہ کارناموں سے جوڑا۔ انہوں نے اپنی 'ہندیت' کے بجائے اپنی 'مسلمانیت' پر زور دیا۔ دریں اثنا، ہندو فرقہ پرستوں نے مسلمانوں کو ان کے زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا، جب کہ مسلمان فرقہ پرستوں نے برطانوی راج کو مسلم کمیونٹی کے مجموعی زوال کا سبب قرار دیا۔

13.8 قوم پرست بمقابلہ فرقہ وارانہ تاریخ نویسی (Nationalist Vs. Communal Historiography)

فرقہ وارانہ تاریخ نویسی، قوم پرست تاریخ نویسی سے متعلق ہونے کے باوجود، اس سے اختلافات رکھتی ہے۔ یہ اختلافات ذیل میں بیان کیے گئے ہیں۔ قوم پرست مورخین اپنے دور میں محتاط رہے کہ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، تانتیا ٹوپے اور جھانسی کی رانی جیسے ہیروز کی حد سے زیادہ تعریف نہ کریں جنہوں نے برطانوی حکومت کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے یہ کام برطانوی حکام کو پریشان کرنے سے بچنے کے لیے کیا۔ دوسری طرف، فرقہ پرستوں نے ان افراد کی تعریف کی جنہوں نے 'غیر ملکی'، خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ قوم پرست مورخین نے نوآبادیاتی دور میں قومی خود اعتمادی کو فروغ دینے کے لیے قدیم ہندوستانی تاریخ اور معاشرے کو مثبت انداز میں پیش کیا۔ دوسری طرف ہندو فرقہ پرستوں نے قدیم دور کو عہد وسطیٰ کے 'مسلم دور' کے ساتھ موازنہ کرنے کے لیے مثالی بنایا، جس کا مقصد 'مسلم دور' کو بطور زوال اجاگر کرنا اور مسلم مخالف جذبات کو بھڑکانا تھا۔ قوم پرست مورخ، جیسے کے پی۔ جیاسوال، پی این بنرجی، بی کے سرکار، یو این

گھوسل، ڈی آر بھنڈار کر اور آر سی مجمدار نے قدیم ہندوستانی سماج کے جمہوری، آئینی، غیر مطلق العنان، جمہوریہ، غیر مذہبی اور سیکولر پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ان مورخین کے لیے، قدیم ہندوستان کی تعریف سامراج کے خلاف جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کام کرتی تھی۔ دوسری طرف، فرقہ پرستوں نے قدیم ہندوستانی ماضی کو فرقہ وارانہ جذبات کو فروغ دینے اور مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا۔ وہ جاری قومی تحریک اور اس کے لامذہبیت کے عزم پر تنقید کرتے تھے۔

ماضی میں، ہندو فرقہ پرستوں نے قومی تحریک پر تنقید کی اور اسے 'مسلم نواز' کہا، جب کہ مسلم فرقہ پرستوں نے اس پر 'مسلم مخالف' ہونے یا کم از کم کانگریس کے ذریعے ہندوؤں کے کنٹرول اور غلبہ کا الزام لگایا۔ قوم پرست مورخین نے قوم پرستی کو بنیادی طور پر معاشی اور سیاسی لحاظ سے دیکھا، جب کہ فرقہ پرستوں نے ثقافتی قوم پرستی پر توجہ مرکوز کی جس کی جڑیں ہندو یا مسلم ثقافتوں میں ہیں۔ نتیجتاً، انہوں نے جدید قوم پرستی کی وجہ بنکم چندر، سوامی دیانند، یا سید احمد خان جیسی شخصیات سے منسوب کی، بجائے اس کے کہ دادابھائی نوروجی، جسٹس ایم جی راناڈے، سریندر ناتھ بنرجی اور دیگر۔

13.9 فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی تنقید (Critique of Communal Historiography)

معروضی طور پر، جب ہم فرقہ وارانہ تقسیم پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ اس کے نقطہ نظر کو تنگ کر دیتی ہے۔ جدید دور میں تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع ہو چکا ہے جس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کو شامل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، آیئے معاشی تاریخ پر غور کریں۔ یہ طبقاتی مفادات، یکجہتی، دشمنی اور مذہبی حدود سے ماورا جدوجہد کا جائزہ لیتا ہے۔ ایک ہندو کسان ایک ہندو زمیندار یا ساہوکار کے مقابلے میں ایک مسلمان کسان کے ساتھ زیادہ مشترک تھا۔ اسی طرح آگرہ میں ایک مسلمان بُنکر نے ایک مسلمان رئیس یا بادشاہ کے مقابلے میں ہندو بنکر کے ساتھ زیادہ مماثلت پائی۔ دوسرے لفظوں میں، معاشی مطالعہ معاشرے کی ان لوگوں کے درمیان تقسیم پر مبنی ہیں جنہوں نے معاشی فاضل پیدا کیا اور ان لوگوں کے درمیان جنہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہ مذہب نہیں ہے جو اہم ہے، بلکہ طبقاتی استحصال ہے۔

جب ہم سماجی اور معاشی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ تمام مسلمان اقتدار پر قابض نہیں تھے اور تمام ہندو محکوم نہیں تھے۔ مسلمان عام لوگ اکثر اپنے ہندو ہم منصبوں کی طرح غریب اور مظلوم تھے۔ دونوں گروہوں کے ساتھ عام طور پر حکمرانوں، رئیسوں، رہنماؤں اور جاگیرداروں سمیت، ان کی مذہبی وابستگی سے قطع نظر ان لوگوں کی طرف سے حقارت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ مزید برآں، سماجی تاریخ پر گہری نظر ڈالنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تقسیم کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم تھی، جب کہ مسلمانوں میں، اسی طرح کی تقسیم شریف مسلمانوں کے درمیان موجود تھی، جو خود کو برتر سمجھتے تھے اور اجلاف، جنہیں نچلے طبقے کے مسلمانوں کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ تاریخی انتظامیہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغلوں اور مرہٹوں اور دیگر کے انتظامی ڈھانچے میں تسلسل اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ قدیم اور عہد وسطیٰ کی ریاستوں میں ایک خصوصی ہندو یا مسلم کردار کے تصور کو چیلنج کرتا ہے۔ سماجی اور ثقافتی تاریخ قدیم اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ثقافتی تعاون، انضمام اور مخلوط ثقافت کی ترقی کو فروغ دینے والی قوتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ مزید برآں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ،

عہد وسطیٰ اور جدید دور دونوں میں، ایک اعلیٰ طبقے کے مسلمان نے نچلے طبقے کے مسلمان کے مقابلے میں ایک اعلیٰ طبقے کے ہندو کے ساتھ ثقافتی مماثلتیں زیادہ پائی ہیں۔ اسی طرح ایک پنجابی ہندو کی ایک پنجابی مسلمان کے ساتھ بنگالی ہندو کی نسبت زیادہ ثقافتی مشترکات تھیں۔

سیاسی تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا بھر کی سیاست کی طرح ہندوستانی ریاستی سیاست بھی بنیادی طور پر مذہب کے بجائے معاشی اور سیاسی مفادات سے متاثر تھی۔ اسی طرح، جب ہم جدید سیاسی تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں کی سماجی حمایت کی بنیاد یکساں تھی اور ان کا سامراج نواز سیاسی موقف مشترکہ تھا۔ آخر میں، فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی یہ تنقید اس بات کو تسلیم کرنے کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے کہ معاشی اور سیاسی عوامل اکثر مذہبی عوامل کی بجائے سیاسی اور سماجی حرکیات کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے پیچیدہ تاریخی اور سیاسی منظر نامے پر زیادہ جامع نقطہ نظر کی وکالت کرتا ہے، مذہبی تقسیم سے بالاتر ہونے اور مشترکہ مفادات اور سیاسی نقطہ نظر کو تسلیم کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیتا ہے۔

13.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی سے گزرنے کے بعد، آپ نے خاص طور پر ہندوستانی تاریخ لکھنے اور مطالعہ کرنے کے لیے قوم پرست اور فرقہ پرستانہ نقطہ نظر کے درمیان فرق کرنا سیکھ لیا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہیں کہ قوم پرست تاریخ نویسی نے ہندوستانیوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرنے اور انہیں نوآبادیاتی ثقافتی حملے کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لیے ہندوستان کے ماضی کو اجاگر کیا۔ دوسری طرف، فرقہ پرستوں نے ہندوستان کی متنوع، ہم آہنگ تہذیب کے بارے میں اپنے غیر سائنسی، تنگ نظری کے ذریعے تقسیم کو فروغ دیا۔ اپنے یہ بھی جانا کہ کیسے، فرقہ وارانہ تحریریں معاشرے میں تفرقہ انگیز رجحانات کو جنم دیتی ہیں اور معاشرے کے اتحاد اور ہم آہنگی اور سب سے اہم قومی یکجہتی کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔

13.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

نیشنلسٹ تاریخ نویسی : نیشنلسٹ ہسٹوریوگرافی، قوم پرستی پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ہندوستان کی تاریخ کا محاسبہ کرنے کا ایک نقطہ نظر، جو نوآبادیاتی اور سامراجی تاریخی تناظر کے جواب کے طور پر ابھرا۔ اس نے ہندوستان کی قومی شناخت کی تصدیق کرنے اور نوآبادیاتی دور میں اس کے لوگوں کی خوداعتمادی کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

فرقہ وارانہ تاریخ نویسی : فرقہ وارانہ تاریخ نویسی، ہندوستانی تاریخ کا ایک متعصبانہ نقطہ نظر جو، مختلف عقائد کے لوگوں کے درمیان مشترکہ پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے مذہبی اختلافات پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اسے تاریخ نویسی کی ایک مشکل شکل سمجھا جاتا ہے، جو ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

13.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. یہ سوال کس نے اٹھایا کہ 'ہم اپنی تاریخ کب لکھیں گے؟'
2. ہندو پولیٹی کس نے لکھی؟
3. قدیم ہندوستان میں کارپوریٹ لائف کا مصنف کون ہے؟
4. کس نے دعویٰ کیا کہ مسلمان ہندوستان کو ایک سرائے جیسا سلوک کرتے ہیں نہ کہ گھر کی طرح؟
5. یہ بیان کس نے دیا کہ 'یہ انگریزوں نے ہی ہندوستان کو مسلمانوں سے چھین لیا'؟
6. کس نے 'مسلم حکمرانی' کو 'ہندو قوم کے لیے موت کی تصدیق' قرار دیا؟
7. *Where We Differ* کتاب کا مصنف کون ہے؟
8. کس نے کہا کہ 'ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک اس کے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کے انتہائی مسخ شدہ نسخے پڑھائے جاتے رہے'؟
9. کسی دو قوم پرست مورخ کے نام بتائیں؟
10. کسی دو فرقہ پرست مورخ کے نام بتائیں؟

13.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ان عوامل کی وضاحت کریں جو قوم پرست تاریخ نویسی کے ظہور کا باعث بنے۔
2. فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کے خطرات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. ہندوستان کی قبل از نوآبادیاتی تاریخ نویسی کے لیے قوم پرستانہ طرز عمل پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. مختلف مذہبی گروہوں سے تعلق رکھنے والے عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کے درمیان سیاسی تنازعات کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

13.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ''ہمارے ملک میں اس وقت تک فرقہ وارانہ ہم آہنگی مستقل طور پر قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ کے انتہائی مسخ شدہ نسخے پڑھائے جا رہے ہوں۔'' بحث کریں۔
2. نوآبادیاتی اور قوم پرست تاریخ نویسی کے درمیان فرق کا تجزیہ کریں۔
3. قوم پرست اور فرقہ پرست تاریخ نویسوں کے درمیان فرق پر بحث کریں۔

13.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Chandra, Bipan, *Communalism in Modern India*, Vikas, New Delhi, 1984.
2. Chandra, Bipan, *essays on Contemporary India*, Har-Anand Publications, New Delhi, 1993.
3. Gottlob, Michael, *History and Politics in Post-colonial India*, Oxford University Press, New Delhi, 2011.
4. Lal, Vinay, *The History of History*: *Politics and Scholarship in Modern India*, Oxford University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 2003).
5. Puniyani, Ram, *Communal Politics*: *Facts Versus Myths*, Sage, New Delhi, 2003.
6. Sharma, R.S., *India's Ancient Past*, Oxford University Press, New Delhi, 2018.
7. Thapar, Romila, *The Past and Prejudice*, National Book Trust, India, 1975.

اکائی 14۔مارکسی تاریخ نویسی

(Marxist Historiography)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 کارل مارکس کے ابتدائی حالات زندگی

14.3 کارل مارکس کا فلسفہ تاریخ

14.4 جدید معاشرے پر مارکسزم کے اثرات

14.5 مارکس کا "ایشیائی پیداواری نظام" کا تصور

14.6 ہندوستان میں مارکسی تاریخ نویسی کا ارتقا

14.7 جاگیردارانہ نظام پر بحث

14.8 اکتسابی نتائج

14.9 کلیدی الفاظ

14.10 نمونہ امتحانی سوالات

14.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

20ویں صدی کے اوائل میں تاریخ نویسی کا سب سے بااثر مکتب فکر مارکسی طریق کار تھا۔سیاسی اور انتظامی تاریخ سے توجہ ہٹا کر مارکسی مؤرخین نے معاشی قوتوں (Economic Forces) پر زور دیتے ہوئے سماجی زندگی کے نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔حالانکہ Robert Owens جدید اشتراکیت کی وکالت کرنے والا پہلا شخص تھا، لیکن کچھ سوشلسٹ کارل مارکس کو سائنسی اشتراکیت کا بانی مانتے ہیں۔کارل مارکس کے فلسفہ نے تاریخ کا ایک نیا فہم پیدا کیا،یعنی یہ کہ تاریخ معاشی اور غیر معاشی قوتوں کے درمیان ایک مسلسل تعامل کا نام ہے۔مارکس ہیگل کے فلسفے سے بہت متاثر تھا اور دوسری طرف فریڈرک اینگلز (Friedrich Engles) تھا جس نے مارکس کے نظریے کی تبلیغ میں زندگی بھر اس کا ساتھ دیا۔اس یونٹ میں ہم کارل مارکس کی تاریخ نویسی کی روایت اور خاص طور پر ہندوستانی تاریخ نویسی پر اس کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کارل مارکس کے اشتراکیت کے نظریہ اور اس کے تاریخی فلسفہ کو جان سکیں گے۔
- یہ سمجھ سکیں کہ مارکسزم نے جدید معاشرے کو کس طرح متاثر کیا۔
- ایشیائی پیداواری نظام (Asiatic Mode of Production) کے بارے میں مارکسی افکار سے واقف ہو سکیں۔
- ہندوستانی تاریخ کے حوالے سے ہندوستانی مارکسی مؤرخین کے طریقہ کار کو سمجھ سکیں۔

14.2 کارل مارکس کے ابتدائی حالات زندگی (Karl Marx: Early Life)

مارکسی تاریخ نویسی کو سمجھنے سے پہلے، آیئے مختصراً مارکس کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں۔کارل مارکس ایک عظیم مفکر تھا جو سوشلسٹ فکر کی تاریخ میں بنیادی تبدیلیاں لے کر آیا۔اسی لیے اسے بجا طور پر سائنسی اشتراکیت کا موجد کہا جاتا ہے۔کارل مارکس 5 مئی 1818ء کو جرمنی کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔اس کے خاندان نے بعد میں عیسائی پروٹسٹنٹ مذہب قبول کر لیا۔مارکس نے تاریخ اور فلسفہ کا مطالعہ کیا اور 1841 میں جینا یونیورسٹی (Jena) سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔وہ ہیگل کے کاموں سے بہت متاثر تھا۔ اسے جرمنی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اس نے بطور صحافی مختلف رسالوں کی ادارت کی اور مضامین بھی لکھے۔1848ء میں اسے پرشا (Prussia) میں انقلابی سرگرمیوں کے لیے غداری کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔حالانکہ وہ بے گناہ ثابت ہوا لیکن اسے ملک سے نکال دیا گیا۔1849 سے لے کر اُس کی 1883 کی وفات تک وہ انگلینڈ میں مقیم رہا جہاں وہ غربت سے جوجھتا رہا۔

1848ء میں اس کی ملاقات فریڈرک اینگلز سے ہوئی، جو کپاس کا دھاگا بنانے والے ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔تب سے مارکس اور

اینگلز زندگی بھر دوست رہے۔ مارکس نے اپنی زندگی انتہائی غربت کی حالت میں گذاری اور صرف اپنے دوست فریڈرک اینگلز کی فیاضی کی بدولت فاقہ کشی سے بچ گیا۔ اپنی تمام مشکلات کے باوجود مارکس ایک کثیر التصانیف دانشور تھا۔ 1847 میں مارکس نے *Poverty of Philosophy* نامی کتاب لکھی جس میں مارکس نے اپنا بنیادی تصور یعنی تاریخ کی معاشی توضیح کا فلسفہ پیش کیا۔ 1848 میں مارکس اور اینگلز نے اپنی مشترکہ تصنیف *The Communist Manifesto* شائع کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ "جدید اشتراکیت کا نقطہ آغاز" ہے۔ یہ مشہور کتاب مارکس کے سماجی فلسفے کا نچوڑ ہے۔ 1867ء میں مارکس نے سیاسی معیشت پر اپنی شاہکار کتاب بنام *Das Capital* کی پہلی جلد شائع کی جس میں مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام (Capitalist System) پر تنقید کی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس نظام کے اندر از خود تباہ کن رجحانات (Self-destructive tendencies) موجود ہیں۔ *The Communist Manifesto* اور *Das Capital* میں مارکس کے بیان کردہ سائنسی اشتراکیت کے بنیادی اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو درج ذیل ہیں۔

- تاریخ کی معاشی توضیح (Economic Interpretation of History)
- جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism)
- طبقاتی کشمکش (Class Struggle)
- زائد قدر کا نظریہ (Theory of Surplus Value)
- سوشلسٹ ارتقاء کا نظریہ (Theory of Socialist Evolution)

ان تمام نظریات کا پورے یوروپ کے محنت کش طبقہ (Working Class) پر بڑا اثر تھا۔ مارکسی اشتراکیت نے انقلاب کا نعرہ دیا اور 1848ء میں فرانس، اٹلی، بوہیمیا اور ہنگری میں جو انقلاب برپا ہوئے وہ سب مارکسی سوشلسٹوں سے متاثر تھے۔

14.3 کارل مارکس کا فلسفہ تاریخ (Karl Marx's Philosophy of History)

مارکس کے فلسفہ تاریخ میں ایک وسیع معاشی نظریہ کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تاریخ ان قوانین کے تحت چلتی ہے جنہیں انسانی ذہن جان سکتا ہے یا ان کا تعین کر سکتا ہے۔ اس لیے مارکسزم کا پہلا اصول تعینیت (Determinism) ہے اور اصول تعینیت میں اصل حیثیت ضروریات کی ہے جو ہر چیز کا سبب ہے۔ اسی تصور کی بنیاد پر مارکسزم نے ماضی کے مذہبی اور مابعد الطبیعاتی نظریات کے برعکس سوشلسٹ عقیدہ کو جنم دیا۔ تاریخی ضرورت کو تعینیت کی اصل بنیاد بنا کر، مارکس نے تاریخ کی معاشی توضیح کا اپنا فلسفہ وضع کیا۔ اس حوالے سے کہ "تاریخ بعض قوانین کے تحت چلتی ہے"، کارل مارکس درج ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

- یہ قوانین تاریخی عمل (Historical Process) کا رخ طے کرتے ہیں۔ مارکس نے اس بات پر زور دیا کہ معاشی ترقی سماجی تبدیلی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ سماجی تبدیلی کے لیے پہلے معاشی تبدیلی ضروری ہے۔ مارکس کے مطابق نظریات و

ادارے، قانون وسیاست اور مذہب وفن یہ سب معاشی عوامل سے متاثر ہوتے ہیں۔(یعنی معیشت میں ہونے والی تبدیلی کی وجہ سے ہی سماجی، مذہبی، تہذیب اور تمام سیاسی اور ثقافتی اداروں اور اخلاقی اقداروں میں بھی تبدیلی آتی ہے)۔

- مارکسزم تاریخ میں نظریات (Ideas) کی طاقت اور اثرانگیزی سے انکار نہیں کرتا۔البتہ اس کا ماننا ہے کہ نظریات وتصورات آزاد ایجنٹ نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت صرف درمیانی رابطے کی ہے۔مارکس اس کی وضاحت اس طرح کرتا ہے کہ مذہبی عقیدت یاحب الوطنی یادوسرے تمام جذبات یہ سب خود معاشی حالات کی پیداوار ہیں۔یہاں تک کہ بڑا سے بڑا فلسفی، مفکر یا سائنس داں بھی معاشی اثرات سے بالاتر نہیں ہے۔مارکس کا خیال تھا کہ تاریخ سماجی تنظیم کے پرانے اور نئے اصولوں کے درمیان تصادم کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے۔اس نے ہیگل کے تصور جدلیات (Dialectics) کو اپنے نظریہ کے لیے استعمال کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ترقی وتبدیلی سماجی تنظیم کے پرانے اور نئے اصولوں کے درمیان کشمکش کا نتیجہ ہے۔اگر تاریخی اصلاحات کے ذریعہ کشیدگی اور کشمکش کو قبل از وقت کم کر دیا جائے تو ترقی اور تبدیلی کی رفتار سست پڑ جائے گی۔
- مارکس کا خیال تھا کہ سماجی گروہوں کے درمیان مفادات کا تصادم ہمیشہ رہتا ہے جسے اس نے طبقاتی کشمکش (Class Struggle) کا نام دیا۔وہ طبقاتی کشمکش کو تاریخ کی عظیم حوصلہ افزاء قوت کے طور پر دیکھتا ہے۔تاریخ میں ہمیشہ ایسی کشمکشیں ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً جاگیردار اور بندھوا مزدوروں کے درمیان، سرمایہ دار اور کاروباری انجمنوں (Trade Unions) کے درمیان وغیرہ۔ترقی اور تبدیلی ہمیشہ نئے طبقہ کی،یعنی سرمایہ داروں کی اپنے مزدوروں پر فتح کے نتیجے میں آئے گی۔جدوجہد جاری رہے گی جب تک کہ پرانے نظام کے تمام آثار مٹ نہ جائیں گے۔
- مارکس کہتا ہے کہ مزدوری کی طاقت وہ واحد طاقت ہے جو اپنی قیمت سے زیادہ پیدا کر سکتی ہے،کیوں کہ ایک مزدور ضرورت سے زیادہ گھنٹے کام کرتا ہے۔اس طرح زائد مزدوری (Surplus Labor) سے زائد قدر (Surplus Value) پیدا ہوتی ہے۔
- مارکس کے خیالات فرانسیسی مادیت (French Materialism) اور برطانوی سامراجیت (Imperialism) سے ماخوذ تھے۔مارکسزم صنعتی سرمایہ دارانہ نظام (Industrial Capitalism) کے ساتھ پیدا ہونے والی معاشی اور سماجی مشکلات کا ردعمل تھا۔مارکسزم کو جذبہ انقلاب، پراُمیدی اور سائنسی لگاؤ کے بہترین امتزاج کے طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔اس نے اس وقت کے سماجی اور سیاسی اداروں پر تنقید کی۔مارکسزم کا بھی ایک عقیدہ ہے اور وہ یہ کہ اس کو تکنیکی ترقی پر مکمل یقین ہے جو سماج کو بہتر معیار زندگی حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ماکسزم کا ماننا ہے کہ تاریخ دراصل کائنات اور پیداواری قوتوں پر قابو پانے کے لیے انسان کے ذریعہ کی جانے والی کوششوں کا نام ہے۔تاریخ سماجی نظام اور انسانی رشتوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا نام ہے۔کارل مارکس کے مطابق،تاریخ تبدیلی اور ترقی کا دوسرا نام ہے کیوں کہ پیداوار میں اضافہ کرنے کی انسانی صلاحیت میں مسلسل بڑھوتری ہوتی رہتی ہے۔

مارکس کے بیان کردہ تاریخ کے مادی نظریہ (Materialist Conception of History) میں سب سے زیادہ اہمیت سماج کے معاشی ڈھانچہ کی ہے۔مارکس نے "مادیت" (Materialist) کی اصطلاح مافوق الفطرت، مابعد الطبیعاتی یا قیاس آرائی کے مقابلے میں استعمال کی ہے۔مذہب واخلاق، یہاں تک کہ سیاست اور قانون کے برعکس مارکس نے صرف صنعت و تجارت کو ہی "مادی" سمجھا۔لہٰذا تاریخ کا مادی تصور اپنی اصل میں تاریخی واقعات کا ایک فطری، تجرباتی اور سائنسی بیان ہے جس میں صنعت اور معیشت کو بنیادی عوامل کی حیثیت حاصل ہے۔معاشرے کے کسی بھی پہلو کو سمجھنے کے لیے خواہ وہ مذہبی ہو یا اخلاقی، فنی ہو یا قانونی، سیاسی ہو یا سماجی، سماج کی پیداواری قوت اور معاشی ڈھانچہ کی نوعیت کو جاننا ضروری ہے۔مارکس کی نظر میں تمام اہم سماجی تبدیلیوں کا آغاز پیداواری سرگرمیوں سے اور اس تنظیم سے ہوتا ہے جس میں وہ پیداواری سرگرمیاں انجام پاتی ہیں۔تاریخی مادیت کے نظریہ کا یہ مرکزی عنصر ہے۔تاریخی مادیت دو اہم پیشن گوئیاں کرتی ہے۔

- پہلی یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندرونی تضادات کی وجہ سے ٹوٹ جائے گا۔
- دوسرا یہ کہ مزدوروں کی آمریت (Dictatorship of the Proletariat) کے دور کے بعد کمیونسٹ سماج قائم ہوگا۔

14.4 جدید معاشرے پر مارکسزم کے اثرات (Influence of Marxism on Modern Society)

مارکسی فکر نے جدید معاشرے کو بے حد متاثر کیا۔مارکس نے اپنے زمانے میں سماجی علوم کے اندر تحقیق کا ایک نیا طریقہ، نئے تصورات اور انسانی معاشرے کے عروج وزوال کی توضیح کے لیے متعدد جراءت مندانہ مفروضے وضع کیے۔فن تاریخ نویسی اور علم سیاسیات وسماجیات کے میدان میں پوری 19ویں صدی پر کارل مارکس کا اثر حاوی رہا۔مارکس ایک بصیرت افروز، ایک انقلابی، ایک رومان پسند اور ایک نظریہ ساز تھا جس کی سیاسی فکر اور سائنسی تحقیقات کے درمیان بہت تضاد تھا۔مگر سائنسی طریقہ کار کے حوالے سے مارکس کے دو اہم کارنامے تھے۔ایک یہ نظریہ کہ انسانی سماج ایک مکمل اور مجموعی نظام کی مانند ہے جس میں مختلف سماجی گروہ، ادارے، عقائد ونظریات، سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ان کا مطالعہ ان کے باہمی تعلقات کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہئے، نہ کہ ایک دوسرے سے الگ کرکے، جیسا کہ عام طور پر رائج ہے کہ سیاست، قانون، مذہب اور افکار کی تاریخ الگ الگ لکھی جاتی ہے۔تھیوسی ڈیڈیس (Thucydides) نے یہی بات بہت پہلے ایک الگ ڈھنگ سے کہی تھی، یعنی یہ کہ مختلف تاریخی واقعات آپس میں ایک دوسرے سے مستقل طور پر اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان میں ایک عقلی نظم پایا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ مارکس نے سماج کو فطری طور پر ایک متغیر نظام (Mutable System) کی طرح دیکھا جس میں تبدیلیاں بڑی حد تک اندرونی تضادات وتنازعات سے پیدا ہوتی ہیں۔اور پھر ان تبدیلیوں سے عام کلیے اور اصول بنائے جاسکتے ہیں جن کی مدد سے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے اسباب ونتائج کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔مختصراً مارکس وہ واحد شخص ہے جس نے ارسطو سے لیکر آج

تک سماجی علم کی پوری وراثت کو بڑی باریک بینی سے ایک لڑی میں پرونے کا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا۔

20ویں صدی میں مارکسزم سب سے زیادہ بااثر سیاسی اور معاشی قوت بن گیا۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں مارکس کے شاگرد تھے۔ روس میں ایک خدا کی طرح اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ برطانیہ میں لیبر پارٹی نے ریاستی اشتراکیت کی وکالت کی تھی۔ جرمنی میں Socialist Democratic Party، فرانس میں United Socialist Party، اور امریکہ میں Socialist Party، یہ سبھی پارٹیاں ریاستی اشتراکیت کی علم بردار تھیں۔

14.5 مارکس کے 'ایشیائی پیداواری نظام' کا تصور

(Marx's Concept of the 'Asiatic Mode of Production')

ایشیائی تہذیب و سماج کے حوالے سے کارل مارکس کے خیالات ایک ایسی سیاسی فکر سے متاثر ہیں جو ارسطو سے لیکر Charles Montesquieu (1689–1755) اور Hegel (1770–1831) تک یوروپ میں چھائے ہوئے تھی۔ ان مفکرین نے ایشیائی براعظم کو اس طرح پیش کیا کہ گویا سیاسی استبداد اور سماجی و اقتصادی جمود اس کا خاصہ ہو۔ اپنی کتاب *Poverty of Philosophy* میں مارکس نے پہلی بار ہندوستان کے بارے میں بات کی۔ وہ ہندوستان کو ایک ایسے معاشرے کے طور پر بیان کرتا ہے جہاں گاؤں پر مبنی پیداواری نظام اور مشترکہ زمینی جائیداد ساتھ ساتھ موجود تھے۔ 1850 کے بعد مارکس نے ایشیا کے بارے میں ایک منظم نظریہ وضع کیا۔ اس نے اس علاقہ کے لیے ایک مخصوص پیداواری نظام کا تصور پیش کیا۔ اس نے نیویارک کے روزنامہ اخبار *Daily Tribune* کے لیے متعدد مضامین لکھے جس میں اس نے ہندوستان پر تفصیل سے اپنی بات کہی۔ ایک نظریہ کے طور پر "ایشیائی پیداواری نظام" کا ذکر سب سے پہلے مارکس کی تصنیف "Grundrisse" (1857–1858) کے ایک باب بعنوان "Pre-Capitalist Economic Formation" میں ہوا تھا۔ مارکس سماجی ترقی کے مراحل کا ایک نظریہ پیش کرتا ہے جس میں سب سے پہلا دور "ابتدائی کیمونزم" کا دور ہے جس کے بعد دو اور مراحل آتے ہیں یعنی غلامی اور جاگیر دارانہ دور: یہ دونوں مراحل سرمایہ دارانہ دور کے پہلے کے سماج سے تعلق رکھتے ہیں جہاں مزدور پیداوار کے ذرائع (Means of Production) سے الگ نہیں ہوتے۔ یہی نظریہ مارکس کے "ایشیائی پیداواری نظام" کی بنیاد بنا۔

مارکس کے ایشیائی پیداواری نظام کے نظریہ میں یہ باتیں بھی شامل تھیں کہ ایشیا میں نجی ملکیت نہیں تھی، گاؤں خود مختار تھے اور ایک آمرانہ مرکزی ریاست قائم تھی جو خاص طور سے آبپاشی کی ذمہ دار تھی۔ عوامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ریاست اکثر جبر اور مسلح افواج کی مدد سے کسانوں کے ذریعہ اگائی گئی پیداوار میں سے زائد حصہ ٹیکس کی شکل میں وصول کر لیتی تھی۔ ایک بار جب زائد پیداوار وصول کر لی جاتی، پھر گاؤں کو اپنے Self-Sustaining معاشی نظام کے ساتھ نسبتاً خود مختار چھوڑ دیا جاتا تھا۔

20ویں صدی کے دوران مارکسی فکراورعلوم سماجیات میں "ایشیائی پیداواری نظام"کا تصور بحث و تکرار کا موضوع بناہوا تھا کہ "پیداواری نظام" (Mode of Production) کا نظریہ غیر مغربی معاشرے پر کس طرح لاگو کیا جائے۔مارکسی مفکرین نے ایشیائی پیداواری نظام پر اس لیے بھی توجہ دلائی کیوں کہ وہ نوآبادیاتی اور سامراجی تسلط کے شکار معاشرے میں مختلف انقلابی حکمت عملی کی وکالت کررہے تھے۔انھوں نے ایشیائی پیداواری نظام کے تصور کو ایشیا کے پچھڑے پن کا استعارہ سمجھا(یعنی ایشیائی پیداواری نظام اور ایشیا کی پسماندگی میں لازم وملزوم کا رشتہ ہے)جبکہ نوآبادیاتی اقتدار کو تبدیلی اور جدیدیت کو محرک بتایا۔

14.6 ہندوستان میں مارکسی تاریخ نویسی کا ارتقا

(Development of Marxist Historiography in India)

ہندوستان کی آزادی کے بعد مارکسی تاریخ نویسی کی شکل میں ایک نئے رجحان کو فروغ ملا جو دراصل تاریخ لکھنے کے سامراجی، استشراقی اور قومیت پسند طریقہ کار کے متبادل کے طور پر سامنے آیا۔مارکسی مورخین نے جو سوشلسٹ فکر اور تاریخ کی مادی تشریح کے تصور سے متاثر تھے، واقعات پر مبنی سیاسی تاریخ سے اپنی توجہ ہٹاکر سماجی اور معاشی ڈھانچے کو سمجھنے پر زیادہ زور دیا، خاص طور سے سماجی درجہ بندی اور زرعی تعلقات پر۔انھوں نے اس جھوٹ کو بے نقاب کردیا کہ ہندوستانی ریاست اور سماج "غیر متغیر" تھے(یعنی ہندوستانی سماج میں ماضی سے آج تک کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے)۔جیساکہ مارکس کے "ایشیائی پیداواری نظام" (Asiatic Mode of Production) کے تصور میں بیان کیا گیا تھا۔تاہم اس ماڈل یعنی(AMP)کی تنقید مارکسی تجزیاتی اصولوں کو مسترد کرنے کا باعث نہیں بنی۔البتہ یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ کیا دوسرے پیداواری نظام جیسے کہ غلامانہ نظام پیداوار (Slave Mode of Production) یا جاگیردارانہ نظام پیداوار (Feudal Mode of Production) کا اطلاق ہندوستانی تناظر میں کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔اس سے ریاست کی نوعیت، مختلف عہد میں بدلتی ہوئی معیشت اور مذاہب اور سماجی گروہوں کے درمیان روابط کے حوالے سے کئی نئے زاویے سامنے آئے۔

ہندوستانی تاریخ میں ہونے والی تبدیلیوں کا مارکسی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے کا نیا رجحان دامودر دھرمانند کوسامبی (D.D. Kosambi) نے شروع کیا اور بعد میں دوسرے ممتاز دانشوران نے ان کی پیروی کی جن میں R.S. Sharma, B.N.S. Yadava, Romila Thapar اور D.N. Jha وغیرہ شامل ہیں۔انھوں نے ابتدائی عیسوی صدیوں میں رونما ہونے والی معاشی تبدیلیوں پر زور دیا۔ان کے مطابق معاشی تبدیلیوں نے سیاسی اقتدار میں غیر مرکزیت اور انتشار پیدا کرکے مرکزی بیوروکریسی کی مضبوط عمارت کو کھوکھلا کردیا تھا۔مارکسی تاریخ نویسی نے غیر اشرافیہ گروہوں کی تاریخ پر روشنی ڈالنے میں بھی اہم کردار ادا کیا، جو صدیوں سے محکومی اور پسماندگی جھیل رہے تھے۔اسی طرح انھوں نے ہندوستانی تاریخ کی ادوار میں تقسیم کے حوالے سے روایتی تاریخ نویسی کے ذریعہ بنائی گئی زمانی ترتیب (Periodisation) کو بھی مسترد کردیا اور اس کی جگہ سماجی ومعاشی تبدیلیوں کو زمانی تقسیم کے لیے ایک معیار کے طور پر قبول کرنا شروع کردیا۔

D.D. اپنی اہم کتاب An Introduction to the Study of Indian History میں Kosambi نے حکمراں خاندان کی سیاسی تاریخ سے ہٹ کر ہندوستانی تاریخ کو معاشی اور سماجی نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ کوسامبی نے تاریخ کی تعریف یوں کی ہے "تاریخ نام ہے پیداواری وسائل اور پیداواری تعلقات میں ہونے والی مسلسل تبدیلی و ترقی کو بالترتیب بیان کرنا"۔ ان کے مطابق "ماقبل خواندگی عہد" کی تاریخ کو بھی تاریخ کے دائرے میں لانے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ تاریخ کو طبقات کے درمیان تصادم کے تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ وہ تاریخ کے تئیں اپنے نقطہ نظر کو "جدلیاتی مادیت" (Dialectical Materialism) کا نام دیتے ہیں جسے اس کے بانی یعنی کارل مارکس کی نسبت سے مارکسزم بھی کہا جاتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ "مارکس کی بات ماننے کا مطلب یہ بلکل نہیں کہ اس کے تمام نتائج پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا جائے" اس کے برعکس انہوں نے مارکسزم کو ایک ایسا طریقہ کار سمجھا جس کا استعمال ہندوستانی سماج اور تاریخ کے مطالعہ کے لیے مفید طور پر کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی ابتدائی تاریخ کے لیے قابل اعتماد تاریخی معلومات کی عدم موجودگی میں، کوسامبی نے ہندوستانی معاشرے کا مطالعہ کرتے وقت ایک بین موضوعی (Inter-disciplinary) نقطہ نظر کے ساتھ تقابلی طریقہ کار اختیار کیا۔ یہ خیالات ان کی بعض دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں جیسے کہ *Exasperating Essays*, Myth *and Reality: Studies in the Formation of Indian Culture* (1962), *Exercises in the Dialectical Methods* (1957) اور *The Culture and Civilization of Ancient India in Historical Outline* (1965)۔

ان کی کتاب *Myth and Reality* کے مضامین میں اور زیادہ نیا پن ہے۔ انہوں نے فکری اور ثقافتی مظاہر کو اس وقت کے سماجی اور معاشی حالات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق بھگوت گیتا کی تعلیمات کو صرف اس جاگیردارانہ سماج کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے جس میں اس کا وجود ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھگوت گیتا حکمراں طبقہ کے نظریے کی تبلیغ کرتی ہے، جس میں "ذاتی وفاداری پر زور دیا گیا ہے جو سپاہی کو سردار سے، کسان کو مالک زمین سے اور جاگیردار کو بادشاہ سے جوڑتی ہے"۔ اسی طرح، کوسامبی کی نظر میں، بھکتی تحریک نے پروردگار کے لیے وفاداری کا جذبہ پیدا کیا جو دنیوی مفہوم میں حکمرانوں کی وفاداری اور عقیدت کے مترادف ہے۔ افسانوی داستانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد D.D. Kosambi نے دعویٰ کیا کہ یہ افسانوی داستانیں معاشرے کی مادرسری (Matriarchy) سے پدرسری (Patriarchy) کی طرف منتقلی کی عکاسی کرتی ہیں۔ اگرچہ کوسامبی نے ایشیائی پیداواری نظام اور غلامانہ پیداواری نظام کے مارکسی تصورات کو قدیم ہندوستانی معاشرے کے فہم کے لیے نامناسب قرار دیا، انہوں نے ہندوستانی تناظر میں جاگیردارانہ نظام (Feudalism) کے تصور کو قبول کیا۔ انہوں نے کہا کہ ابتدائی ہندوستانی معاشرہ ایک قبائلی نظام تھا۔ قبیلے چھوٹے اور مقامی ہوتے تھے۔ اہل قبیلہ کے لیے اس کا سماج اس کے قبیلے سے شروع اور اسی پر ختم ہوتا تھا۔ لہٰذا قبیلے سے ذات پات کے نظام تک کا سفر دراصل ہل پر مبنی زراعت کی ترقی کے ساتھ شروع ہوا، جس کی وجہ سے پیداوار کے نظام میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔ اس نے قبائلی خاندانوں کو جڑ سے ہلا دیا اور ایک نئی قسم کی سماجی تنظیم کے طور پر ذات پات کو جنم دیا۔

14.7 جاگیردارانہ نظام پر بحث (The Feudalism Debate)

D.D. Kosambi نے ہندوستانی تناظر میں جاگیردارانہ پیداواری نظام یعنی *Feudalism* کے اطلاق کا ایک باقاعدہ تجزیہ پیش کیا۔انہوں نے مارکسی ماڈل میں ترمیم کرتے ہوئے ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کی دو قسمیں تجویز کیں۔

- Feudalism from Above
- Feudalism from Below

"Feudalism from Above" کا مطلب ہے ایک ایسا تصور یا ایک ایسی ریاست جس میں ایک طاقتور راجا اپنے ماتحتوں سے خراج وصول کرے اور اس کے عوض ان ماتحت حکمرانوں کو اپنے علاقے میں اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرنے کا اختیار مل جائے جب تک کہ وہ راجا کو خراج/ٹیکس ادا کرتے رہیں۔

"Feudalism from Below" اس سے آگے کا مرحلہ ہے۔یعنی ایک ایسی ریاست جہاں ریاست اور کسانوں کے درمیان زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جس نے گاؤں کی مقامی آبادی پر طاقت کے بل پر اپنا دبدبہ قائم کر لیا۔چونکہ زمینداروں کا یہ طبقہ راجا کی ملازمت میں تھا،اس لیے ریاست کے ساتھ براہ راست تعلق کا دعویٰ کرتا تھا، جس میں کسی دوسرے طبقہ کی مداخلت نہیں تھی۔ اس طرح کوسامبی کا ماننا تھا کہ یوروپی جاگیردارانہ نظام کی اہم خصوصیات جیسے Manorial System، جاگیردار کی زمین پر کھیتی کرنا اور بندھوا مزدوری وغیرہ ہندوستان میں نہیں پائی جاتی تھیں اور یہ چیز ہندوستانی جاگیردارانہ نظام کو یوروپی ماڈل سے الگ کرتی ہے۔

کوسامبی کی تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے R.S. Sharma نے ابتدائی تاریخی دور میں رونما ہونے والی اہم معاشی تبدیلیوں کی روشنی میں جاگیردارانہ نظام کے ارتقاء کو سمجھانے کی کوشش کی۔اپنی کتاب *Indian Feudalism* (1965) اور متعدد دوسری کتابوں میں انہوں نے جاگیردارانہ نظام کے آغاز کے لیے بیرونی عوامل کو ذمہ دار ٹھہرایا، جیسے بین علاقائی اور بین الاقوامی تجارت اور کاروبار میں گراوٹ، سکوں کی کمی اور اس کے نتیجہ میں شہری مراکز کا زوال۔ان عوامل کی وجہ سے اس عہد کے حکمرانوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ زائد پیداوار اور ٹیکس وصولی کے لیے ایک نیا طریقہ کار وضع کیا جائے۔ R.S. Sharma کے مطابق یہی وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے شروع میں برہمن اور مذہبی اداروں کو اور بعد میں سرکاری افسروں کو بڑی بڑی زمینیں عطیہ کے دور پر دینے کا رواج شروع ہوا۔اس عمل کو شرما نے جاگیردارانہ نظام کے آغاز کا پیش خیمہ بتایا ہے، کیوں کہ اس سے سیاسی اقتدار مختلف ٹکڑوں میں بٹ گیا۔شرما کے مطابق ہندوستانی جاگیرداری کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ کسان پوری طرح ان بچولیوں پر منحصر ہوتے گئے جنہیں ریاست سے زمینیں ملی تھیں، جن پر انہیں قانونی حقوق بھی حاصل تھے۔ان حالات نے کسانوں کی نقل و حرکت مکانی کو محدود کر دیا اور انہیں تیزی سے بندھوا مزدوری کے جال میں جکڑ لیا۔جاگیردارانہ دور کا زوال ہندوستان میں بھی ویسے ہی ہوا جیسے مغربی یوروپ میں،یعنی دور دراز کی تجارت کا دوبارہ شروع ہونا،شہروں کا عروج،کسانوں کا شہروں کی طرف بھاگنا اور پیسوں پر مبنی معیشت کی ترقی (Monetary Economy)۔ ان سب

تبدیلیوں کو ہندوستان میں جاگیرداری کے زوال کا بنیادی عمل مانا گیا۔اس نظریہ کے مطابق ہندوستان میں جاگیردارانہ دور چوتھی صدی عیسویں میں شروع ہوا اور بارھویں صدی میں ختم ہوا۔

"ہندوستانی جاگیرداری" کے تصور کو مارکسی اور غیر مارکسی دونوں طرح کے مؤرخین نے تنقید کا نشانہ بنایا۔اقتدار کی غیر مرکزیت، وسائل کے استعمال، غلامی اور مذہب جیسے موضوعات پر بحث ومباحثے شروع ہوگئے۔حالانکہ جاگیردارانہ پیداواری نظام کا مارکسی تصور قبول کرلیا گیا جس میں معیشت کی بنیاد زمینی عطیات پر تھی جو جاگیرداروں کے قبضہ میں تھیں، لیکن پھر بھی تنقید کرنے والے مؤرخین کا خیال تھا کہ ہندوستان میں غلامی سے بندھوا مزدوری کی طرف منتقلی اس طرح نہیں ہوئی جیسے یوروپ میں ہوئی تھی۔ Harbans Mukhia جیسے مشہور مؤرخین کا استدلال ہے کہ جاگیردارانہ نظام ایک یوروپی ماڈل ہے اور ابتدائی عہد وسطیٰ ہند میں ہوئے تجارت اور شہروں کے زوال اور زمینی عطیات کو دلیل بنا کر ہندوستان میں اس نظام کے وجود کو ممکن نہیں بنایا جاسکتا۔ان کا دعویٰ ہے کہ بھلے ہی اس دور میں کسانوں کا استحصال بڑھ گیا ہو، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ "کسان کے پیداواری عمل پر کوئی خارجی کنٹرول تھا"ہربنس مکھیا کا خیال ہے کہ "ہندوستان میں بندھوا مزدوری حکمراں طبقے کی سیاسی اور انتظامی طاقت کا مظہر ہے،نہ کہ پیداواری عمل کا حصہ "۔انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "بنیادی طور پر آزاد کسانوں پر مبنی زراعت، جو مابعد موریہ دور سے بدستور فروغ پارہی تھی، عہد قدیم اور عہد وسطی ہند کی زرعی معیشت کی نمایاں خصوصیت تھی"۔ایسے میں ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام پیداوار کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مکھیا کے استدلال پر مارکسی اور غیر مارکسی دانشوران نے تنقید کی۔ R.S. Sharma نے جواب میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "How Feudal was Indian Feudalism?" (1985)۔یہ مانتے ہوئے کہ جاگیردارانہ نظام کوئی آفاقی نظام نہیں تھا، شرما کا خیال ہے کہ یہی بات (یعنی نظام کا آفاقی ہونا) تمام ماقبل سرمایہ دارانہ تشکیلات کے لیے نہیں کہی جاسکتی۔چنانچہ قبائلی دور، پتھر کا دور، دھات کا دور اور غذا پیدا کرنے والی معیشت یہ سب آفاقی رجحانات ہیں اور یہ چند ایسے قوانین کی نشاندہی کرتے ہیں جو تبدیلی کے عمل اور پیٹرن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس لیے R.S. Sharma کا ماننا ہے کہ ہندوستان میں جاگیرداری تھی،البتہ اس کی نوعیت بہت مختلف تھی۔مزید برآں، مکھیا کے استدلال کے برعکس،ان کا دعویٰ ہے کہ ملک کے کئی حصوں میں بندھوا مزدوری (Serfdom) بھی رائج تھی۔مختلف شواہد کی بنیاد پر، شرما یہ ثابت کرتے ہیں کہ ابتدائی عہد وسطیٰ ہند میں جاگیردارانہ نظام رائج تھا،یعنی ایک ایسا نظام جس میں زمینداروں اور مجبور کسانوں کے دو طبقے تھے جو بنیادی طور پر ایک زرعی معیشت میں رہتے تھے جس میں تجارت اور شہروں کا زوال ہوچکا تھا اور سکوں کے چلن میں زبردست کمی آچکی تھی۔

ہندوستان کے مارکسی مؤرخین نے بھی "ریاستوں کی تشکیل" اور خاندانی نظام سے ریاستی نظام میں منتقلی جیسے موضوعات پر بعض نئی تحقیقات پیش کیں۔ریاست کی تشکیل (Formation of State) کے تصور پر غور کرتے ہوئے مارکسی مؤرخین نے ان پہلوؤں کو بھی دھیان میں رکھا کہ آبپاشی، مزدوری، وسائل اور ٹیکنالوجی پر کس کا کنٹرول تھا۔ ابتدائی عہد وسطیٰ ہند میں ریاستی نظام (State

(System) کے ظہور کو مارکسی دانشوران نے زمینی عطیہ پر مبنی معیشت کے ظہور کے حوالے سے سمجھا ہے، جسے بنیادی طور پر جاگیر دارانہ نظام کہا گیا ہے۔سیاسی طور پر جاگیردارانہ نظام کو سیاسی انتشار اور غیر مرکزیت پذیری (Fragmentation and Decentralisation) کے ایک مسلسل عمل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے جس کا اصل سبب یہ تھا کہ چھوٹی اور بڑی زمینیں افسروں اور ماتحتوں کو دی گئیں جنھوں نے ان زمینوں پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیا اور بالآخر خود مختار بن گئے جو "سامنت" کہلائے۔

کئی مؤرخین نے مارکسی طریقہ کار کا استعمال کرتے ہوئے ہندوستان کے عہد قدیم کا مطالعہ کیا ہے۔چنانچہ ان دانشوروں نے جاگیر دارانہ نظام کے فروغ میں شامل مختلف عوامل پر بحث کرتے ہوئے مرکزی ریاستی ڈھانچہ کے بکھرنے پر زور دیا جو نئے حکمراں اشرافیہ (Ruling Elites) کے ظہور کا باعث بنا۔اس کے علاوہ زمینی عطیہ پر مبنی معیشت پر دھیان دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے نئے حکمراں اشرافیہ کے طبقہ/ذات پات میں آئی تبدیلیوں کی بھی نشاندہی کی۔ہندوستانی مارکسی مؤرخین نے ملک کے مختلف حصوں میں جاگیردارانہ نظام کے فروغ کے علاقائی تغیرات کو بھی تسلیم کیا۔اس طرح ہمارے درمیان Kambhampati Satyanarayanaاور R.N. Nandi, Kesavan Veluthat, M.G.S. Narayanan, کی تحقیقات ہیں جنہوں نے جنوبی ہندوستان کے مختلف خطوں میں جاگیر داری کے فروغ کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس طرح مارکسی مؤرخین نے ہندوستانی تاریخ نویسی میں بہت زیادہ تعاون کیا ہے۔ہندوستانی تاریخ کے تمام شعبوں میں مارکسی مؤرخین نے نمایاں خدمات انجام دیں ہیں۔کئی شعبوں میں ان کی تحقیقات نے تاریخ نویسی کا رخ بدل دیا۔البتہ یہ ذہن میں رہے کہ وہ ایک متحدہ جماعت کی طرح نہیں ہیں کیوں کہ ان کے درمیان نظریات میں وسیع اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن ان کے درمیان چند ایسے مشترکہ عناصر ضرور ہیں جو انہیں مارکسی بناتے ہیں۔مارکسی مؤرخین کا سب سے اہم کارنامہ سیاسی خاندانوں کی تاریخ کی جگہ عوام کی تاریخ پر توجہ دینا تھا۔انہوں نے سیاسی تاریخ کے مقابلہ میں معیشت اور سماج کے مطالعہ کو ترجیح دی۔جاگیرداری اور سرمایہ داری جیسے وسیع سماجی اور معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا اور سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کو انفرادی حکمرانوں کے اقدامات کی روشنی میں نہیں بلکہ معاشی ڈھانچہ اور طبقات کے درمیان کشمکش کے تناظر میں دیکھا۔جہاں تک طریقہ کار کا سوال ہے تو کوسامبی کی تحقیقات نے تاریخ میں ایک بین موضوعی (-inter disciplinary) نقطہ نظر کو متعارف کرایا جس میں ادب، علم آثار قدیمہ، لسانیات، علم بشریات، علم مسکوکات اور علم شماریات شامل تھے۔مزید یہ کہ مارکسی تاریخ نویسی نے تشریح و توضیح (interpretation) کو محض بیان یا تفصیل سے زیادہ اہمیت دی۔

14.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کس طرح مارکسزم نے پوری دنیا میں تاریخ نویسی کے رجحانات کو متاثر کیا ہے۔اب آپ کو واضح ہو گیا کہ کارل مارکس معاشی نقطہ نظر سے تاریخ لکھنے والا پہلا دانشور تھا۔مارکس کا استدلال اس نظریہ پر مبنی ہے کہ تمام سیاسی، سماجی، سائنسی اور ثقافتی تبدیلیاں معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جو سرمایہ دار اور مزدور طبقہ کے درمیان تعلقات کی نوعیت

پر منحصر ہے۔مارکس کاخیال تھا کہ تاریخ میں تبدیلی سماجی تنظیم کے پرانے اور نئے اصولوں کے درمیان تصادم کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ایشیائی معاشرے کو سمجھنے کے لیے مارکس نے "ایشیائی پیداواری نظام" کا نظریہ وضع کیا جس کو بعد میں ایشیاء کے مارکسی مؤرخین نے چیلنج کیا۔ہندوستان میں تاریخ کی مارکسی توضیح نے تاریخ نویسی کے عمل میں اہم تبدیلی پیدا کی۔مارکسی مؤرخین جیسے ڈی ڈی کوسامبی، آر،ایس، شرما اور کئی دوسرے دانشوران نے تاریخ لکھنے کا نیا طریقہ کار فراہم کیا جس میں خاندانی اور سیاسی تاریخ سے احتراز کیا گیا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ حاشیہ پر کھڑے سماجی گروہوں کا بہتر انداز میں مطالعہ شروع ہوا۔ مختصراً اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ مارکسزم کے بنیادی تصورات کو سمجھ گئے ہوں گے۔آپ کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوا ہو گا کہ کس طرح مارکسزم نے بہت سے ممالک کے لوگوں کو متاثر کیا اور انقلابات کے ذریعہ سماجی اور معاشی تبدیلیاں لانے میں رول ادا کیا۔سب سے اہم بات یہ کہ آپ ہندوستانی مارکسی مؤرخین کی خدمات سے واقف ہوئے جن کے کارنامے تاریخ نویسی کے حوالے سے غیر معمولی ہیں۔

14.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

Marxist Historiography	:	تاریخ نویسی کا وہ طریقہ کار جس میں کارل مارکس کے پیش کردہ تصورات و نظریات کا استعمال کیا جائے۔
Asiatic Mode of Production	:	وہ تصور جس کو کارل مارکس نے ایشیائی ممالک جیسے ہندوستان وغیرہ کے پیداواری نظام اور اس کی تنظیم کے سمجھنے کے لیے وضع کیا۔
Indian Marxist Historians	:	ہندوستانی تاریخ لکھنے والے وہ ہندوستانی مؤرخین جو اپنی تاریخ میں مارکسی تصورات کا استعمال کرتے ہیں،البتہ یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی ہوں۔

14.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. مارکس نے *Poverty of Philosophy* کس سال لکھی؟
2. *The Communist Manifesto* کی اشاعت کب ہوئی؟
3. *Das Capital* کس سال تصنیف کی گئی؟
4. D.D. Kosambi کا پورا نام کیا ہے؟
5. R.S. Sharma کا مکمل نام بتائیے۔
6. *An Introduction to the Study of Indian History* کس نے لکھی؟

7. *Das Capital* کا مصنف کون ہے؟
8. Harbans Mukhia کون ہیں؟
9. *Indian Feudalism* نامی کتاب کا مصنف کون ہے؟
10. کارل مارکس کب اور کہاں پیدا ہوا؟

14.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. "ایشیائی پیداواری نظام" کے تصور پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. "جاگیردارانہ نظام پر بحث" کے موضوع پر ایک مضمون تحریر کریں۔
3. کارل مارکس پر ایک مضمون لکھیے۔
4. فریڈریک اینگلز پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. D.D. Kosambi پر ایک مضمون لکھیے۔

14.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. کارل مارکس کے فلسفہ تاریخ کے اہم پہلوؤں پر بحث کریں۔
2. طبقاتی کشمکش سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ اس بات سے متفق ہیں کہ "تمام تاریخ دراصل طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے"۔ اگر ہاں یا نہیں، تو کیوں؟
3. ہندوستان کے ماضی کی بہتر سمجھ پیدا کرنے میں مارکسی تاریخ نویسی کی کیا خدمات رہی ہیں۔ جائزہ لیں۔

14.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Cole, G.D.H., *Socialist Thought: The Forerunners 1789–1850*, MacMillan, London, 1955.
2. Fedoeyev, P.N. et al, *Karl Marx*: *A Biography*, Progress Publishers, Moscow, 1973, especially chapter 15.
3. Inden, Ronald, 'Orientalist Constructions of India', *Modern Asian Studies*, vol. 20, no. 3, 1986.
4. Kolakowski, Leszek, *Main Currents of Marxism*, Vol. 1., Oxford University Press, 1978.
4. Kosambi, D.D., *An Introduction to the Study of Indian History*, Bombay, 1956.
5. Lavine, T.Z., *From Socrates to Marx: The Philosophic Quest* (Bantam Books, New York/London, 1984, Parts Four and Five).
6. Riazanov, David, *Karl Marx and Friedrich Engels*, Monthly Review Press, New York and London, 1973.
7. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, New Delhi, 1965.

اکائی 15۔ماتحتوں کی تاریخ

(Subaltern History)

اکائی کے اجزا

15.0	تمہید
15.1	مقاصد
15.2	ماتحت مطالعات کا تعارف
15.3	ماتحت مطالعات کی ترقی کے مراحل
15.3.1	ماتحت طبقہ کی اشرافیہ کے خلاف جدوجہد
15.3.2	مابعد نوآبادیاتی نظریات کے اثرات
15.4	ماتحت مطالعات کی دانشورانہ تنقید
15.5	ماتحت مطالعات کی طرف سے ناقدانہ ردعمل
15.6	اکتسابی نتائج
15.7	کلیدی الفاظ
15.8	نمونہ امتحانی سوالات
15.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
15.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
15.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
15.8	تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی تاریخ نویسی کی روایت میں جدید دور میں ایک اہم روایت ماتحت مطالعات (*Subaltern Studies*) کا ظہور ہوا۔ یہ دور جسے بعض مورخین مابعد جدید دور بھی کہتے ہیں، اپنے آپ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اسی دور میں تاریخ نویسی کی سمتوں جیسے جنسی تاریخ (gender history)، خواتین کی تاریخ (women history)، ثقافتی تاریخ (cultural history)، زبانی تاریخ (oral history)، منسلک تاریخ (connected history)، نچلے طبقے کی تاریخ (history from below) اور ماتحتوں کی تاریخ (*subaltern* history) کا ظہور ہوا۔ سبلٹرن تاریخ نویسی کو اس کی انفرادیت اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر عالمی شہرت حاصل ہوئی، ساتھ ہی بعد میں اپنے راستے سے ہٹنے کو لے کر مختلف جہات سے تنقید کا شکار بھی ہونا پڑا۔

ماتحت مطالعات یا سبلٹرن اسٹڈیز کا آغاز اس منصوبے کے بنیادی محرک اور نظریہ ساز رنجیت گہا (Ranajit Guha) کے ذریعہ کیا گیا۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والی کئی جلدوں کو اسی نام سے نوازا گیا۔ انہوں نے ماتحت مطالعات کی پہلی چھ جلدوں کی تدوین (editing) کی۔ اگلی پانچ جلدوں کو اس منصوبے سے وابستہ دیگر دانشوروں نے مدون کیا۔ ابتدا سے ہی، ماتحت مطالعات کے حوالے سے بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ ہندوستانی تاریخنویسی کی تمام روایت اب بھی اشرافیائی تعصب (elitist bias) سے دوچار ہے۔ ماتحت مطالعات سے وابستہ مورخین نے اعلان کیا تھا کہ وہ تاریخ کو عوام کے نقطہ نظر سے لکھ کر تاریخ کو درست سمت میں موڑنے کی کوشش کریں گے۔ اس اکائی میں ہم ماتحت مطالعات سے متعلق مصنفین کے مختلف نظریات پر بحث کریں گے اور اس کے ساتھ ہی مورخین اور ہندوستانی مطالعات کے دیگر دانشوران کی تنقید پر بھی غور کیا جائے گا۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اس اکائی کے بعد آپ ماتحت مطالعات کی ابتدا اور ارتقا سے واقف ہو سکیں گے۔
- ماتحت مطالعات کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- ماتحت مطالعات کے مختلف ترقی کے ادوار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ماتحت مطالعات کی مختلف دانشوروں کے ذریعے تنقید اور اس کے جواب کا جائزہ لے پائیں گے۔

15.2 ماتحت مطالعات کا تعارف (Introduction to *Subaltern Studies*)

ماتحت مطالعات کے علمبرداروں نے اسے ہندوستانی تاریخ نویسی کے میدان میں ایک نئے نظریے کے طور پر پیش کیا۔ اس سے وابستہ کچھ مورخین نے اسے ہندوستانی تاریخ نویسی کی روایت میں ایک نئی شروعات قرار دیا۔ ہندوستانی تاریخ نویسی کی روایت سے غیر مطمئن

کچھ مصنفین نے اجتماعی طور پر کچھ جلدیں شائع کیں۔ حالانکہ ماتحت مطالعات سے اجتماعی یا رسمی طور پر غیر وابستہ ہونے کے باوجود کچھ مورخین اور دیگر سماجی دانشوروں نے بھی اس میں اپنا تعاون کیا۔ ماتحت مطالعات کی کتابوں میں مضامین کی اشاعت کے ساتھ ساتھ، ان مصنفین نے بہت سے دوسرے رسائل میں بھی اپنے مضامین لکھے، کتابوں کی تدوین کی اور کتابچے شائع کیے، جن کو آج ماتحت مطالعات کے موضوعات اور تکنیک سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ رنجیت گہا کے مطابق، حاشیائی دانشوروں کی مدد سے شروع کیے گئے ماتحت مطالعات نے جلد ہی ہندوستان کے اندر اور باہر شہرت حاصل کی اور ماتحت مطالعے کے موضوعات پر مزید تحقیق کا آغاز ہوا۔ شروع میں تین جلدیں شائع کرنے کا منصوبہ تھا، اب اس کے تحت گیارہ جلدیں ایک منصوبے کے طور پر شائع کی گئی ہیں۔ ان جلدوں کے علاوہ، رنجیت گہا نے بین الاقوامی قارئین کے لیے پہلے شائع شدہ جلدوں سے انتخاب پر چھانٹ کر ایک کتاب کی تدوین کی ہے۔ ماتحت مطالعات پر حال ہی میں شائع ہونے والی کچھ جلدوں میں تیسری دنیا کے غیر ہندوستانی ممالک کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

سبلٹرن (Subaltern) اصطلاح کی تاریخ کافی طویل ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے انگلینڈ میں عہد وسطیٰ میں غلاموں اور کسانوں کے لیے استعمال ہوا۔ بعد میں، 1700ء سے اسے فوج میں چھوٹے عہدوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اطالوی مارکسوادی اور کمیونسٹ پارٹی کے نیتا انتونیو گرامسی (Antonio Gramsci, 1937–1891) نے اپنے کاموں میں اسے وسیع معنوں میں استعمال کیا اور اس کے بعد یہ علمی دنیا میں تیزی سے استعمال ہونے لگا۔ گرامسی نے عام طور پر اس اصطلاح کو طبقے (class) کے وسیع تر تناظر میں استعمال کیا۔ اس وقت وہ جیل میں تھے اور انہوں نے یہ لفظ جیل انتظامیہ سے بچنے کے لیے استعمال کیا تھا کیونکہ ان کی تحریر کے ہر لفظ کی چھان بین کی جاتی تھی۔ گرامسی نے یہ لفظ سماج کے ماتحت طبقے کے لیے استعمال کیا۔ ان کے مطابق ماتحت طبقوں کی تاریخ ہمیشہ حکمران گروہ سے جڑی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ تاریخ عموماً ٹکڑوں میں بٹی ہوئی اور جزوی ہوتی ہے۔ اگرچہ رنجیت گہا نے ماتحت مطالعات کے مقدمہ میں اس لفظ کے استعمال کو لے کر گرامسی کا حوالہ نہیں دیا ہے لیکن انہوں نے گرامسی کو تائید کا ذریعہ ضرور سمجھا ہے۔ انہوں نے اس کی تعریف آکسفورڈ ڈکشنری میں دیے گئے مفہوم کے مطابق کی ہے:

> عنوان میں لفظ 'subaltern' کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری (Concise Oxford Dictionary) میں دیے گئے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی 'کمتر درجے کا۔' ان صفحات میں اسے جنوبی ایشیائی معاشرے میں محکومیت کے عمومی وصف کے نام کے طور پر استعمال کیا جائے گا چاہے اس کا اظہار طبقے، ذات، عمر، جنس اور عہدہ کے لحاظ سے یا کسی اور طریقے سے کیا گیا ہو۔

بعد میں، اسی حصے کے ابتدائی مضمون کے آخر میں، وہ دوبارہ اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہیں:

> اس مضمون میں 'عوام' اور 'ماتحت طبقہ' کو ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس زمرے میں شامل سماجی گروہ اور عناصر کل ہندوستانی آبادی اور ان تمام لوگوں کے درمیان آبادیاتی فرق کی نمائندگی کرتے ہیں جنہیں ہم نے 'اشرافیہ' کے طور پر بیان کیا ہے۔

سبلٹرن مورخین نے اس لفظ کو گرامسی سے بالکل مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ماتحت طبقوں کی ماتحتی کو قبول کرتے ہوئے، وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کی تاریخ غالب اور بااقتدار طبقے سے الگ اور خود مختار تھی۔

15.3 ماتحت مطالعات کی ترقی کے مراحل (Stages of Development in *Subaltern Studies*)

ماتحت مطالعات کے پورے دور کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے مرحلے میں درج ذیل کام کیے گئے۔

1. ماتحت طبقوں، یعنی نچلے اور استحصال شدہ طبقات کے لیے فکر و تشویش
2. اشرافیہ یعنی استحصالی طبقے پر تنقید
3. گرامسی کی فکر اور مارکسی سماجی تاریخ کا زیر اثر وسیع مارکسی نظریات کے تحت کام کرنے کی کوشش

دوسرے مرحلے میں مندرجہ بالا سروکار تبدیل ہوئے جو درج ذیل ہیں۔

1. اس مرحلے میں متن کے تجزیہ پر خصوصی زور دیا گیا۔ اب صرف استحصال شدہ لوگوں کی تاریخ کی ہی کھوج بین نہیں کی جاتی رہی، بلکہ اس مرحلے میں اشرافیہ کی گفتگو کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا۔
2. مارکس (Marx) اور گرامسی کو مائیکل فوکو (Michel Foucault)، ایڈورڈ سید (Edward Said) اور دیگر مابعد جدیدیت پسندوں (postmodernists) اور مابعد نوآبادیت پسندوں (post-colonialists) کے حق میں نظر انداز کردیا گیا۔

15.3.1 ماتحت طبقہ کی اشرافیہ کے خلاف جدوجہد (Struggle of the *Subaltern* against the Elite)

ماتحت مطالعات نے ہندوستانی تاریخ کے تناظر میں لکھی گئی تاریخ کو ایک نئی حیثیت عطا کی۔ ابتدائی طور پر اس کی تین جلدیں تیار کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا جسے اس کے بانی رنجیت گہا نے تدوین کرنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال گرامسی کی فکر سے متاثر تھا۔ اس میں خاص طور پر مارکسزم کے معاشی پہلو پر زور دینے والے نظریہ کے ساتھ ساتھ، بورژوا قوم پرست اشرافیائی تشریح اور نوآبادیاتی تجزیہ سے الگ ہٹ کر ایک نئی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستانی تاریخ نویسی کی روایت سے غیر مطمئن مصنفین کے ایک گروپ نے اجتماعی طور پر ان کتابوں کے لیے مضامین لکھے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے مورخین اور ماہرین عمرانیات نے بھی اس میں حصہ لیا جو باقاعدہ طور پر ماتحت مطالعاتی گروہ میں شامل نہیں تھے۔

اگرچہ بنیادی طور پر ماتحت مطالعات کا تعلق ہندوستان سے تھا، لیکن یہ خیال انگلینڈ میں کچھ ہندوستانی مورخین کے ذہن میں داخل ہوا، جن کے رہنما اور محرک رنجیت گہا تھے۔ شروع ہی سے، اس نے ہندوستانی تاریخ لکھنے کی تمام موجودہ روایات کو چھوڑ کر اپنی الگ راہ چنی تھی۔ اس منصوبے کے اعلامیہ میں 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' کی شروعاتی سطر (ابھی تک تمام معاشروں کی تاریخ، طبقاتی جدوجہد کی تاریخ رہی

ہے۔) کی جھلک ملتی ہے۔رنجیت گہانے *Subaltern Studies* کی پہلی جلد میں اعلان کیا کہ 'ہندوستانی قوم پرستی کی تاریخ نویسی طویل مدت سے ،اشرافیت یعنی نوآبادیاتی اشرافیت اور بورژوا قوم پرست اشرافیت سے دوچار رہی ہے۔' یہ کہا گیا کہ دونوں ہی قسم کی تاریخ نویسی، ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے نظریاتی پہلو سے متاثر تھی۔ بہت سے اختلافات کے باوجود دونوں بہت سے معاملات پر ایک ہی طرح سے سوچتے تھے اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ان کی تاریخ میں عوامی سیاست بالکل غائب تھی۔ ماتحت مطالعات کے دانشوروں کی رائے میں تاریخ کو ماتحت طبقے کے نقطہ نظر سے دیکھنے اور لکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ نقطہ نظر اور عوام کی سیاست بہت اہم تھی کیونکہ اس کا اپنا ایک خود مختار دائرہ کار تھا جس کا نہ تو اشرافیائی سیاست سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی اس کا وجود اس پر مبنی تھا۔ عوام کی سیاست بہت سے فیصلہ کن معاملات میں اشرافیہ کی سیاست سے مختلف ہوتی ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ اس کی جڑیں روایتی عوامی تنظیموں جیسے ذات پات، وسیع تر تعلقات، قبائلی بھائی چارہ، علاقائیت وغیرہ میں پیوست ہیں۔ دوم، اشرافیہ کی تحریک پذیری (mobilisation) عمودی نوعیت یعنی اوپر سے نیچے کی طرف جاتی ہے، جب کہ عوام کی تحریک پذیری افقی یعنی ایک طرف سے دوسری طرف ہوتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ جہاں اشرافیہ کی تحریک قانونی دائرے کے اندر محدود اور پرامن رہتی ہے، وہیں نچلے طبقے کی تحریک نسبتاً جارحانہ ہوتی ہے۔ چوتھا، اشرافیائی تحریک پذیری زیادہ محتاط اور زیر اختیار ہوتی ہے جب کہ ماتحت طبقہ اچانک اور بے ساختہ متحرک ہو جاتا ہے۔

Subaltern Studies (ماتحت مطالعات) جلد ہی 'history from below' (نیچے کی طرف سے تاریخ) میں بدل گئی جس میں عوام کی تاریخ (the people's history) کو سرکاری قوم پرستی کے ساتھ خلط ملط کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس طرح، اس نے اپنی طرف ان دانشوروں کی توجہ مبذول کرائی جو مابعد نوآبادیاتی ریاست کے قوم پرستانہ دعووں سے مایوس ہو چکے تھے۔ ابتدائی طور پر گرامسی کے نظریہ سے متاثر ہو کر دبے کچلے طبقات کے ترقی پسند شعور کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسے ہندوستانی تاریخ نویسی کے تین بڑے رجحانات کی مخالفت میں قائم کیا گیا تھا۔

- نوآبادیاتی، جنھوں نے ملک کی جاہل عوام کو علم کی فراہمی کے لیے نوآبادیاتی حکمرانی کو ضروری سمجھا۔
- قوم پرست، جو عوامی تحریکوں کو قومی ریاست کی تعمیر کے عمل کا حصہ سمجھتے تھے۔
- مارکسی، جنھوں نے عوامی جدوجہد کو انقلاب اور اشتراکی ریاست کے قیام کی تاریخ میں ملا دیا۔

اس منصوبے کے کئی مقاصد تھے:

- کانگریسی قوم پرستی کے بورژوا اور اشرافیائی کردار کو ظاہر کرنا جس نے عوامی انتہاپسندی کو روک کر رکھا۔
- ہندوستانی/کانگریسی قوم پرستی کی عظیم داستان میں عوام کی جدوجہد کو شامل کرنے کی بہت سے مورخین کی کوششوں کو چنوتی دینا۔
- ماتحتی کے شعور کی تشکیل نو اور اس کی خود مختاری پر زور دینا

ماتحت طبقے کے ماخذ میں تاریخی شواہد کی کمی کے چلتے یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ماتحت مطالعاتی مورخین نے

اپنے لیے سرکاری ذرائع سے مواد نکالا اور اس کے لیے انہیں *against the grain* (فطری جھکاؤ کے برخلاف) جانا پڑا۔ گرامسی کے خیالات سے تیار شدہ ماحول میں ماتحت مطالعات کا تصور پیدا ہوا۔ ایرک ہابس بام(Eric Hobsbawm)، ریمنڈ ولیمس (Raymond Williams)اور سٹورٹ ہال(Stuart Hall) اپنی تحریروں میں گرامسی کے خیالات کو شامل کر رہے تھے۔ دوسری طرف پیری اینڈرسن(Perry Anderson)اور ٹام نیرن(Tom Nairn) گرامسی پر کسی قدر تنقید کر رہے تھے۔ ماتحتوں کی تاریخ، جارج لیفبرے(Henri Lefebvre)، کرسٹوفر ہل(Christopher Hill)، ای پی تھامسن (E.P. Thompson)، یوجین جینویس(Eugene Genovese) اور دیگر مغربی مارکسی مورخین سے بھی متاثر تھی جنھوں نے نئی سماجی تاریخ لکھی اور عوام کے نقطہ نظر پر غور کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس طرح، ماتحت مطالعات کا مقصد جنوبی ایشیا کے مطالعاتی میدانوں میں ماتحت طبقوں سے متعلق موضوعات پر منظم اور دانشورانہ گفتگو کو آگے بڑھانا تھا اور اس طرح اس مخصوص میدان میں ہو رہی تحقیق اور عالمانہ کام کو اشرافیائی تعصب سے دور رکھنے میں مدد کرنا تھا۔ تیسری جلد کے مقدمے میں کہا لکھتے ہیں کہ سبلٹرن مورخین نے 'تنقید کے لیے مشترکہ علامتوں کا استعمال کیا، جس میں جنوبی ایشیائی مطالعاتی میدان میں پھیلی اشرافیت کی شعوری اور منظم طریقے سے تنقید کی گئی۔' انہوں نے ایک بار پھر اس بات پر زور دیا ہے کہ اشرافیائی ذہنیت کی مخالفت ماتحت مطالعاتی منصوبے کے اتحاد کی بنیاد ہے۔

> ہم درحقیقت تاریخ نویسی اور سماجی علوم میں زیادہ تر مروجہ علمی عمل کے خلاف ہیں کیونکہ وہ ماتحتوں کو اپنی قسمت بنانے والے کے طور پر تسلیم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ تنقید ہمارے منصوبے کا عین مرکز ہے۔ جنوبی ایشیا کے مطالعاتی میدانوں میں اشرافیت کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ اس کی کوئی دوسری شکل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس طرح منفیت ہمارے منصوبے کی بنیاد اور سبب اصلی ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے، 1960 کی دہائی کے آخر اور 1970 کی دہائی کے اوائل میں بین الاقوامی منظر نامہ پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ساتھ ہی تسلیم شدہ اور روایتی نظریات پر سوالیہ نشان کھڑے کیے گئے۔ ان پر روایتی سیاسی جماعتوں نے بائیں بازو سے لے کر دائیں بازو تک نے تنقید کی اور غیر روایتی سیاسی تنظیموں اور سرگرمیوں پر زور دیا گیا۔ کانگریسی قوم پرستی اور ہندوستانی ریاست میں اس کے نفوذ سے مایوس، ماتحت مورخین نے اس تصور کو مسترد کر دیا کہ بڑے پیمانے پر عوام کا متحرک ہونا یا تو اقتصادی حالات کی وجہ سے یا اوپر سے کی کوششوں کے نتیجہ میں ہوتا تھا۔ انہوں نے ایک ایسا عوامی حلقہ تلاش کرنے کا دعویٰ کیا جس کا وجود خود مختار ہو۔ اس کی خود مختاری کی جڑیں استحصال کے حالات میں پوشیدہ ہیں اور اس کی سیاست اشرافیہ مخالف ہے۔ ماتحت مورخین نے قبائل، کسانوں، مزدوروں اور بعض اوقات متوسط طبقوں پر بھی کام کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ علاقے اشرافیائی سیاست سے غیر متاثر تھے اور ان کا ایک آزاد وجود تھا اور ان کی طاقت بے ساختہ تھی۔ اب اس بات کی تردید کی جانے لگی تھی کہ کسی بھی تحریک کے پیچھے کوئی کرشماتی قیادت موجود رہتی ہے۔ اب کسی بھی تحریک یا بغاوت کے تجزیے میں اس قسم کے کرشمے کے تئیں لوگوں کی وضاحت کو اہمیت دی جانے لگی۔

شاہد امین(Shahid Amin) کے ذریعے مہاتما گاندھی کے بارے میں عوامی تاثر کا مطالعہ اس کی واضح مثال ہے۔ اپنے ایک

مضمون ‘Gandhi as Mahatma’ (گاندھی بطور مہاتما) میں، انھوں نے مشرقی اتر پردیش کے ضلع گورکھپور سے شواہد اکٹھے کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ کانگریس لیڈروں کے مہاتما کو دیکھنے کے نظریے اور عوام جس نظر سے مہاتما کو دیکھتی تھی، دونوں میں بہت فرق تھا۔ اگرچیکہ مہاتما کے پیغام پھیلنے کا ذریعہ ’افواہیں‘ تھا، لیکن اس کے پیچھے ایک اچھا آدمی بننے، شراب، جوئے اور تشدد سے پرہیز کرنے، چرخہ کاتنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے جیسا مکمل معاشی اور سیاسی فلسفہ موجود تھا۔ مہاتما کی جادوئی طاقتوں کی کہانیاں عوام میں پھیلی ہوئی تھیں۔ عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ اس طاقت سے وہ اطاعت کرنے والوں کو جزا اور نافرمانی کرنے والوں کو سزا دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف، مہاتما کا نام اور ان کی نام نہاد جادوئی طاقتوں کا استعمال ذات پات کے ڈھانچے کو مضبوط اور مستحکم کرنے، مقروضوں سے قرض ادا کروانے اور گائے کے تحفظ کی تحریک کو تیز کرنے کے لیے بھی کیا گیا۔ مہاتما کے پیغامات افسانوی طور پر عوام میں پھیل گئے۔ 1922 میں چوری چورا کے واقعے کے دوران یہ اپنے عروج پر پہنچ گیا جب پولیس چوکیوں کو جلانے، پولیس اہلکاروں کو قتل کرنے اور بازار لوٹنے کے لیے ان کے نام کا استعمال کیا گیا۔

اس سے پہلے کے مورخین کو اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ انھوں نے نہ صرف عوامی شعور اور نفسیات کو نظر انداز کیا بلکہ باغی اور بغاوت کے بارے میں سرکاری بیان کو اتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ قبول کیا۔ اپنے مضمون ‘The Prose of Counter-Insurgency’ میں رنجیت گہانے ہندوستان کے کسانوں اور قبائل کے موجودہ تاریخ لکھنے والوں پر شدید تنقید کی ہے، جو کسان تحریکوں کو اچانک اور غیر منصوبہ بند قرار دیتے ہیں اور باغیوں کے شعور کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان کی رائے کے مطابق:

> تاریخ نویسی کسان باغی سے ایک تجربہ کار فرد یا کسی طبقے کے رکن کے طور پر معاملہ کر کے مطمئن رہی ہے، لیکن ایک ایسی ہستی کے طور پر نہیں جس کی مرضی اور شعور نے بغاوت کہلانے والے عمل کو تیار کیا۔ حقیقتاً اس کمی کو زیادہ تر حکایات میں استعاروں کے ذریعے رنگ دیا گیا ہے جو کسانوں کی بغاوتوں کو فطری مظاہر سے ہم آہنگ کرتے ہیں جیسے کہ وہ طوفانوں کی طرح ابھرتے ہیں، زلزلوں کی طرح آتے ہیں، جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے ہیں، وبا کی طرح متاثر کرتے ہیں۔

انھوں نے بغاوتوں کے بعد کی فوری سرکاری رپورٹوں سے شروع کرتے ہوئے بائیں بازو کے مورخین کی طرف سے لکھی گئی بغاوتوں کی تاریخوں پر انسداد بغاوت کے متن لکھنے کا الزام عاید کیا ہے جس میں ’باغی کو اس کی تاریخ کا ہیرو ماننے سے انکار کیا گیا ہے۔‘

گیان پانڈے (Gyan Pandey) اپنے مضمون ‘Peasant Revolt and Indian Nationalism, 1919-1922’ میں نے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عدم تعاون تحریک سے پہلے اودھ میں ابھری کسان تحریک اپنے آپ میں خود مختار تھی اور کسان، مقامی اقتدار کی ساخت کے نوآبادیاتی حکمرانی کے ساتھ گٹھ جوڑ کو، شہری قائدین اور یہاں تک کہ کانگریسی رہنماؤں سے بھی زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ جب بھی کانگریس کی تنظیم مضبوط ہوئی، کسانوں کی جارحیت میں کمی واقع ہوئی۔

اسٹیفن ہیننگھم (Stephen Henningham) نے ‘Quit India in Bihar and the Eastern

'United Provinces: The Dual Revolt میں لکھا ہے کہ ماتحت طبقے اور اشرافیہ کے حلقے ایک دوسرے سے واضح اور الگ تھے۔'1942 کی عظیم بغاوت ایک اشرافیائی قوم پرست بغاوت تھی جس کے ساتھ ایک ماتحتوں کی بغاوت بھی شامل تھی۔'ان کے مقاصد اور مطالبات مختلف تھے:

> اشرافیائی قوم پرست تحریک میں شامل افراد نے سرکار کے ذریعے کانگریس پر ظلم وجبر کے خلاف احتجاج کیا اور ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا۔اس کے برعکس، سبالٹرن بغاوت میں شامل لوگوں نے محرومیوں سے نجات کے لیے اور اس پریشان حالی کے خلاف احتجاج کیا جس میں انھوں نے خود کو پایا۔'

اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ انقلاب کے اس دوہرے کردار کی وجہ سے اسے دبایا جا سکا۔ڈیوڈ ہارڈی مین (David Hardiman) نے اپنے کئی مضامین میں ماتحت موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ چاہے وہ جنوبی گجرات کی قبائلی تحریک ہو یا مشرقی گجرات کی بھیل تحریک یا پھر عام نافرمانی تحریک میں زرعی مزدوروں کی انتہا پسندی کا جذبہ ہو، یہ اشرافیہ کے خلاف ماتحت طبقے کی آزادانہ سیاست تھی۔اسی طرح سمت سرکار (Sumit Sarkar) نے اپنے مضمون 'The Conditions and Nature of Subaltern Militancy' میں کہا ہے کہ بنگال میں عدم تعاون کی تحریک کے دوران عوام نے لیڈروں کو نظر انداز کیا۔انہوں نے کہا کہ سبالٹرن کی اصطلاح میں بنیادی طور پر تین سماجی گروہ شامل ہیں:

1. قبائلی اور نچلی ذات کے زرعی مزدور اور بٹائی دار۔
2. زمین والے کسان، عام طور پر بنگال میں درمیانی ذات کے لوگ (جس میں مسلمان شامل تھے)۔
3. باغات، کانوں اور صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور (نیز شہری مزدور)۔

ان گروہوں کے درمیان باہمی تقسیم بڑے پیمانے پر تھی اور اس میں استحصال کرنے والے اور استحصال شدہ دونوں شامل تھے۔ اس کے باوجود اس کا ماننا تھا کہ:

> متعین ماتحت طبقے کے گروہ کا نسبتاً خود مختار سیاسی دائرہ تھا، جس کے خاص اوصاف اور مشترکہ ذہنیت تھی جن کا پتہ لگایا جانا ضروری ہے۔یہ اشرافیائی سیاستدانوں کے دائرہ کار سے بالکل الگ دنیا تھی۔20ویں صدی کے دوران بنگال کے اشرافیائی سیاستداں، اعلیٰ ذات کے تعلیم یافتہ پیشہ ور گروہوں سے آئے تھے جن کا تعلق زمینداری یا بچولیہ کاشتکاری سے تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ الگ الگ جلدوں میں لکھے گئے مختلف مضامین میں اشرافیہ اور ماتحت طبقے کے دائروں کو الگ الگ کرنے اور ماتحت طبقے کے شعور و عمل کو خود مختار سمجھنے کی کوشش کی گئی۔اگرچہ اس مرحلے میں پارتھا چٹرجی (Partha Chatterjee) کی تحریریں مستثنیات کے طور پر نظر آتی ہیں، لیکن عام طور پر اس مرحلہ کی خصوصیت، ماتحت موضوعات اور ماتحت طبقے کے خود مختار شعور پر زور دینا ہے۔

15.3.2 مابعد نوآبادیاتی نظریات کے اثرات (Impact of the Post-Colonial Ideas)

چند سالوں کے بعد ماتحت طبقے کا نقطہ نظر بدلنا شروع ہو گیا۔ اس پر مابعد جدیدیت اور مابعد نوآبادیاتی نظریات کا اثر واضح طور پر نظر آنے لگا۔ اگرچہ گہا، پانڈے، امین، ہارڈی مین، ہینگھم، سرکار اور کچھ دیگر دانشوروں نے عام لوگوں کے نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے پر زور دیا، لیکن نوآبادیاتی اثرات شروع سے ہی پارتھا چٹرجی کی تحریروں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اپنی مشہور کتاب *Nationalist Thought and Colonial World* (1986) میں انہوں نے ایڈورڈ سعید (Edward Said) کی مابعد نوآبادیاتی ساخت کا استعمال کیا ہے، جس کے مطابق نوآبادیاتی اقتدار و علم کی دنیا زبردست اور ناقابل مزاحمت ہے۔ اس قسم کا تجزیہ چٹرجی کے سبلٹرن موضوعات پر ابتدائی مجموعوں میں شامل مضامین میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اپنی بعد کی کتاب *The Nation and Its Fragments* (1995) میں انہوں نے اس تجزیے کو مزید آگے بڑھایا۔ ماتحت طبقے کے بہت سے دوسرے مصنفوں نے بھی آہستہ آہستہ مارکسواد کا دامن چھوڑ دیا۔ اس طرح اس نظریے میں فکری تقسیم جیسی صورتحال پیدا ہو گئی۔ ایک طرف، کچھ ایسے سبلٹرن مورخین تھے جو اب بھی ماتحت مطالعات کے مضامین سے وابستہ تھے، جب کہ زیادہ تر مصنف مابعد نوآبادیاتی انداز میں لکھنے لگے۔ اب واضح طور پر اقتصادی اور سماجی مسائل کے بجائے ثقافتی مسائل خاص طور پر نوآبادیاتی بیانات کے تجزیہ اور تحقیق پر زور دیا جانے لگا۔

ایک تصور کے طور پر *subalternity* (ماتحتیت) کی نئی تعریف کی گئی۔ شروع میں یہ اندرونی اور بیرونی طور پر غالب طبقات کے خلاف اور استحصال شدہ طبقات کی حمایت میں کھڑی نظر آتی ہے۔ بعد میں اسے نوآبادیت، جدیدیت اور روشن خیالی کے تصورات کے خلاف پیش کیا گیا۔ بعد کی جلدوں میں ماتحت طبقوں سے متعلق موضوعات پر تحقیقی مضامین کی تعداد کم ہوئی۔ لہٰذا، جب کہ پہلی چار جلدوں میں کسانوں اور مزدوروں جیسے ماتحت طبقوں پر 20 مضامین تھے، لیکن اس کے بعد کی چھ جلدوں میں ایسے صرف پانچ مضامین ملتے ہیں۔ اب نوآبادیاتی تقریروں کے متنی تجزیے پر زور دیا جانے لگا۔ اس طرح ماتحت طبقے کے موضوعات پر تحقیق کے بجائے بحث و تجزیے کا غلبہ ہونے لگا۔ 'ماتحت' پر زور کم ہوا اور 'گروہ' پر زور دیا جانے لگا۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ اشرافیائی قوم پرستی نے عوام کو مفلوج کر دیا ہے۔ اب قوم پرستی کے پورے منصوبے کو نوآبادیاتی بحث کا ایک ورثہ قرار دیا گیا جس میں تحریک کی مرکزیت اور بعد میں ریاست پر زور دیا گیا۔ سیکولرزم اور عقلیت پسندی پر تنقید کی گئی اور اب 'ٹکڑوں' اور 'واقعات' پر زور دیا جانے لگا۔

ابتدائی منصوبے میں ہوئی ان تبدیلیوں کو جواز دینے اور ان کو آپس میں جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ اسی سبب کی بنا پر *Subaltern Studies* کی جلد دہم کے مدونین، گوتم بھدرا (Gautam Bhadra)، گیان پرکاش (Gyan Prakash) اور سوجی تھارو (Susie Tharu) نے یہ دعویٰ کیا کہ 'سبلٹرنٹی (ماتحتی) کے اثرات سے کچھ نہیں بچ سکا ہے - نہ تو اشرافیہ کا رویہ، نہ ہی سیاست، نہ علمی شعبے، ادبی متون، دستاویزی ماخذ نہ زبان۔' لہٰذا، ماتحت مطالعات کے جائز مضامین کے طور پر تمام اشرافیائی شعبوں کی چھان بین کرنا چاہیے۔

گیان پرکاش نے دلیل دی ہے کہ ہندوستانی ماتحت طبقوں نے اپنے ذاتی دستاویزات اور تفصیلات پیچھے نہیں چھوڑے، اس لیے مغربی طرز کی نقل کرتے ہوئے 'نیچے سے تاریخ' والا نظریہ اپنانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ماتحت مطالعات کے مورخین کو ماتحتی کے تصور کو مختلف انداز میں اپنا کر ایک مختلف تاریخ لکھنے کی کوشش کرنی پڑی۔ ان کے مطابق، ماتحتی کو ایک علمی مباحثے کے اثر کے طور پر دیکھا جانا چاہیے جس کی وجہ سے ماتحتی کے تصور کی نئی تعریف کی جا سکے۔ اسی لیے،

> جنوبی ایشیائی تاریخ کے اس طرح کے دوبارہ جائزہ لینے والی اس علمی بحث کے پہلے حقیقی 'سبالٹرن' وجود میں نہیں آئے تھے اور ان کا کوئی تنقیدی نقطہ نظر تیار نہیں ہوا تھا۔ سبالٹرن کو علمی مباحثے کی بھول بھلیوں میں ڈالنے سے حقیقت اس میں گم ہو کر رہ جائے گی۔ حقیقی 'ماتحت مطالعات' اور 'ماتحتی' علمی بحثوں کی تہوں کے درمیان، اس کی خاموشی اور تاریکی کے درمیان اور اس کے زائد اظہار میں ہی ابھرتی ہے۔

اس طرح سبالٹرن کو کارسازوں کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ وہ اقتدار کے داؤ پیچ سے تخلیق شدہ اور اس کی کارگزاری میں الجھے ہوئے ہیں۔ دیپیش (Dipesh Chakrabarty) ایک قدم آگے بڑھ کر اور نہ صرف ماتحت مطالعات کے لیے بلکہ تیسری دنیا کی تاریخ کے لیے بھی مکمل طور پر ایک الگ شعبے کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔

> جہاں تک تاریخ کی علمی بحث کا تعلق ہے اور جہاں تک تاریخ کو کسی یونیورسٹی کے اندر ایک مضمون کے طور پر پیش کرنے کا تعلق ہے، اس ساری تاریخ کا مرکزی موضوع یورپ ہے اور اس نے ہندوستانی، چینی، کینیائی اور ہر قسم کی تاریخوں کو نظریاتی بنیاد فراہم کی ہے۔ یہ تمام تاریخیں ایک عظیم داستان کی ہی شکلیں ہیں جسے 'یورپ کی تاریخ' کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہندوستانی تاریخ اپنے آپ میں سبلٹرنٹی کی حالت میں ہے۔ اس تاریخ کے نام پر صرف ماتحت طبقے کے حالات ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس طرح ماتحت مطالعات کے دوسرے مرحلے میں نہ صرف ماتحت طبقے کے شعور کی چھان بین پر زور کم ہو گیا بلکہ اس طرح کے تاریخی کاموں پر بھی سوال اٹھائے گئے اور اس میں مغرب کی مابعد جدیدیت والی سوچ کا بہت اثر تھا۔

15.4 ماتحت مطالعات کی دانشورانہ تنقید (Criticism of the *Subaltern Studies*)

ماتحت مطالعات یا سبلٹرن اسٹڈیز کو بڑے پیمانے پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ابتدا سے ہی، اس منصوبے پر کسی بھی مکتب فکر سے تعلق نہ رکھنے والے مورخین کے علاوہ مارکسسٹوں، قوم پرستوں اور کیمبرج مکتب فکر کے مورخین کی طرف سے تنقید کی بوچھار کی گئی۔ علاوہ ازیں اس کے تمام نظریات خواہ وہ خود مختار ماتحت حلقے کی بات ہو یا علمی بحث کے تجزیہ کی، جانچ پڑتال اور تنقید کی زد میں آئے۔ مشہور جریدے سوشل سائنٹسٹ (*Social Scientist*) میں بہت سی تنقیدیں شائع ہوئیں۔ جاوید عالم (Javeed Alam) نے اسی جریدے میں شائع ہونے والی تنقید میں ماتحت مطالعات کے اس دعوے کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ ماتحت طبقہ خود مختار ہوتا ہے۔ عالم کے مطابق، ماتحت طبقے کی سیاست کی خود مختاری، مستقل باغیانہ کارروائی، مزاحمت کی طرف مسلسل رجحان اور کسان عوام کی طرف سے باغیانہ رجحان پر مبنی ہے۔ آیا یہ

خود مختار عمل اپنے نتائج میں مثبت ہے یا منفی، ماتحت مورخین کے لیے یہ زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔

> جارحیت کی تاریخی جہت کی اہمیت ثانوی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں جو چیز اہم ہے وہ اس کی بے ساختگی اور اندرونی طور پر اس کے اندر پیدا ہونے والی توانائی اور رفتار ہے۔ اگر ہم اس طرح کی نظریاتی ساخت میں مضمر منطق کے نتائج کو مزید وسعت دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا رجحان فرقہ وارانہ فسادات کی طرف ہے یا متحدہ جاگیر داری مخالف کارروائی کی طرف جو اس کے ابتدائی محدودات پر غالب آچکا ہے۔

اپنے ایک تجزیاتی مضمون میں، سنگیتا سنگھ (Sangeeta Singh) اور دیگر دانشوروں نے رنجیت گہا پر کسانوں کی بغاوت کی بے ساختگی (spontaneity) کو غلط طریقے سے پیش کرنے پر تنقید کی تھی۔ اس تنقید میں یہ کہا گیا کہ 'گہا نے بے ساختہ پن کو اضطراری عمل (reflexive action) کا مترادف سمجھا۔' چونکہ 'بے ساختگی، روایتی شعور پر مبنی عمل ہوتی ہے،' ان کے مطابق، گہا کا پورا زور 'ایک سیاسی تکنیک کے طور پر بے ساختگی کی بحالی' پر تھا۔ مزید برآں، باغیوں کے شعور میں مذہب کی بالادستی پر زور دیتے ہوئے، گہا نے برطانوی سرکاری موقف کی حمایت کی جس نے بغاوت کے غیر معقولیت پر زور دیتا ہے اور نوآبادیت کو دیہی اور قبائلی سماجی اور معاشی ڈھانچ میں کسی بھی طرح کے خلل ڈالنے والے کردار سے بری قرار دیتا ہے۔

رنجیت داس گپتا (Ranjit Das Gupta) کے مطابق ماتحت مطالعات کے دائرہ کار کی کوئی قطعی تعریف نہیں ہے۔ مزید برآں، سبلٹرن مورخین، 'تصادم اور مزاحمت کے لمحات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور ان کی تحریروں میں ماتحت طبقے کی جانب سے تعاون اور خاموشی کی ذہنیت کو۔۔۔ بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔' اشرافیہ اور ماتحتوں کے درمیان سخت تقسیم میں دیگر درجہ بندیوں کو نظر انداز کرنے پر بھی ان کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ڈیوڈ لڈن (David Ludden) مدونہ جلد *Reading Subaltern Studies: Critical History, Contested Meaning, and the Globalisation of South Asia* کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> یہاں تک کہ ماتحت مطالعات کے مداح قارئین کو بھی دو کمیاں محسوس ہوتی ہیں۔ پہلی اور اہم خامی یہ ہے کہ ماتحتیت کا نیا نظریہ 'اشرافیہ' اور 'سبالٹرن' کے درمیان ایک سخت نظریاتی دیوار کے نیچے سے ابھرا، جو دو منزلہ عمارت میں بالاخانے اور نچلی منزل کو الگ کرنے والی کنکریٹ کے سل سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس سخت دوہرے پن کے نتیجے میں ماتحتیت اس سماجی تاریخوں سے الگ کر دیا جن میں دو یا دو سے زیادہ منزلیں شامل ہوتی ہیں یا جو دو منزلوں کے درمیان ہیں۔ دوسری بات، چونکہ ماتحت سیاست کو نظریاتی طور پر ماتحت طبقے سے تھا، اس لیے یہ پورے سیاسی ڈھانچے کو چنوتی نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے ماتحتیت کو عوامی تحریکوں کی سیاسی تاریخ سے جدا کر دیا اور ماتحت طبقات کو منظم، تغیر پسند سیاست سے الگ کر دیا۔'

روزالین اوہان لن (Rosalind O'Hanlon) نے اپنے مضمون 'Recovering the Subject' میں سبالٹرن

اسٹڈیز(ماتحت مطالعات) کی ابتدائی جلدوں پر جامع تنقید کی ہے۔وہ استدلال کرتی ہے کہ ،تاریخ نویسی کے پچھلے طرزوں کو پیچھے چھوڑنے کے ان کے دعووں کے باوجود، 'شرکا (contributors) کے کام کے ذریعے جس انداز میں ماتحت طبقہ ظاہر ہوتا ہے وہ آزاد خیال انسان دوستی کی کلاسیکی، منفرد، خود مشتمل اور گڑھی ہوئی شکل ہے۔'

ماتحت مورخین، خاص طور پر رنجیت گہا، دیپیش چکرورتی، اسٹیفن ہیننگھم اور سمت سرکار وغیرہ کی تحریروں میں، ماتحت طبقوں کی اجتماعی روایتوں اور ثقافت کو 'لازوال قدامت پن' کے طور پر دیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ان کے مطابق، بنیادی طور پر اس منصوبے کے مرکز میں تعصب اور خود ارادیت کا عنصر موجود ہے۔اس میں تجربے کے ناقابل تغیر، ناقابل تسخیر اور خود مختار ہونے پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔اس کی بنیاد پر ایک مثالی نمونہ گڑھ لیا گیا، خاص طور پر گہا کے نظریے میں، جس میں کسان تحریک کی روایات کو خود مختارانہ طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔انہوں نے ایسا کئی بار کیا اور وہ خالص 'ہیگل کے نظریات' کی طرف بڑھتے ہوئے لگتے ہیں۔

'Rallying around the Subaltern' میں کرسٹوفر بیلی (Christopher Bayly) نے اس منصوبہ کی اصلیت کے دعوے پر سوال اٹھایا ہے۔ان کے مطابق، ماتحت مورخین نے 'نئے شماریاتی مواد اور مقامی دستاویزات کا استعمال نہیں کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ نئی تاریخ لکھنے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ایسا لگتا ہے کہ ان کا تعاون یہ ہے کہ انہوں نے سرکاری دستاویزات کو دوبارہ پڑھا اور اندرونی تنقید کا راستہ ہموار کیا۔' اسی لیے تھوڑا پہلے کے اور ہم عصر عام لوگوں کی تاریخ اور ماتحت مطالعات کے درمیان صرف الفاظ اور دلچسپ محاوروں میں فرق ہے۔ بیلی کے مطابق، سبالٹرن نظریہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اشرافیت کی طرح، وسیع تر تاریخ کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

اس منصوبے سے پہلے وابستہ رہے ایک مورخ سمت سرکار نے بعد میں سبلٹرن تاریخ نویسی کے مابعد نوآبادیت نظام کی طرف بڑھتے قدموں کی تنقید کی۔ اپنے دو مضامین 'The Decline of the Subaltern in Subaltern Studies' اور 'Orientalism Revisited' میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی اس تبدیلی کے پیچھے بہت سی وجوہات ہیں لیکن فکری طور پر یہ 'دونوں ہاتھوں میں لڈو پکڑنے کی کوشش ہے جس میں دوسروں کو لازمیت (essentialism) اور غایات (teleology) اور دوسری کمیوں کو لے کر تنقید کی جاتی ہے جبکہ خود انہیں غلطیوں کو دہراتے ہوئے ایک خاص قسم کے تحفظ کا دعویٰ کیا گیا ہے۔' اس کے علاوہ ہندوستانی تاریخ کو اس طرح کے اقدامات سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔' درحقیقت اصلیت کا ڈھول بہت پیٹا گیا لیکن نوآبادیاتی علمی مباحثے پر تنقید پرانے قوم پرست نقطہ نظر سے بالکل بھی مختلف نہیں تھی۔ بنا کسی خاص مہارت کہ پرانے بیانات کو نئی اصطلاحات میں دہرایا گیا۔' بعد کا ماتحت مطالعاتی منصوبہ 'تیسری دنیا کی قوم پرستی کی ایک قسم کے طور پر ابھرا اور بعد میں 'ٹکڑوں' کی مابعد جدیدیاتی قدر افزائی کی طرف بڑھا۔' درحقیقت، بعد کا ماتحت مطالعات، 'آشیش نندی (Ashish Nandy) کی حمایت یافتہ نوروایتی اور جدیدیت مخالف نظریے کے کافی قریب آ گیا۔' سمت سرکار (Sumit Sarkar) کے مطابق اس سے پہلے بھی اس میں 'سبالٹرن' اور 'خود مختاری' جیسے

عناصر کو شامل کرنے کا ایک بنیاد پرست رجحان تھا اور یہ ایک دقیانوسی معنی اور معیار تک محدود تھے۔' سرکار کا کہنا ہے کہ سبالٹرن مورخین کی لکھی ہوئی تاریخیں مسائل سے بھری پڑی ہیں اور یہ ان کی محدود تجزیاتی ساخت کی وجہ سے ہوا ہے کیونکہ وہ ماتحت سیاق اور ماتحت طبقے کی خود مختاری کے ایک سادہ تصور سے مغربی نو آبادیاتی ثقافتی غلبہ کے اتنے ہی عام کردہ تصور کی طرف بڑھ گئے۔

15.5 ماتحت مطالعات کی طرف سے ناقدانہ رد عمل

(Critical Response from the *Subaltern Studies*)

سبالٹرن (ماتحت) مورخین نے کچھ عرصے بعد ان تنقیدوں کا جواب دیا۔ ان تنقیدوں پر دیپیش چکرورتی کا جواب جلد چہارم میں مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے، اسی جلد کے مقدمے میں، رنجیت گہا نے ناقدین کو منہ توڑ جواب دیتے ہوئے انہیں 'فرسودہ نظریات کے علمبردار' اور 'زنگ آلود پرانے ماہرین تعلیم' قرار دیا جو 'اپنے آزاد خیال اور بائیں بازو کے حلقے کے اندر سرکاری سچائی کے رکھوالے نظر آتے ہیں۔' انہوں نے ان علماء کی تنقید کو سختی سے مسترد کر دیا' جو پکے پکائے خیالات اور تکنیکوں کو اپناتے ہوئے لکیر کے فقیر بنے رہے۔' انہوں نے اسے پاگل پن بھی قرار دیا۔ انہوں نے دہلی کے ایک تنقید نگار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ 'ہر جلد کی اشاعت کے بعد وہ اپنا تجزیہ ہوا میں لہراتے تھے اور دیوانے کی طرح چیختے تھے اور ٹیگور کی کہانی کے پاگل چوکیدار کی مانند، سب جھوٹا ہے، سب جھوٹا ہے! کی رٹ لگاتے تھے۔'

دیپیش چکرورتی (Dipesh Chakrabarty) نے مزید مفصل اور مدلل جواب دیا۔ انہوں نے بعض ناقدین کی نیتوں پر بھی سوال اٹھائے۔ مثال کے طور پر، انہوں نے کہا کے خلاف لگائے گئے 'ہیگل مت' اور 'اثباتیت پسندی' کے دونوں الزامات کو باہم متضاد قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مضمون میں 'آئیڈیلزم'، 'اثباتیت پسندی' وغیرہ کو سادہ، وضاحتی معنوں میں ظاہر نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے ذریعے مذمتی موقف اختیار کیا گیا۔ نو آبادیاتی ضمن کو نظر انداز کرنے کے الزام اور ماتحتوں کی سیاست اور شعور پر بیرونی اثرات کی تردید کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ نام نہاد 'ناکامی' ہماری جان بوجھ کر کی گئی کوشش ہے جس کے تحت ہم ماتحت طبقے شعور کی اندرونی منطق کو معروضی اور مادی حالات کی منطق میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ 'ماتحت مطالعات کے منصوبے کا سب سے اہم مقصد اس شعور کو سمجھنا ہے جس کے تحت ماتحت طبقہ، اشرافیہ سے مکمل آزاد اپنی سیاست کرتا ہے۔'

اس کی وجہ، جیسا کہ سبالٹرن مورخین نے بتایا ہے، یہ ہے کہ 'جب لوگ قوم پرست جدوجہد میں حصہ لیتے تھے، تو ان تحریکوں کے بارے میں ان کا اپنا نقطہ نظر ہوتا تھا اور وہ اس طریقے پر عمل کرتے تھے۔' دیپیش چکرورتی کے علاوہ گیان پرکاش نے بھی اس منصوبہ کے حق میں بہت کچھ کہا ہے۔ وہ 'مابعد بنیاد پرستی' اور 'مابعد استشراقیت' کے ایک حصے کے طور پر اس منصوبے کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماتحت مورخین نے تاریخ نویسی کو اشرافیہ کی تاریخ نویسی کے چنگل سے آزاد کرایا ہے:

> اس منصوبے کی اہمیت، اس تاریخ نویسی میں ہے جو نو آبادیاتی اور قوم پرست اشرافیہ کے چنگل سے آزاد ہے۔ اس منصوبے کا مقصد تاریخ کو نو آبادیاتی اور قوم پرستانہ تسلط سے آزاد کرنا ہے۔ سبالٹرن مورخین نے تاریخ کو ایک نیا رخ دیا جس کے نتیجے میں

تیسری دنیا کی تاریخ نویسی میں با معنی مداخلت کی۔

ایک اور مضمون میں گیان پرکاش نے ماتحت مطالعات کے منصوبہ کی ترقی، تبدیلی اور نئی سمت کی حمایت کی ہے۔ بعد میں، ان تبدیلیوں کی حمایت کرتے ہوئے، انہوں نے لکھا کہ 'ایک موضوع کے طور پر تاریخ کی تنقید اسی کے تحت آگے بڑھی۔' گیان پانڈے نے اپنے مضمون 'In Defense of the Fragment' میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات پر زیادہ تر تحریروں کے خلاف دلیل دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستانی معاشرہ مختلف مذہبی اور نسلی برادریوں میں تقسیم ہے اور اس کے علاوہ قبائلی گروہ ہیں، صنعتی مزدور ہیں اور خواتین کارکن جماعتیں ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب 'اقلیتی' ثقافتوں اور طرز عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ان سے قومی ثقافت کے مرکزی دھارے میں ضم ہونے کی توقع کی جاتی ہے، کیونکہ ریاست اور قوم انیسویں صدی سے انسانی معاشرے کے تنظیمی اصول بن گئے۔ اسی طرح رنجیت گہا نے 'The Small Voice of History' میں، جدید تاریخ نویسی پر انتظامی مرکزیت کا حامی (statist) ہونے کا الزام عائد کیا ہے۔ گہا کا خیال ہے کہ: 'عام طور پر تاریخ کی سمجھ کی رہنمائی، انتظامی مرکزیت کی حمایت کے ذریعے کی جاتی ہے جو اسی مقصد کے لیے ماضی کا جائزہ لیتی ہے۔ یہ ایک روایت ہے جس کا آغاز اطالوی نشاۃ ثانیہ کے دوران پیدا ہونے والی جدید تاریخی فکر کے ابتدائی دور میں ہوا۔'

دیپیش چکرورتی نے اپنے مضمون 'Radical Histories and Question of Enlightenment Rationalism' میں مارکسی تاریخ نویسی پر تنقید کی ہے کہ یہ ایک طرح سے نوآبادیاتی جدیدیت کی ماورا عقلیت پسندی سے متاثر ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ 'مابعد ساختیات (post-structuralist) اور ساختیاتی (deconstructionist) فلسفے نوآبادیاتی جدیدیت کے حالات میں سبالٹرن تاریخوں کے مطالعہ کے لیے موزوں نقطہ نظر تیار کرنے میں کارآمد ہیں۔' حقیقت یہ ہے کہ کئی بار اس بات کی بھی تردید کی جاتی ہے کہ اس منصوبے کی جہت میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ دیپیش چکرورتی کا خیال ہے کہ ابتدا ہی سے ماتحت مطالعات سب سے الگ ہے اور 'اس نے تاریخ نویسی میں کچھ ایسے سوالات اٹھائے ہیں جو برطانوی مارکسی تاریخ نویسی کی روایت سے بالکل مختلف ہیں۔' انہوں نے کہا کہ ماتحت مطالعات کے شروع سے ہی مابعد نوآبادیاتی مقاصد تھے اور یہ نچلے طبقے تاریخ (history from below) کی راہ پر نہیں تھا۔

> اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماتحت مطالعات اور عوام کی تاریخ نویسی جس کا آغاز ہابس بام اور تھامسن نے کیا تھا، کے درمیان تین بنیادی اختلاف ہیں، 1۔ سرمائے کی عالمگیر تاریخ سے اقتدار کی تاریخ کی نسبتاً علاحدگی، 2۔ قومی ساخت پر تنقید، 3۔ اقتدار (power) اور علم (knowledge) کے درمیان رشتے کی کھوج کو نوآبادیاتی تاریخ کے بعد کے فکری مقاصد اور نظریہ کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے۔۔۔ انہیں اختلافات کے درمیان۔۔۔ نوآبادیاتی تاریخوں کے فکری لائحہ عمل کی نظریہ سازی کے ایک نئے طریقے کا آغاز مانا جا سکتا ہے۔

اس طرح ناقدین کو جواب دیتے ہوئے سبالٹرن منصوبہ سے وابستہ دانشوروں نے اپنے نظریات کی تائید کرتے ہوئے، اسے مابعد

مارکسی، مابعد نوآبادیاتی اور مابعد ساختیاتی تاریخ نویسی کا حصہ سمجھا ہے۔

15.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ماتحت مطالعات یا سبالٹرن اسٹڈیز کا آغاز 1980 کی دہائی کے اوائل میں موجودہ تاریخ نویسی پر تنقید کرنے کے لیے ہوا۔ انہوں نے روایتی تاریخ نویسی پر لوگوں کی آواز کو نظر انداز کرنے کا الزام لگایا۔ اس منصوبے سے وابستہ مصنفین نے ہندوستانی تاریخ کی ایک نئی قسم لکھنے کا دعویٰ کیا۔ ابتدائی دور میں دانشوروں اور متعلمین کے جوش و خروش کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح انہوں نے اس دعوے کو پورا کیا۔ جلد ہی اسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔ ابتدائی سالوں میں، رنجیت گہا کی ادارت میں *Subaltern Studies*، (ماتحت مطالعات) کی چھ جلدوں میں ہندوستانی سماج کے استحصال شدہ گروہوں کے شعور اور اعمال کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم، اس میں شائع ہونے والے کچھ مضامین میں ایک اور رجحان نمایاں تھا۔ یہ رجحان مغرب کی مابعد جدیدیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تحریروں سے متاثر نظر آتا ہے۔ بعد کے سالوں میں، یہ رجحان ماتحت مطالعات سے وابستہ دانشوروں پر حاوی ہونے لگا، جس میں ماتحت مطالعات کو ایک نئی سمت دی گئی۔ اس سے ماتحت مطالعات کے مقصد حقیقی اور اس کی اہمیت پر ہی سوال کھڑے ہونے شروع ہو گئے۔ بعض اوقات شکوک و شبہات اس قدر نمایاں ہو گئے کہ اس طرح کی تاریخ لکھنے کی ضرورت پر ہی سوالیہ نشان لگ گیا، جس کا حالانکہ بعد کے سبلٹرن دانشوروں نے جواب دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ بہر کیف سبلٹرن تاریخ نویسی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے باوجود ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔

15.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

اشرافیہ	:	(elite) سماج میں اعلیٰ مقام رکھنے والا یا حکمراں طبقہ
ماتحت	:	(subaltern) عوام یا وہ جو اشرافیہ سے الگ پہچان رکھتے ہیں، دبے کچلے حاشیائی لوگ
کمیونسٹ مینی فیسٹو	:	مارکس اور انیجلز کے ذریعے لکھی گئی کتاب جو کمیونسٹوں کے لیے منشور یا اعلامیہ کا درجہ رکھتی ہے۔
تحریک پذیری	:	(mobilisation) ایک بڑی تعداد کو کسی ایک محاذ پر ایک ساتھ لانا یا ان کا خود ایک جگہ آنا
عمودی	:	عمودی یعنی اوپر سے نیچے کی طرف
آگینسٹ دی گرین	:	(against the grain) فطری جھکاؤ کے برخلاف جانا یا روایتی طریقے کے برعکس کرنا

15.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ماتحت طبقے سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. اشرافیہ سے کیا مراد ہے۔

3. ماتحت مطالعات کا انگریزی متبادل بتائیے۔
4. سبلٹرنٹی کو اردو زبان میں کیا کہتے ہیں؟
5. اگینسٹ دی گرین سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
6. کمیونسٹ مینی فیسٹو کس نے لکھی؟
7. کسی دو سبلٹرن مورخین کے نام بتائیے۔
8. سبلٹرین تاریخ نویسی کے دو ناقدین کا نام بتائیے۔
9. کیا ماتحت طبقے کی تاریخ نویسی اور نیچے سے تاریخ نویسی ایک دوسرے کے مترادف ہیں؟
10. ماتحت مطالعات کی ابتدا میں کتنی جلدیں تھیں؟

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ماتحت مطالعات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
2. ماتحت مطالعات پر مابعد نوآبادیاتی نظریات کے اثرات پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. شاہد امین کے نظریے کی وضاحت کیجیے۔
4. گیان پانڈے کا نظریہ بیان کیجیے۔
5. کرسٹوفر بیلی کی ماتحت مطالعات پر تنقید کا خلاصہ پیش کیجیے۔

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ماتحت مطالعات کی ترقی کے مراحل پر ایک وضاحتی مضمون لکھیے۔
2. ماتحت مطالعات کی دانشورانہ تنقید پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. ماتحت طبقہ کی اشرافیہ کے خلاف جدوجہد پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

15.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Chakrabarty, Dipesh, 'Postcoloniality and the Artifice of History', in Ranajit Guha (ed.), *A Subaltern Studies Reader*, *1986–1995*, OUP, Delhi, 1998.
2. Chaturvedi, Vinayak, (ed.), *Mapping Subaltern Studies and the Postcolonial*, Verso, London and New York, 2000.
3. Cronin, Stephanie, (ed.), *Subalterns and Social Protest*: *History from Below in the Middle East and North Africa*, Routledge, US & Canada, 2008.

4. Lal, Vinay, 'Walking with the Subalterns, Riding with the Academy: The Curious Ascendancy of Indian History', *Studies in History*, 17, 1, 2001.
5. Ludden, David, (ed.), *Reading Subaltern Studies*: *Critical History*, *Contested Meaning, and the Globalisation of South Asia*, Permanent Black, Delhi, 2001.
6. Pandey, Gyanendra. 'The Subaltern as Subaltern Citizen.' *Economic and Political Weekly*, vol. 41, no. 46, 2006, pp. 4735–41.
7. Pandey, Gyanendra, 'In Defense of the Fragment' in Ranajit Guha (ed.), *A Subaltern Studies Reader*, *1986–1995*, OUP, Delhi, 1998.
8. Prakash, Gyan, 'Subaltern Studies as Postcolonial Criticism', *The American Historical Review*, December, 1994 (99, 5).
9. Sarkar, Sumit, 'The Decline of the Subaltern in Subaltern Studies' in his *Writing Social History*, Oxford University Press, Delhi, 1997.
10. *Subaltern Studies*, 12 volumes (1982–2005).

اکائی 16۔مابعد جدیدیت اور ہندوستانی تاریخ نویسی

(Post-Modernism and Indian Historiography)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 جدیدیت کیا ہے؟
16.3 مابعد جدیدیت کیا ہے؟
16.4 نظریہ مابعد جدیدیت کے کچھ اہم مفکرین
16.5 مابعد جدیدیت اور ہندوستانی تاریخی روایت
16.6 تنقید
16.7 اکتسابی نتائج
16.8 کلیدی الفاظ
16.9 نمونہ امتحانی سوالات
16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

مابعد جدیدیت ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی فکری تحریک ہے جسکا ظہور بیسویں صدی کے وسط میں جدیدیت کے اصولوں کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر ہوا۔ یہ فکری تحریک نظریہ جدیدیت سے وابستہ عظیم بیانات اور مطلق سچائی جیسے دعوؤں کو چیلنج کرتی ہے۔ایک مربوط نظریے کے بجائے، مابعد جدیدیت مختلف شعبوں میں مختلف نقطہ نظر بشمول فلسفہ، ادب، آرٹ، فن تعمیر اور ثقافتی علوم کو شامل کرتی ہے۔ اس نظریہ کے حامیوں نے جدیدیت کے نتیجے ظاہر ہونے والی فلسفیانہ، ثقافتی اور سیاسی جہتوں کی سختی سے جانچنے کے خیال کو چیلنج کیا ہے۔اگرچہ جدیدیت مخالف روایت تقریباً جدیدیت کے دور سے تعلق رکھتی ہے، لیکن مابعد جدیدیت نے خاص طور پر 1970 کی دہائی سے اہمیت حاصل کی ہے۔بعد کی اگلی تین دہائیوں میں مابعد جدیدیت نے عالمی مقبولیت حاصل کی جس کا مرکز جدید ترین اور ترقی یافتہ مغربی دنیا تھی۔

مزید یہ کہ اس نظریہ نے تاریخ نویسی کے طریقہ کار کی روایت پر اپنا گہرا اثر چھوڑا، جس کا اثر مغربی معاشروں کے ساتھ ہندوستانی تاریخ نویسی روایت پر بھی ہوا۔مابعد جدیدیت تاریخی انداز بیاں کے روایتی انداز کو چیلنج کرتی ہے، جس کی وجہ سے ایک بہت ہی زیادہ تنقیدی اور اضطراری تناظر منظر عام پر آئی۔ ہندوستانی تاریخ نویسی پر مابعد جدیدیت کا ایک اہم اثر یہ رہا ہے کہ اس نظریہ کے وجہ سے ہندوستان کی تاریخ کا نوآبادیاتی انداز بیاں کو از سر نو جائزہ کیا گیا۔ آج مورخین صرف ایک انداز بیاں سے ہٹ کر نوآبادیاتی دور میں موجود مختلف طبقات کے کثیر جہتی تجربات کو تلاش کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔مزید برآں، مابعد جدیدیت نے ہندوستان میں تاریخ نویسی سے متعلق ایک زیادہ جامع نقطہ نظر کی حوصلہ افزائی کی ہے، جس میں اس بیانیے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا جسے پہلے نظرانداز کیا گیا تھا۔طاقت کے ڈھانچے پر ساختیاتی عمل کرنے اور تاریخی اتھارٹی پر سوال اٹھانے پر نظریہ مابعد جدیدیت کے زور نے ہندوستانی تاریخ کے تناظر میں واقعات، شناختوں اور ثقافتی حرکات کو سمجھنے کے لیے باریک بینی کا راستہ ہموار کیا۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جدیدیت کی تاریخ، اصول اور اہم پہلوؤں سے واقف ہوں گے۔
- جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین فرق کو سمجھ پائیں گے۔
- مابعد جدیدیت کی اصطلاح کے تاریخی پس منظر اور اس کے اصولوں سے واقف ہوں گے۔
- نظریہ مابعد جدیدیت اور علم تاریخ یا تاریخ نویسی کے مابین رشتوں کو سمجھ پائیں گے۔
- مابعد جدیدیت کے تین اہم فلسفی، فوکو، دریدا اور ہیڈن وائٹ، لیوٹارڈ، نطشے وغیرہ کے بارے میں جانیں گے۔
- ہندوستانی تاریخ نویسی میں مابعد جدیدیت کے نظریات کے اطلاق اور ان سے ملحق مؤرخین اور ان کی تصانیف سے بھی واقف ہوں گے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
Estd. 1998
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

16.2 جدیدیت کیا ہے؟ (What is Modernism?)

مابعد جدیدیت جدیدیت کا ہال رد عمل ہے، جسے اکثر جدیدیت کے خلاف سمجھا جاتا ہے، سادہ لفظ میں اسے جدیدیت کے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ جدیدیت کے اصولوں اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے ساتھ فلسفیوں کی مصروفیت اور مشغولیت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے مابعد جدیدیت میں جانے سے پہلے جدیدیت کے بنیادی اصولوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ نظریہ جدیدیت میں سائنسی یقین کی جستجو، سچائی کی جستجو، درستگی پر زور، عمومی اصولوں کا قیام اور آفاقی قوانین کی شناخت کرنا شامل ہیں۔ یورپین ممالک میں جدیدیت کا عمل نشاۃ ثانیہ کے دور میں شروع ہوا، جسکا مرکزی نقطہ جدید علوم کا ظہور اور ترقی تھا۔ جدیدیت نے یقین، سچائی، درستگی، عمومی اصولوں اور آفاقی قوانین کے حصول پر زور دیا ہے۔ رینے ڈیکارٹ جیسے فرانسیسی فلسفی، والٹیئر، مونٹیسکو یو اور ڈیڈروٹ جیسے روشن خیال مفکرین، کانٹ اور ہیگل جیسے جرمن فلسفیوں نے جدیدیت کے لیے فلسفیانہ جواز فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس فکری تحریک نے یورپ میں عہد وسطیٰ اور سامنتی نظام کے خاتمے کو نشان زد کیا، جس نے ایک ایسے دور کو جنم دیا جہاں عقل سب سے اہم تھی۔ مندرجہ ذیل میں وہ بنیادی اصول دیے گئے ہیں جن کی تبلیغ جدیدیت نے کی۔

- سماجی اصولوں کو سمجھنے اور نظریہ سازی کے لیے سائنسی طریقوں اور عقلی تحقیقات کے اطلاق پر سخت زور۔
- روشن خیالی کے اصولوں کو اپنانا، جو استدلال، انفرادی آزادی اور روایتی اختیار اور عقیدہ کو مسترد کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔
- انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں، جیسے ٹیکنالوجی، علم اور سماجی تنظیم میں مسلسل ترقی کے خیال میں یقین۔
- مذہبی اور سیاسی شعبوں کی علیحدگی، مذہبی خیالات اور سماجی تنظیموں کی تشکیل کے بجائے سیکولر خیالات پر زور دینا۔
- ذاتی آزادی، انتخاب اور خود ارادیت پر توجہ کے ساتھ، خود مختار فرد کی اہمیت کو بڑھانا۔
- عالمی اصولوں اور اقدار کو اہمیت دینا جو ثقافتوں اور معاشروں میں نافذ ہوتے ہیں جو اکثر زیادہ مقامی یا مخصوص نقطہ نظر کے برعکس ہوتے ہیں۔
- تکنیکی اختراع کے لیے عزم اور یہ یقین کہ سائنسی اور تکنیکی ترقی معاشرتی بہتری کا باعث بنے گی۔
- انفرادی انسانوں کی قدر کرنا جو اکثر انسانی وجہ اور تجربے پر زور دیتے ہیں۔

ان جدید اصولوں نے انسانی تاریخ کے دھارے کو نمایاں طور پر بدل دیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک، جدیدیت کی تیز رفتا نشو ونما نے مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں عہد وسطیٰ کے معاشی، سماجی اور سیاسی ڈھانچے کو ختم کر دیا تھا اور ان کی جگہ مکمل طور پر نئے معاشی، سماجی اور سیاسی نظم نے لے لیا۔ جدیدیت کے اصولوں کی وجہ سے اقتصادی تبدیلیوں میں وسعت، صنعت کاری کو فروغ، سرمایہ داری نظام کے عروج اور تجارت کا عالمی پیمانے پر وسعت ہونے کے ساتھ ساتھ، زرعی پیداوار اور طریقہ کار میں بھی تبدیل ہوئی۔ اگرچہ نظریہ جدیدیت ان اس کے ملحق اصولوں کی وجہ سے دنیا میں مثبت تبدیلیاں ہوئیں لیکن اس نے انسانی نوعیت کے لیے بے مثال مصائب کا راستہ بھی ہموار کیا۔ روایتی عقائد اور اقدار سے علاحدگی نے ایک ایسا بحران پیدا کیا ہے جس نے افراد اور لوگوں اپنے وجود سے متعلق سوالات سے دوچار ہونا پڑا اپنی

اور شناخت اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے نئے ذرائع تلاش کرنا پڑا۔ جدیدیت سے منسلک نظریہ ترقی اور خوشحالی کے حصول نے ماحولیاتی چیلنجوں کو پیدا کیا جس میں آلودگی، وسائل کی کمی اور موسمیاتی تبدیلی شامل ہیں۔ اسی کے نتیجے نظرہ جدیدیت پر سماج کے مختلف طبقات نے تنقید کیا۔ ان ناقدین میں ماحولیات کے ماہرین، سماجی انصاف کے حامی اور مابعد جدید مفکرین شامل تھے۔ ان تمام لوگوں نے سماجی فلاح و بہبود، ثقافتی تنوع اور انسانی رشتوں پر نظریہ جدیدیت کے اثرات کا تجزیہ کیا۔

جدیدیت کی وجہ سے دنیا میں ہونے والی ان گہرے تبدیلیوں کے پس منظر میں، مابعد جدیدیت ایک فکری تحریک کے طور پر ظاہر ہوئی جس میں مفکرین کی جدیدیت کے اقدار کے ساتھ تنقیدی طور سے مشغولیت رہی۔ نظریہ مابعد جدیدیت نے جدیدیت کے ذریعے قائم کردہ عقائد، آفاقی سچائیوں اور عظیم انداز بیان پر پر سوال اٹھائے اور ان کو اس سر نو تشکیل دی۔ اس نے جدیدیت پسند عالمی نظریہ میں شامل ترقی سے متعلق درجہ بندی کے ڈھانچے، استعارات اور مفروضوں کو چیلنج کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے، مابعد جدیدیت نے تجربات اور نقطہ نظر کے تنوع کو تسلیم کرتے ہوئے ایک زیادہ تکثیری اور بکھرے ہوئے نقطہ نظر کو اپنایا جسے جدیدیت نظرانداز کرتی ہے۔ جدیدیت پسند اقدار کے ساتھ یہ مفکرین کی تنقیدی مشغولیت مابعد جدید فکر کی ایک متعین خصوصیت بن گئی، جس نے فلسفہ، ادب، آرٹ اور ثقافتی علوم سمیت مختلف شعبوں کو متاثر کیا

16.3 مابعد جدیدیت کیا ہے؟ (What is Post-Modernism?)

ایک فلسفیانہ گفتگو کے طور پر مابعد جدیدیت کی ابتدا 1979 کے درمیان ہوئی جس کی نشان دہی لیوٹارڈ (Lyotard) کے پرچے سے ہوئی اور 1980 میں جورگن ہیبرماس (Jurgen Habermas) کا جدیدیت پر کانفرنس منعقد ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے مابعد جدیدیت فلسفیانہ گفتگو میں کوئی خاص مرکزی مقام تو نہیں رکھتی تھی لیکن ادب یا فن تعمیر جیسے مقامی مضامین میں ضرور ذکر ہوتا تھا۔ اس دور میں فلسفے کے دائرے سے ضم ہونے کے بعد مابعد جدیدیت اپنے مقامی مضامین سے نکل کر عالمی اہمیت حاصل کی۔ اس تبدیلی کی وجہ سے مابعد جدیدیت کو وسیع پیمانے پر ایک فکری گفتگو کی حیثیت ملی۔

اگر ہم خود اس اصطلاح کی تاریخ کی تحقیق کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ 1870 کے اوائل میں ، 'پوسٹ ماڈرن' (مابعد جدیدیت) کی اصطلاح انگریزی مصور جے ڈبلیو چاپمین (J.W. Chapman) نے ان پینٹنگز کو بیان کرنے کے لیے جس پر فرانسیسی تاثرات کی وجہ سے زیادہ جدید سمجھا جاتا تھا، کے لیے استعمال کیا تھا۔ 1917 میں، روڈولف پینوٹز (Rudolf Pannwitz) نے اس اصطلاح کو یورپی ثقافت میں عصبیت پسندانہ رجحانات کے اظہار کے لیے استعمال کیا تھا۔ مابعد جدیدیت کی خصوصیات کئی اہم اصولوں سے بھی ہوتی ہے، جو اکثر جدیدیت کے اصولوں کے خلاف چیلنج یا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، آرنلڈ ٹوائن بی (Arnold Toynabee) (1889–1975) نے اس اصطلاح کو اپنے یادگار تصنیف، *A Study of History* (1934–61) میں استعمال کیا، تاکہ 1875 کے قریب یورپی معاشرے اور ثقافت میں ہونے والی تبدیلی کی وضاحت کی جاسکے۔ ٹوائن بی

(Toynabee)نے اس دور کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مابعد جدیدیت کا دور عہد وسطیٰ کے بعد آنے والے سابقہ جدید دور سے علیحدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ان کے تجزیے کے مطابق مغربی تاریخ کا یہ مرحلہ انقلابات، جنگوں اور سماجی وسیاسی اتھل پتھل سے نمایاں تھا۔انہوں نے دلیل دی کہ مابعد جدید دور کو عقلیت پسندی، استحکام اور روشن خیالی کی اہمیت کے خاتمے سے نشان زد کیا گیا جس نے 1875 تک جدید دور کی تعریف کی تھی۔

1960 کی دہائی میں امریکہ کے ثقافتی نقادوں اور مبصرین، سوسن سونٹاگ(Susan Sontag) اور لیسلی فیڈلر(Leslie Fiedler) نے ادب میں ظاہر ہونے والی ایک 'نئی حساسیت' کو بیان کرنے کے لیے مابعد جدیدیت مقبول بنایا۔بیان کردہ حساسیت نے یا تو جدید تجربہ اور تکنیکوں کو رد کر دیا یاان کو اپنا کر اور وسیع کیا۔بعد کی دہائیوں میں، مابعد جدیدیت کی اصطلاح ادبی تنقید اور فن تعمیر سے آگے بڑھی، علمی مضامین جیسے سماجی نظریہ، ثقافتی اور میڈیا اسٹڈیز، بصری فنون، فلسفہ اور تاریخ تک وسعت ہوئی۔اس وسیع استعمال کی وجہ سے یہ اصطلاح کا معنی زیادہ مشکل ہو گیا، کیونکہ اس کا اطلاق ثقافتی پہلو کے ساتھ ساتھ سماج اور سیاست پر بھی کیا گیا۔مابعد جدیدیت کے کچھ بنیادی اصولوں میں مندرجہ ذیل اصول شامل ہیں:

مابعد جدیدیت نے روشن خیال فلسفیوں کے نظریات کو چیلنج کیا جو عالمگیر علم پر یقین رکھتے تھے۔اس نظریہ نے بنیادی علم کے حصول پر بھی تنقید کی اور اس تصور پر سوال اٹھایا کہ کوئی حتمی، معروضی سچائی یا اصولوں کا مجموعہ ہے جو ہر چیز کی وضاحت کر سکتا ہے۔خلاصہ یہ کہ مابعد جدیدیت نے سچائی اور علم کی ایک واحد، عالمگیر طور پر قابل اطلاق تفہیم کے امکان کے بارے میں شکوک وشبہات کو جنم دیا۔اس نے عظیم نظریات اور آفاقی قوانین پر سختی سے سوال اٹھایا۔اس کے بجائے، اس نے تناظر اور مقامی بیانیے کی کثرت پر زور دیا۔مابعد جدیدیت سائنس کے اس دعوی کو کہ سائنس کے ذریعے سچائی حاصل کی جاسکتی ہے کو مسترد کرتی ہے۔دراصل یہ معروضی سچائی کے خیال پر سوال اٹھاتی ہے اور علم سے وابستہ یقین کو چیلنج کرتی ہے۔یہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ سچائی موضوعی ہے اور ثقافتی، تاریخی اور انفرادی سیاق وسباق سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔مابعد جدید نظریات کے مطابق، سچائی صرف لسانی مداخلت کے دائرے میں موجود ہے۔زبان حقیقت اور انسانی تجربے کی معمار ہے۔نتیجتاً، زبان کی حدود سے باہر سچائی کی جستجو کو فضول سمجھا جاتا ہے، کیونکہ زبان کی تشکیل خود انفرادی اور مقامی ثقافتوں سے ہوتی ہے۔اس نے یہ بھی پیش کیا کہ سچائی کے علم کا تصور ہی طاقت اور تسلط کی جستجو سے چلتا ہے۔

مابعد جدیدیت meta-narratives یعنی ایک ایسی جامع کہانی یا نظریہ جو حقیقت کی مکمل وضاحت کرنے کا دعوی کرتا ہے، کے بارے میں شکوک وشبہات رکھتی ہے۔یہ انسانی تجربات کی ہنگامی اور تنوع پر زور دیتی ہے۔نطشے(Nietzsche) جن کا شمار اہم فلسفیوں میں کیا جاتا ہے۔ان کے خیالات نے بعد کے فلسفیوں کو مابعد جدیدیت کے نظریات کو بیان کرنے اور سمجھنے میں مدد فراہم کی۔وہ اس طرح کے میٹانیریٹو (meta-narrative) کو مسترد کرتے ہیں۔مابعد جدیدیت اکثر اپنے نظریات وخیالات کا اظہار کرتے وقت طنزیہ اور شوخی انداز اپناتی ہے اور جدیدیت کے فن وادب سے وابستہ سنجیدگی اور صداقت کو مسترد کرتی ہے۔مابعد جدیدیت اکثر اعلی اور ادنی ثقافت

کے درمیان فرق کو دھندلا کرتے ہوئے عام ثقافت کے عناصر کو شامل کرتی ہے۔

مابعد جدیدیت مختلف ثقافتوں ، انواع اور طرز کے عناصر کو دو معنی، اختلاط اور ملاوٹ کو اپناتی ہے۔ باہمی متن (intertextuality)، یعنی دیگر متنوں کا حوالہ، انضمام اور شمولیت مابعد جدیدیت کی ایک عام خصوصیت ہے۔مابعد جدیدیت افراد کے موضوعی تجربے (subjective experience) پر زور دیتی ہے اور ایک متحد، مستحکم نفس کے خیال (idea of a unified and stable self)کو چیلنج کرتی ہے۔یہ شناخت کی بکھری ہوئی اور سریع الحرکت نوعیت(fragmented and fluid nature of identity)کو پہچانتی ہے۔

مابعد جدیدیت انسانی تاریخ کے ایک خطی، ترقی پسند اور شفاف انداز میں جدیدیت کے عقیدے میں مسترد کرتی ہے۔تاریخ میں مختلف فلسفیوں، جیسے کہ برنارڈ ڈی فونٹینیل(Bernard de Fontenelle)، ابی ڈی سینٹ پییرٔ(Abbe de Saint Pierre)، مارکوئس ڈی کونڈورسیٹ(Marquis de Condorcet)، سینٹ سائمن(Saint Simon)، آگسٹ کومٹے (August Comte)، کارل مارکس(Karl Marx)، امینول کانت(Immanuel Kant) اور دیگر نے مختلف کبھی کبھی ترقی کے تصور کو قبول کیا ہے۔انہوں نے نظریہ مابعد جدیدیت کی جڑیں تیار کیں۔پیشرفت (Progressive) پر یقین تاریخ کی ایک ایسی تشریح پر مبنی ہے جو انسانیت کو ایک مخصوص اور مطلوبہ سمت میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھتی ہے، اس اندازہ کے ساتھ کہ یہ ترقی غیر معینہ مدت تک جاری رہے گی۔مابعد جدیدیت نے جگہ اور وقت کے اس جدید تصور کو قبول کرنے سے انکار کیا اور بکھرے ہوئے اور غیر خطی بیانیے کی وکالت کی۔

مابعد جدیدیت کا ایک تنقیدیہ بھی ہے کہ کس طرح جدید نظریہ نے ثنایت (binary) کا استعمال کرتے ہوئے دنیا اور علم منظم کرتی ہے۔مابعد جدیدیت پسندوں کے مطابق، جدیدیت پسندوں نے علم کو ثنایت (binary) میں تقسیم کیا جس میں انہوں نے سائنس بمقابلہ بیان بازی، ادب اور بیانیہ رکھا اور اس عمل میں سائنس کو حقیقی علم سمجھا گیا اور دوسرا کو محض تخیل کے طور پر دیکھا گیا۔اس نقطہ نظر نے دیگر ثقافتی اور سماجی ثنایت(binary) بھی بنائے جیسے حقیقت بمقابلہ افسانہ، سچ بمقابلہ تخیل اور مرد بمقابلہ عورت کو دیکھا۔اس عمل میں بھی دوسری اصطلاح کو عام طور پر کم اہمیت دی گئی۔مابعد جدیدیت ثنایت(binary) پر مبنی جدید نظریہ یا خیال ایسی انداز کو چیلنج کرتی ہے۔ اس کے بجائے، یہ اس خیال کو ظاہر کرتی ہے کہ بہت سے نقطہ نظر، اختلافات اور تغیرات ہیں۔یہ جدید نظریہ کے ذریعہ قائم کردہ ان سخت زمروں کو توڑتی ہے اور علم سے متعلق زیادہ واضح اور متنوع نظریہ کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

جدیدیت خود مختار اور خود شعور فرد پر اعتماد کرتی ہے اور خود مختاری اور خود شعوری کو مالک سمجھتی ہے۔اس کے برعکس، مابعد جدیدیت نے جدیدیت کے اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے کہ عقلیت اور انسانی شعور ایک بہتر نتائج کی طرف لے جائے گا۔مشیل فوکو (Michel Foucault)نے آگسٹ کومتے (August Comte)کے اثباتیت کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انسانی رویے

مکمل طور پر قوانین کے تحت نہیں چلتے۔اس کے بجائے، یہ منقطع، بے ترتیب اور غیر متوقع ہے۔ فوکو (Foucault) نے امینوئل کانت کے فلسفے انسان پسندی (philosophy of humanism) پر بھی سوال اٹھاتے ہوئے، اس خیال کو چیلنج کیا کہ "سائنسی ترقی اور علم میں اضافہ کا مطلب ہے کہ ہم اپنے پیشروؤں سے بہتر جانتے ہیں۔" فوکو(Foucault) نے استدلال کیا کہ پیدا ہونے والا علم علم کی بہتر شکلوں کی نمائندگی نہیں کرتا اور علم کے جمع ہونے کو ترقی کے مترادف نہیں کیا جانا چاہیے۔

16.4 نظریہ مابعد جدیدیت کے کچھ اہم مفکرین (Key Post-Modernist Philosophers)

مابعد جدیدیت کے فلسفے کا ارتقاء ایک متحرک عمل رہا ہے جس کی تشکیل مختلف شعبوں میں متعدد مفکرین کے کارنامے سے ہوئی ہے۔ان مفکرین نے مابعد جدیدیت کے اصولوں کی نشوونما اور اصلاح میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

فریڈرک نطشے (Friedrich Nietzsche, 1900-1844)، ایک ممتاز جرمن فلسفی ہیں جو مابعد جدیدیت کا ایک اہم پیش خیمہ ہے۔ نطشے (Nietzsche) کے فلسفے کے بنیادی اصول، نظریہ جدیدیت کے بنیادی اصول جیسے کہ عقل، سائنس، سچائی، معنی اور آفاقیت پر ان کی شدید تنقید کے گرد گھومتے ہیں۔ نطشے (Nietzsche) نے مغربی عقلیت پسند روایت پر سخت حملہ کیا، اس کی جڑوں کو افلاطون تک پہنچایا اور نظریہ جدیدیت میں مطلق سچائی کے بلند و بالا دعوؤں کو رد کر دیا۔ انکے کے مطابق، سچائی محض طاقت اور تسلط کے حصول کے لیے ایک بہانہ تھا۔ نطشے کے مطابق، انسانی تاریخ موروثی معنی، مقصد، یا پیشین گوئی کی اہلیت کے ساتھ ملحق نہیں تھی اور نہ ہی ہونی چاہیے۔ انہوں نے دیلیرانہ انداز میں کہا کہ غیر یقینی صورتحال انسانی حالت کی ایک وضاحتی خصوصیت ہے۔ مزید، نطشے نے مذہب کے زوال کا اعلان کرتے ہوئے 'خدا کی موت' کا اعلان کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اخلاقیات اور سچائی دونوں ہی مضحکہ خیز اور ناقابل حصول ہیں، جو ان مروجہ تصورات کو چیلنج کرتے ہیں جو ایک طویل عرصے سے انسانی فہم اور سماجی ترتیب کے لیے بنیاد تصور کیے جاتے تھے۔

ایک اور جرمن فلسفی مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger) گزرے ہیں جن کا تعلق نظریہ مابعد جدیدیت سے ہے۔ اگرچہ انکے فلسفے کو بآسانی مابعد جدیدیت سے ملحق نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کا نظریہ مابعد جدیدیت پر کچھ خاص اہم اثرات رہے ہیں۔ در اصل ان کے فلسفے وجودیت (existentialism) اور مظاہر (phenomenology) سے وابستہ ہے۔ اس کی تصنیف، خاص طور پر 'Being and Time' میں، انسانی وجود کی نوعیت اور وجود کے مفہوم کو تلاش کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی پر ان کی تنقید، روایتی مابعد الطبیعیات کو مسترد کرنا اور وجود کے موضوعی تجربے پر ان کا زور دینا یہ وہ تمام موضوع ہیں جن کی وجہ سے انکا رشتہ مابعد جدیدیت کے موضوعات سے ملحق ہے۔ اس نے ترقی کے خیال کو چیلنج کیا اور دنیا کے بارے میں ہماری سمجھ کو تشکیل دینے میں عقل کے اہم کردار پر سوال اٹھایا۔ ہائیڈیگر (Heidegger) کی فکر کا ایک قابل ذکر پہلو زبان کی کھوج ہے اور یہ کہ زبان ہمارے وجود کی سمجھ کو تشکیل دیتی ہے۔ یہ لسانی موڑ زبان، معنی اور علامات کی عدم استحکام سے متعلق مابعد جدیدیت کے خدشات کے متوازی ہے۔ اگرچہ انہوں نے خود واضح طور پر مابعد جدیدیت پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن ان کے خیالات کو فلسفہ مابعد جدیدیت کے وسیع تناظر میں قبول اور تشریح کی گئی ہے،

جو مابعد جدیدیت کے لیے بڑی حد تک معاون ہے۔

ایک فرانسیسی فلسفی اور سماجی نظریہ ساز مشیل فوکو (Michel Foucault) کو اکثر مابعد جدیدیت کے فلسفے میں سب سے اہم شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف و تحریر نے نظریہ مابعد جدیدیت کی نشوونما کو متاثر کیا ہے۔ ان کا کارنامہ طاقت، علم اور سماجی ڈھانچے کی نوعیت جیسے شعبوں میں خاص طور پر رہا ہے۔ ان کی تصنیفات جیسے *Archaeology of Knowledge, Madness and Civilization, History of Sexuality* اور *Discipline and Punish: The Birth of the Prison* تاریخی تحقیقات کے لیے نئے نظریات و خیالات فراہم کیا۔ فلسفہ مابعد جدیدیت کے حوالے سے طاقات سے متعلق فوکو کی کے خیالات ان کے ذریعے علمی نظاموں کی کھوج مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے اس بات پر دلیل پیش کی ہے کہ طاقت صرف ایک سماج میں موجود درجہ بندی کا ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ یہ پورے معاشرے میں منتشر ہے۔ ادارے، مکالمے اور طرز عمل وہ طریقہ کار ہیں جن کے ذریعے طاقت کام کرتی ہے اور سچائی اور علم کے بارے میں ہماری سمجھ کو تشکیل دیتی ہے۔

انہوں یہ تجزیہ کیا کہ زبان اور مواصلات کس طرح علم اور طاقت کے رشتوں کی تعمیر میں معاون ہیں۔ اسی تجزیہ سے انہوں نے گفتگو (discourse) کے تجزیے کے استعمال کا بھی آغاز کیا۔ انہوں نے اس بات میں دلچسپی دکھائی کہ کس طرح بعض مکالمے دوسروں کو پسماندہ سمجھتے ہوئے ہوئے علم اور اختیار کی مخصوص شکلوں کو قانونی حیثیت دیتے ہیں۔ اس نے لازمی ں ظریات (essentialist views) کو مسترد کیا جو مقررہ، آفاقی سچائیوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس نے جنون (madness)، مجرمانہ (criminality) اور جنسیت (sexuality) جیسے موضوع کے استحکام پر سوال اٹھایا، یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یہ تصورات تاریخی طور پر کس طرح متضاد ہیں اور تبدیلی کے تابع ہیں۔

فوکو نے بایو پاور (bio-power) کے نظریے کی کھوج کی، اور اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کی کہ جدید معاشرے طب، اداروں اور نگرانی جیسے کے ذریعے دنیا کی آبادی کو کس طرح منظم اور قابو کرتے ہیں۔ ان کا حکومتی تصور ان طریقوں کا تجزیہ کرتا ہے جن میں ریاستیں روایتی سیاسی ڈھانچے سے ہٹ کر افراد پر حکومت کرتی ہیں۔ پینوپٹیکن (panopticon) ان کا مشہور استعارہ ہے۔ جیل کا ایک ایسا ڈھنچہ جہاں ایک مبصر تمام قیدیوں کو یہ جانے بغیر دیکھ سکتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ استعارہ جدید معاشرے کی نظم و ضبط کی نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ یہ نگرانی اور خود ضابطے کے تحت ہونے کی علامت ہے۔

جین لیوٹارڈ، (Jean-Francois Lyotard (1924–1998)) مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو مقبول بنانے والا یاک ذمہ دار بنیادی دانشور شخصیت ہے۔ ان کی کتاب *The Postmodern Condition* ابتدائی طور پر 1979 میں فرانسیسی اور بعد میں 1984 میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ اس کتاب نے اس اصطلاح کو وسیع پیمانے پر استعمال میں لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیوٹارڈ (Lyotard) اپنی عظیم الشان مافوق الفطرت بیانیوں (grand or meta-narrative) پر تنقید کے لیے جانے جاتے ہیں

۔ جامع، وسیع کہانیاں یا نظریات جو پوری انسانی تاریخ یا معاشرے کی وضاحت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہوں نے دلیل دی ہے کہ مابعد جدید دور میں، لوگ ان عظیم داستانوں کے بارے میں شکی یا ناقابل یقین ہو گئے ہیں، جن میں ترقی، آزادی اور روشن خیالی کی داستانیں شامل ہیں۔

لیوٹارڈ نے دعویٰ کیا ہے کہ عظیم داستانوں کے زوال کا تعلق عصری معاشرے میں علم کی نوعیت میں ہونے والی تبدیلیوں سے ہے۔ انہوں نے مقامی، مخصوص اور متنوع داستانوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت پر روشنی ڈالی، اور یہ تجویز کیا کہ دنیا کی پیچیدگی کو ایک واحد، آفاقی کہانی تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ لڈوِگ وِٹگینسٹین (Ludwin Wittgenstein) کے 'زبان ایک کھیل' ہے کے تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے، لیوٹارڈ (Lyotard) نے علم کی تشکیل میں زبان کے کردار پر زور دیا۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ مختلف زبانوں کا کھیل یا گفتگو کی شکلیں آزادانہ طور پر چلتی ہیں اور انہیں ایک بیانیہ کے تحت یکجا کرنے کی کوششیں مشکل ہیں۔ انکے اس خیال نے لسانی طریقوں کی تکثیریت اور تنوع کی مابعد جدید تفہیم میں اہم کردار ادا کیا۔ مابعد جدیدیت کے فلسفے میں لیوٹارڈ کے کارنامے، مابعد جدیدیت پر ان کی تنقید، زبان کے کھیلوں کی تکثیریت پر ان کا زور دینا اور مابعد جدید حالت میں علم کی بدلتی ہوئی نوعیت کی کھوج میں مضمر ہے۔ ان کے خیالات نے فلسفہ، ثقافتی علوم اور فنون کے اندر ہونے والی بات چیت پر دیرپا اثر ڈالا ہے۔

جیکس دریدا (Jacques Derrida, 1930–2004)، ایک فرانسیسی فلسفی اور ادبی نقاد ہیں۔ انکے فلسفیانہ نظریات نے مابعد جدیدیت کے فلسفے کو تقویت بخشی۔ وہ ساختیت (deconstruction) سے متعلق اپنے تصور کے لیے سب سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ ساختیت ایک ایک طریقہ جو زبان میں ثانیت (binary oppositions) مخالفتوں اور درجہ بندی کو چیلنج کرتا ہے۔ ڈی کنسٹرکشن میں نصوص کے اندر موجود موروثی تضادات اور ابہام کا جائزہ لینا، معنی کی عدم استحکام کو ظاہر کرنا اور متعین سچائیوں کے تصور کو کمزور کرنا شامل ہے۔ ان کی تصنیف حقیقت سے متعلق ہماری سمجھ کو تشکیل دینے میں زبان کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ زبان معنی کے اظہار کے لیے شفاف ذریعہ نہیں ہے بلکہ فطری طور پر پیچیدہ ہے، جس کے معنی ہمیشہ تشریح کے لیے کھلے ہیں۔ یہ خیال زبان کے روایتی نظریات کو چیلنج کرتی ہے جس میں زبان کو گفتگو کرنے کے لیے ایک مستحکم اور شفاف ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ انکو روایتی مابعد الطبیعاتی تصورات (traditional metaphysical concepts) اور ثنائی مخالفتوں (binary oppositions) جیسے کہ موجودگی غیر موجودگی (presence-absence)، تقریر لکھنے اور حقیقت کی ظاہری شکل پر بھی شک تھا۔ ڈی کنسٹرکشن مغربی فلسفے کی بنیادوں کو چیلنج کرتے ہوئے ان مخالفتوں کے عدم استحکام اور باہمی انحصار کو ظاہر کیا۔ انہوں نے اس خیال پر زور دیا کہ معنی سیاق وسباق پر منحصر ہے اور متن متعدد تشریحات کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ڈی کنسٹرکشن اس سیاق وسباق پر توجہ مرکوز کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس میں نصوص تیار کیے جاتے ہیں، ان تناظر کے تنوع کو تسلیم کرتے ہوئے جو پیدا ہو سکتے ہیں۔

ہیڈن وائٹ (Hyden White) ایک امریکی مورخ اور مابعد جدید مفکر ہیں۔ ان کی بااثر تصنیف، Meta-history:

The Historical Imagination in Nineteenth-Century Europe 1973 میں شائع ہوئی۔اس کتاب کو بڑے پیمانے پر تاریخ کے فلسفے سے متعلق اہمیت حاصل ہے۔اس اہم تحریر کو تاریخی تحریر میں 'لسانی موڑ' میں ایک اہم کارنامہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ سوال کرنے کے بجائے، کہ 'تاریخ سائنس سے کیسے ملتی ہے؟' جیسا کہ روایتی طور پر کیا جاتا ہے، وائٹ یہ پوچھنے کی حوصلہ افزائی دیتے ہیں کہ 'تاریخ افسانے سے کیسے ملتی ہے؟'

وائٹ کی مرکزی دلیل یہ ہے کہ ماضی ہمارے سامنے منقطع تاریخ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ان ٹکڑوں سے ایک بامعنی بیانیہ تشکیل دینا مؤرخ کا کردار ہے۔وائٹ کا دعویٰ ہے کہ تاریخی واقعات میں ایک مربوط بیانیہ نہیں مل سکتا۔ بہترین طور پر، وہ کہانی کے عناصر پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا، مورخ، بعض واقعات کو تاکید کے لیے منتخب کر کے ایک مربوط بیانیہ تیار کرتا ہے جبکہ دوسروں کو نیچا دکھاتا ہے۔ یہ چناؤ واضح ہو جاتا ہے کیونکہ واقعات کے ایک ہی مجموعے کو مؤرخ کے سیاسی یا ذاتی تعصبات کی بنیاد پر المناک، ستم ظریفی یا مزاحیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وائٹ کا نقطہ نظر ایک خالص سائنسی کوشش کے طور پر تاریخ کے تصور کو چیلنج کرتا ہے۔اس کے بجائے، وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تاریخ ایک ادبی جستجو ہے اور تاریخی داستانوں کو سائنسی مقالوں کے طور پر نہیں بلکہ 'زبانی افسانوں' کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ یہ دعویٰ تاریخی کہانی کہنے کی تشریحی اور موضوعی نوعیت کی نشاندہی کرتا ہے، جو ایک کہانی کار کے طور پر مورخ کے کردار کو نمایاں کرتا ہے جو ماضی کو موروثی تعصبات اور تناظر کے ساتھ بیانیہ کی شکل دیتا ہے۔ان بااثر مفکرین نے مابعد جدید فلسفے کے منظر نامے کو نمایاں طور پر افزودہ اور بہتر کیا ہے۔

16.5 مابعد جدیدیت اور ہندوستانی تاریخی روایت

(Post-Modernism and Indian Historical Tradition)

نظریہ مابعد جدیدیت نے ہندوستانی تاریخ نویسی کے نقطہ نظر میں ایک مثالی تبدیلی لائی۔اس نے تاریخی تحقیق کے اندر ہمارے تناظر اور موضوعاتی تحقیق و تلاش کو افزودہ اور وسیع کیا ہے۔مابعد جدیدیت نے ہندوستانی تاریخ کی تحریر پر ایک اہم تبدیلی کے طور پر اثر ڈالا ہے۔ اس نے روایتی بیانیے کو چیلنج کرتے ہوئے اور ایک زیادہ جامع اور تنقیدی نقطہ نظر کو متعارف کرایا ہے۔ عظیم تاریخی داستانوں کی تعمیر پر زور دیتے ہوئے اور قائم کردہ اصولوں پر سوال اٹھاتے ہوئے، ہندوستانی تاریخ نویسی میں مابعد جدیدیت کے تناظر نے متنوع آوازوں اور تجربات کو تلاش کرنے کے راستے کھولے ہیں۔اس کی وجہ سے طاقت کے ڈھانچے کا از سر نو جائزہ لیا گیا، جس میں خواتین، اقلیتوں اور مقامی گروہوں کو پسماندہ کر کے اکثر نظر انداز کی جانے والی تاریخوں کو اجاگر کیا گیا۔ متعدد زاویوں پر زور اور شناختوں کی روانی اور ساختی نوعیت کی پہچان نے ہندوستان کی پیچیدہ تاریخ کی ایک زیادہ باریک بینی کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔مابعد جدیدیت نے تاریخ دانوں کو زبان، نمائندگی اور یورو سینٹرزم () کے اثر و رسوخ کی جانچ پڑتال کرنے کی ترغیب دیکر ایک تاریخی منظر نامے کو فروغ دیا ہے جو ہندوستان کے ماضی کی تنوع کو ظاہر کرتا ہے۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت نے موضوعی طور پر تاریخ کے میدان میں تحقیق کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔ پچھلی چند دہائیوں میں LGBTQ سے متعلق تحقیق، جنون اور نفسیاتی طریقوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

مابعد جدیدیت کی مداخلت کے اثرات سبالٹرن اسکول آف ہسٹری رائٹنگ (Subaltern School of history writing)، پوسٹ نوآبادیاتی تاریخ نویسی (post-colonial historiography)، ماحولیاتی تاریخ اور مرد و عورت کے صنفی تاریخ (environmental history, and gender history) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فلسفہ مابعد جدیدیت نے ہندوستانی تاریخ کی تحریر کو متاثر کیا اور بااثر سبالٹرن اسٹڈیز تحریک کو جنم دیا، جس کا افتتاح کلکتہ میں 1982 میں ہوا۔ اس تحریک نے ہندوستان میں کسانوں، صنعتی کارکنوں سمیت غیر اشرافیہ یعنی "سبالٹرن" کی آواز کو بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خواتین اور قبائلی کمیونٹیز، جنہیں پہلے کی تاریخی روایات سے خارج کر دیا گیا تھا۔ کچھ مورخین اور دانشور جیسے کہ رنجیت گوہا، دیپش چکرورتی، گیان پرکاش، پارتھا چڑجی اور گایتری سپیوک نے نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی معاشروں کے علم کی تشکیل کے لیے مابعد جدیدیت کی اقدار کو بروئے کار تعارف کیا ہے۔ سبالٹرن اسٹڈیز گروپ کے مؤرخین کا مقصد موجودہ سامراجی تاریخ میں اشرافیہ اور یورپ مرکوز نقطہ نظر کے غلبے کو چیلنج کرنا تھا۔ انہوں نے "کیمبرج اسکول" پر بظاہر اشرافیہ کی نوآبادیاتی میراث کی حمایت کرنے پر بھی تنقید کی۔ طبقاتی، ذات، جنس، نسل، زبان اور ثقافت کے لحاظ سے سبالٹرن کو سمجھنے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ اس ادبی تحریک کے رہنما رنجیت گوہا نے ہندوستان میں کسانوں کی بغاوتوں کے بارے میں لکھا تھا۔

سبالٹرن مورخین میں، رنجیت گوہا سب سے مشہور شخصیت کے طور پر کھڑے ہیں۔ ان کی تصنیف، *The Elementary Aspects of Peasants Insurgency in Colonial India* کو بڑے پیمانے پر سبالٹرن تاریخی مطالعات کے لیے ایک اہم نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ گوہا نے نوآبادیاتی ہندوستان میں انیسویں صدی کی کسان بغاوتوں کا مطالعہ کیا، جس نے کسانوں کے باغی شعور کے بارے میں ایک دلکش بصیرت پیش کی۔ انہوں نے گپ شپ، روحانی نظریات، مذہبیت اور ذات اور برادری کے رشتوں جیسے پہلوؤں کی کھوج کی۔ گوہا کا مقصد نوآبادیاتی ہندوستان میں کسانوں کی زندگیوں کے حقیقی حالات سے پردہ اٹھانا تھا، اس بات پر زور دیتے ہوئے کہ انہیں اپنے طور پر تاریخ کے موضوع کے طور پر نظر انداز کیا گیا تھا۔ گوہا کے مطابق، اشرافیہ کی تاریخ نویسی کسانوں کے حالات اور بغاوتوں کو درست طریقے سے سمجھنے میں ناکام رہی۔ انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستانی کسان اس بات سے واقف تھے کہ ان کی بغاوت کا سماجی اور سیاسی دونوں لحاظ سے نوآبادیاتی انتظامیہ پر کیا اثر پڑے گا۔ اس نقطہ نظر نے عام نظریہ کو چیلنج کیا کہ بغاوتیں محض سماجی انصاف کے لیے جدوجہد تھیں۔

سبالٹرن اسٹڈیز سیریز کے تین مضامین سبالٹرن اسٹڈیز گروپ کے بنیادی خیالات کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ اپنے پہلے مضمون، 'Colonialism in South Asia: A Dominance without Hegemony, 1989' میں ہندوستانی مؤرخین کے تصنیفات پر برطانوی نوآبادیاتی تاریخ نویسی کے جاری اثر کو اجاگر کیا اور خود تنقید کی ضرورت پر زور دیا۔ 'کیمبرج اسکول' کے مورخین کی کوششوں کو تسلیم کرتے ہوئے جنہوں نے اپنی توجہ مقامی اور علاقائی کارروائیوں کی طرف موڑ دی، گوہا نے استدلال کیا کہ یہ نقطہ نظر اشرافیہ اور نوآبادیاتی ہے، جو ہندوستانی کے بجائے برطانوی نقطہ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔

اپنے دوسرے مضمون، 'Discipline and Mobilize: Hegemony and Elite Control in Nationalist Campaigns' 1992. میں سودیشی تحریک کے دوران مہاتما گاندھی کی سیکولر اور روحانی طاقتوں کے انوکھے امتزاج کے استعمال کی جانچ کرتا ہے۔ گہانے مشاہدہ کیا کہ کس طرح گاندھی نے ذات پات کی پابندیوں کو چیلنج کیا اور اسے سیاست کے اشرافیہ اور ذیلی علاقوں کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازعہ کے مظہر کے طور پر دیکھا۔ گوہا نے اپنے تیسرے مضمون، 'An Indian Historiography of India: Hegemonic Implications of a Nineteenth-Century Agenda' 1988. میں، اپنا توجہ ماضی کی اشرافیہ کی ہیرا پھیری پر مرکوز کیا ہے۔ انہوں نے انیسویں صدی کے ایجنڈے کے مضمرات پر روشنی ڈالی جس میں ہندوستان میں تاریخ کو کس طرح سمجھا جاتا ہے اور یہ کہ تاریخی بیانیوں پر اشرافیہ کے نقطہ نظر کے بالادست اثر کو کس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

سبالٹرن کا تصور، جو سماجی اور سیاسی طور پر پسماندہ گروہوں کا حوالہ دیتا ہے، معروف ہندوستانی-امریکی مابعد نوآبادیاتی حقوق نسواں کے نقاد، گایتری چکرورتی سپیواک کی شمولیت کے ساتھ ایک زیادہ پیچیدہ نظریاتی بحث کا موضوع بن گیا۔ اس کے بااثر مضمون 'Can the Subaltern Speak', 1988 میں سپیواک نے سبالٹرن کے تصور کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اپنی تصنیف میں، سپیواک نوآبادیاتی جبر کی متفاوت نوعیت پر توجہ مرکوز کرتی ہیں، اس تصور کو چیلنج کرتی ہے کہ یہ ایک واحد، یکساں تجربہ ہے۔ وہ 1980 کی دہائی کے دوران مابعد نوآبادیاتی مطالعات کے میدان میں ایک نمایاں شخصیت کے طور پر ابھری، جنہوں نے ان دونوں لطیف اور واضح اختلافات کی طرف توجہ مبذول کرائی جو نوآبادیاتی یا مقامی لوگوں میں فرق کرتے ہیں۔ سپیواک ان لوگوں کی تفہیم کو وسیع کرتے ہے جنہیں مقامی کے طور پر درجہ بندی کیا گیا ہے، اس گروپ میں تارکین وطن اور پناہ کے متلاشیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کی اہم بصیرت یہ ہے کہ نوآبادیاتی جبر یک سنگی نہیں ہے اور جبر کی مختلف شکلیں مختلف خطوں میں یا مختلف لوگوں کے درمیان موجود ہو سکتی ہیں۔ وہ نوآبادیاتی جبر اور شعور کے اندر موجود تضادات کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے اپنے سرپرست جیک ڈیریڈا سے متاثر ہو کر ڈی کنسٹرکشن کی تکنیک استعمال کرتی ہے۔

سپیواک کے تحریر کا ایک مخصوص پہلو نوآبادیاتی تجربات کے اندر صنفی شکلوں کی تلاش ہے، جو متنوع نوآبادیاتی مقابلوں کی بصیرت فراہم کرتا ہے۔ "سبالٹرن" کی اصطلاح، جس کا استعمال ان کی کتاب میں نمایاں طور ہوا ہے، اطالوی مارکسسٹ انتونیو گرامسی کے خیالات سے اخذ کی گئی ہے، جنہوں نے ابتدا میں اسے غیر اشرافیہ کے سماجی طبقات اور پرولتاریہ کی نشاندہی کرنے کے لیے استعمال کیا۔ تاہم، Spivak نے اس اصطلاح کو بڑھایا ہے کہ وہ گرامسکی کی ذریعے شناخت کیے گئے گروہوں سے بھی کم گروپوں کو شامل کریں، جیسے کہ قبائلی، غیر شیڈول ذاتیں، اچھوت اور ان پسماندہ گروہوں میں خواتین وغیرہ۔ سپیواک اس حقیقت پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ خواتین پر بہت سے مابعد نوآبادیاتی مطالعات پہلی دنیا کی خواتین کی طرف سے منعقد کی جاتی ہیں۔ وہ نوآبادیاتی زندگی گزارنے والی خواتین کی آوازوں کی نقل مکانی یا تبدیلی کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتی ہے اور مابعد نوآبادیاتی گفتگو کے اندر متنوع نقطہ نظر پر غور کرنے کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے فلسفے کا اثر پار تھا چٹرجی کے کاموں میں دیکھا جا سکتا ہے فوکو کے ساتھ اپنی مصروفیت میں، پار تھا چٹرجی نے اپنے بنیادی تصنیف، 'Nationalist Thought and the Colonial World: A Derivative Discourse?، میں اس بات پر زور دیا کہ سماجی اور سیاسی جہتوں نے ایک معمول پر اثر ڈالا، تاریخ کے تناظر میں خاص طور پر قوم کے ارد گرد گفتگو کے ذریعے۔ تاریخ مخالف موقف اختیار کرتے ہوئے، چٹرجی نے دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں مروجہ تاریخی بیانیہ اشرافیہ کے حق میں ہے، جو ایک قومی تناظر کی عکاسی کرتا ہے جس میں پسماندہ گروہوں کے تجربات کو خارج کر دیا گیا ہے۔

چٹرجی کی پوزیشن یورپی روشن خیالی کی تاریخ کی روایتی سمجھ کو چیلنج کرنے والوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے، انہوں نے اور دوسرے سبالٹرن دانشوران نے "History from Below" بنانے کی وکالت کی۔ اس نقطہ نظر کا نچوڑ ان بیانیوں کو تیار کرنے میں مضمر ہے جو تاریخی طور پر پسماندہ لوگوں کے تناظر اور تجربات سے نکلتے ہیں۔ جیسا کہ اقتباس اشارہ کرتا ہے، سبالٹرن کی تاریخ اشرافیہ کی تاریخوں سے آزادانہ طور پر موجود ہے، جو ایک ایسا متبادل پیش کرتی ہے جو خود مختار بالادستی کے اصولوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ تصور پہلے کی بحثوں سے منسلک ہے جو اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح سیاسی بغاوت میں ان کے کردار کے بارے میں سبالٹرن کا نظریہ ایک "غیر معقول" تاریخ کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے جو قائم کردہ اصولوں کو چیلنج کرتا ہے۔ عصر حاضر میں، دیپش چکربرتی نے سبالٹرن اسٹڈیز اور ڈی کالونائزیشن کے شعبے میں قابل ذکر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ 2011 میں، اس نے سبالٹرن اسٹڈیز کی "غیر ارادی لیکن پیدا ہونے والی غلطیوں" پر بحث شروع کی، خاص طور پر رنجیت گوہا کی طرف سے اپنی اشاعت "نوآبادیاتی ہندوستان میں کسانوں کی بغاوت کے ابتدائی پہلو" (1983) میں باغی شعور کی بھاری ساختی عکاسی پر تنقید کی۔ ایک واحد ساختی شکل پر گوہا کے اصرار نے مورخین کی طرف سے تنقید کی۔

چکربرتی، "ہندوستان میں بڑے پیمانے پر سیاسی موضوع کا شجرہ نسب" بناتے ہوئے، ابتدائی سبالٹرن اسٹڈیز میں کسانوں کی بغاوت کی تصویر کشی کا دوبارہ جائزہ لیتے ہیں۔ وہ ان ہجوم کی الگ سیاسی موجودگی کو اجاگر کرتے ہوئے، جدید ہندوستان میں آثار قدیمہ کی موجودگی پر زور دیتے ہیں۔ آزادی کے بعد کے ہندوستان کی انتخابی لہر میں ہو یا منظم مظاہروں اور فسادات میں، ان ہجوم نے ہندوستانی آئین سے پہلے کے اجتماعی طریقوں کے نشانات کی نمائش کی۔ سبالٹرن اسٹڈیز میں چکربرتی کے مطالعے نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی جدیدیت کے دوران ان ہجوم کی متفاوت نوعیت کے کچھ انتہائی زبردست مظاہروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہے کہ وہ کس طرح ہائبرڈ تھے جس نے جدید ہندوستان کے بیانیے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

2000 میں پہلی بار شائع ہونے والی اپنی کتاب "Provincializing Europe: Post Colonial Thought and Historical Difference" میں، دیپش چکربرتی اس بارے میں بات کرتے ہیں کہ کس طرح لوگ اکثر غیر مغربی ممالک کی ترقی کی تاریخوں میں یورپ کو جدیدیت کی اصل جائے پیدائش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ چکربرتی کا استدلال ہے کہ یورپ کا

یہ خیال ایک افسانوی اور اعلیٰ مقام کے طور پر سماجی علوم میں گہرا اجڑا ہوا ہے۔ جب ہم تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہم اکثر وقت، دائرہ کار اور طاقت کے بارے میں یورپی نظریات کا استعمال کرتے ہیں، جس سے ایسا لگتا ہے کہ غیر مغربی ممالک میں سرمایہ داری کی ترقی نامکمل ہے۔

مابعد جدیدیت نے ہندوستان میں ماحولیاتی تاریخ کے آغاز کی راہ ہموار کی ہے۔ ملک میں ماحولیاتی مورخین نے انسانوں اور ان کے قدرتی ماحول کے درمیان پیچیدہ تعلقات کو بیان کرنے کے لیے مابعد جدیدیت کے اصولوں کو استعمال کیا ہے۔ دانشوران نے مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر کو استعمال کیا ہے تاکہ روایتی بیانیے کو تشکیل دیا جا سکے اور ماحولیاتی تاریخ میں قائم تصورات کو چیلنج کیا جا سکے۔ مابعد جدیدیت، عظیم داستانوں پر سوال اٹھانے اور متعدد نقطہ نظر کو تسلیم کرنے پر اپنے زور کے ساتھ، دانشوران کو ہندوستان میں ماحولیاتی تبدیلیوں کے تاریخی اکاؤنٹس کا دوبارہ جائزہ لینے پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک واحد بیانیہ پیش کرنے کے بجائے، محققین نے متنوع آوازوں اور متبادل نقطہ نظر کو تلاش کیا ہے، اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ مختلف کمیونٹیز نے اپنے ماحول کو کیسے تجربہ کیا اور تشکیل دی۔ ماحولیاتی تاریخ کے تناظر میں، مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر نے توانائی کی حرکیات پر بھی سوال اٹھائے ہیں جو ماحولیاتی تبدیلیوں کو جنم دیتی ہیں۔ دانشوران نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ فطرت اور ماحولیات پر گفتگو کیسے کی گئی، مختلف سماجی گروہوں کے درمیان ماحولیاتی فوائد اور بوجھ کی اکثر غیر مساوی تقسیم پر تنقید کی۔ مزید برآں، مابعد جدیدیت کی عینک نے ماحولیاتی بیانیے کی تشکیل میں محقق کے کردار کے زیادہ اضطراری امتحان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ دانشوران نے ماحولیات سے متعلق تاریخی اکاؤنٹس کی تعمیر پر ثقافتی تعصبات، سیاسی نقطہ نظر اور ذاتی نظریات کے اثر کو سمجھا ہے۔ یہ پوسٹ ماڈرنسٹ اصول رام چندر گوہا، مادھو گوڈگل، مہیش رنگار نجن اور ڈیوڈ آرنلڈ کے کاموں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آخر میں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں تاریخ لکھنے کی روایت پر مابعد جدیدیت کا اثر ایک تبدیلی اور افزودگی کا عمل رہا ہے، جس سے مؤرخین کے تاریخی بیانیے کو دیکھنے اور ان کی تشریح کرنے کے انداز میں اہم تبدیلیاں آئیں۔ مابعد جدیدیت سے متاثر ہندوستانی تاریخ کی تحریر میں تبدیلی کے کچھ اہم پہلو یہ ہیں:

مابعد جدیدیت نے ہندوستانی مورخین کو ایک واحد، غالب بیانیہ سے آگے بڑھنے اور متعدد نقطہ نظر کو اپنانے کی ترغیب دی ہے۔ تاریخ لکھنے کی روایت اب مختلف برادریوں، خطوں اور سماجی طبقوں کی آوازوں کو شامل کرنے کی کوشش کرتی ہے، جس سے ہندوستان کی پیچیدہ تاریخ کی مزید جامع تفہیم ملتی ہے۔ کمیونٹی، ثقافت اور صنف سے متعلق مطالعہ میں یہ نئی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مابعد جدیدیت کے اثرات نے روایتی قوم پرست بیانیے کے از سر نو جائزہ پر اکسایا ہے۔ مورخین قومی تاریخ کی تعمیر کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ اس نے کچھ کمیونٹیز کو کس طرح پسماندہ کیا ہو یا پیچیدہ تاریخی عمل کو زیادہ آسان بنایا ہو۔ اس نئی تاریخی حساسیت کا نتیجہ ہندوستان میں ذیلی تاریخوں کے قیام اور ترقی کی صورت میں سامنے آیا۔ مورخین اب پسماندہ اور ذیلی گروہوں کے تجربات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کو سامنے لاتے ہیں اور مرکزی دھارے کے تاریخی اکاؤنٹس کو چیلنج کرتے ہیں جنہوں نے ان داستانوں کو نظرانداز یا غلط بیان کیا ہو۔

مابعد جدیدیت نے سماجی علوم کے مطالعہ میں بین الضابطہ نقطہ نظر کی وکالت کی۔ فوکو کا "ڈسپلن اینڈ پنش" مابعد جدید دور میں ایک وسیع پیمانے پر سراہا جانے والا کام ہے، جو اپنے بین الضابطہ نقطہ نظر کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس میں مطالعہ کے لیے نئے تصورات متعارف کرائے گئے ہیں، جیسے نظم و ضبط، شائستہ جسم، بیناپٹک پاور، علم اور طاقت کے درمیان تعلق اور نظم و ضبط معاشرہ۔ اس لیے مابعد جدیدیت سے متاثر ہندوستانی تاریخ کی تحریر نے ادب، بشریات، سماجیات اور ثقافتی علوم سمیت مختلف شعبوں کی بصیرت کو شامل کرنا شروع کیا۔

مابعد جدیدیت کے نقطہ نظر نے ہندوستانی مورخین کو تاریخی بیانیے میں شامل طاقت کے ڈھانچے اور درجہ بندی کا تنقیدی جائزہ لینے کی ترغیب دی ہے۔ اس میں یہ سوال بھی شامل ہے کہ کس طرح ذات، جنس اور طبقاتی حرکیات نے تاریخی واقعات کو تشکیل دیا اور معاشرے کے مختلف طبقات کو متاثر کیا۔ پوسٹ کالونیلزم کے دائرے میں، ثقافتیں، متن اور سیاست نوآبادیاتی محکومیت کے رد عمل کا پتہ لگاتے ہیں، جنہیں اکثر منفی اور قابل بحث سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف کھلی مخالفت کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اختلاف رائے کے اظہار میں کیا لطیف، چالاک، ترچھا اور چالاک تھا۔ لہٰذا، مابعد نوآبادیات نہ صرف ثقافتی اور ادبی مطالعات میں ایک نظریاتی نقطہ نظر ہے بلکہ سیاسی اور ثقافتی اتھارٹی کی غیر منصفانہ اور غیر مساوی شکلوں کے خلاف تبدیلی کی مزاحمت کی سیاست کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ مزاحمت بیسویں صدی اور اس سے آگے تک پھیلی ہوئی ہے، تبدیلی کے لیے مسلسل کوششوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت شناخت کی روانی اور ہائبرڈ نوعیت پر زور دیتی ہے۔ ہندوستانی مورخین، اس نقطہ نظر سے متاثر ہو کر، ثقافتی، مذہبی اور علاقائی شناختوں کے پیچیدہ تعامل کو تلاش کرتے ہیں، لازمی نظریات کو چیلنج کرتے ہیں اور کمیونٹیز کے اندر موجود تنوع کو تسلیم کرتے ہیں۔ مابعد جدیدیت نے ہندوستانی مورخین کو تاریخ کی یورو سینٹرک تشریحات کو چیلنج کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اینٹی یورو سنٹرک تاریخ تحریر تاریخی بیانیے میں یورپی تناظر کے روایتی غلبے کو چیلنج کرتی ہے۔ جس سے عالمی تاریخ کی مزید جامع اور متنوع تفہیم فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر کا مقصد یورپ کو غیر مرتکز کرنا اور غیر یورپی معاشروں کے تعاون، تجربات اور نقطہ نظر کو تسلیم کرنا ہے۔ مابعد جدیدیت کے اثرات تاریخی نمائندگیوں کی تشکیل میں زبان کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں۔ ہندوستانی مورخین تاریخی متون کی لسانی باریکیوں پر توجہ دیتے ہیں، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ زبان کا انتخاب واقعات کی تشریح کو متاثر کر سکتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی تاریخ لکھنے کی روایت میں مقامی زبانوں میں ماخذ کی نئی تلاش شروع ہوئی۔ مورخین متن میں گمشدہ آوازوں یا پسماندگی کو تلاش کرنے کے لیے متن کی زبان کی تشکیل پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔

16.6 تنقید (Criticism)

جدیدیت کے مابعد جدیدیت کے نقادوں کی طرح، مابعد جدیدیت کے ساتھ منسلک دانشوران نمایاں طور پر مختلف ہیں، جو ایسے نقطہ نظر پیش کرتے ہیں جو ہلکے تنقید سے لے کر صریح مسترد تک ہوتے ہیں۔ کچھ دانشوران تنقیدی طور پر مابعد جدیدیت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ روایتی بیانیے پر سوال اٹھانے اور متنوع نقطہ نظر کو فروغ دینے کے معاملے میں اس کے کارنامے کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ قائم کردہ اصولوں کو چیلنج کرنے اور تاریخی واقعات کی مزید جامع جانچ کی حوصلہ افزائی کرنے میں اس کے کردار کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ دانشوران اکثر

ایک درمیانی بنیاد تلاش کرتے ہیں، جو مابعد جدیدیت کی بصیرت کی قدر کو تسلیم کرتے ہیں جبکہ ممکنہ نقصانات جیسے کہ تعلقات اور تجرباتی ثبوت کی قدر میں کمی کو ذہن میں رکھتے ہیں۔ ایسے بھی مؤرخین ہیں جو مابعد جدیدیت کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ وسیع بیانیہ کی طرف شکوک وشبہات اور معروضی سچائی کو مسترد کرنا ایک تاریخی نقطہ نظر کا باعث بن سکتا ہے جو حد سے زیادہ موضوعی، بکھرا ہوا اور تجرباتی بنیادوں سے الگ ہے۔ نوم چومسکی کا کہنا ہے کہ مابعد جدیدیت بے معنی ہے۔ یہ مظلوم اور ظالم کے درمیان کی سرحدوں کو دھندلا دیتا ہے اور معاشرے میں ان انقلابی آوازوں کو دبا دیتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے ناقدین اکثر سخت تاریخی طریقہ کار کو برقرار رکھنے اور تاریخی تحقیقات میں معروضی سچائیوں کے عزم کو برقرار رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ سومیت گوہا ہندوستان میں مابعد جدیدیت کے مطالعے کا ایک مضبوط تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں، جو لوگوں کی حساسیت پر ان کے اثرات اور روشن خیالی اور عقلیت کو مسترد کرنے پر زور دیتے ہیں۔ گوہا کا استدلال ہے کہ یہ رجحان آر تھوڈوکس اور مذہبی بنیاد پرستی کے عروج میں معاون ہے۔

16.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی سے آپ کو نظریہ جدیدیت کی تاریخ، اصولوں، فلسفیوں، مفکرین اور اور تاریخ نویسی میں اس کے کردار کے بارے میں علم ہوا۔ علم تاریخ اور تاریخ نیگاری کے حوالے سے خاص طور پر آپ کو نظریہ جدیدیت کے کارنامے اور اس کے منفی پہلو کے بارے میں بھی آپ کو واقفیت ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ نے نظریہ مابعد جدیدیت کی تاریخ، فلسفیانہ پہلو، اہم اصول، کے ساتھ ساتھ انکے اہم مفکرین جیسے مشیل فوکو، ڈیریڈا، ہیڈین وایٹ، لیوٹارڈ، مارٹین ہیڈیگر، نطشے کے خیالات، تصانیف اور نظریہ مابعد جدیدیت کو فروغ دینے میں انکے کارنامے اور کردار سے بھی واقفیت ہوئی۔ خاص طور سے ان مفکرین کا نظریہ جدیدیت سے ظاہر ہونے والی تاریخ نویسی کی روایت پر تنقید اور تاریخ نویسی میں ایک نیا نظریہ کے آغاز سے بھی واقفیت ہوئی۔ آخر میں آپ کو اس اکائی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوستان میں کس طرح سے مؤرخین نے مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ نظریہ کو استعمال کر کے ہندوستانی تاریخ میں اہم پسماندہ طبقات کے موضود کا راستہ ہموار کیا۔ جیسا کہ آپ نے رنجیت گہا، دیپش چکرورتی وغیرہ کی تحروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

16.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

جدیدیت : (Modernity) جدیدیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں انسانی حقوق اور جمہوریت پر زور ڈالا ہے اور دنیا کو بہترین طریقے سے سمجھنے میں مدد کی ہے۔

مابعد جدیدیت : (Post-Modernism) ایک ایسا فلسفہ ہے جو دنیا کو ٹکڑوں ٹکڑوں (fragments) میں سمجھنے پر زور دیتا ہے اور اس عمل میں ہر کسی کو گمراہی میں ڈال چکا ہے۔ کچھ حد تک یہ صحیح بھی ہے کیونکہ اس نے سماج کے حاشیائی طبقوں پر روشنی ڈالنے میں مدد کی ہے، لیکن ہندوستان جیسے ترقی پذیر سماجوں میں مذہبی بنیاد پرستی اور فرقہ پرست طاقتوں کو بھی ہوا دے رہا ہے۔ اسی لیے متعدد دانشوروں کا ماننا ہے کہ مستقبل میں یہ بیحد

خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

16.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. نظریہ مابعد جدیدیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے کس کس فلسفے کے اصولوں کو سمجھنا ضروری ہے؟
2. دو جرمن فلسفیوں یا نظریہ سازوں کا نام بتایئے جنہوں نے نظریہ جدیدیت کی بنیاد قائم ڈالی۔
3. کس نے مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو پینٹنگ کے ضمن میں استعمال کیا ہے؟
4. آرنالڈ ٹایوںبی کی کتاب کا نام بتایئے۔
5. آفاقی علم کے تصور پر کون سے فلسفی تقین کرتے ہیں؟
6. میٹا نیریٹو کا خیلا فلسفے کے کس نظریہ سے تعلق رکھتا ہے؟
7. کس فلسفی کے مطابق سچائی محض طاقت اور تسلط کے حصول کے لیے ایک بہانہ ہے؟
8. Being and Time کس کی تصنیف ہے؟
9. علم اور طاقت کا نظریہ کس مورّخ اور فلسفی نے دیا ہے؟
10. ہندوستان میں کن مورّخین نے مابعد جدیدیت کے نظریہ کا استعمال کیا ہے؟

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تاریخ کے بارے میں ہیڈن وائٹ کے خیالات کو دس جملوں میں لکھیئے۔
2. مشیل فوکو کے علم اور طاقت کے نظریات پر پانچ جملے لکھیئے۔
3. Deconstruction کا کیا مطلب ہے؟
4. ہندوستانی تاریخ میں مشیل فوکو کے نظریات کے استعمال پر پر پانچ جملے لکھیئے۔
5. تاریخ پر رنجیت گہا کے خیالات کو دس جملوں میں لکھیئے۔

16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مابعد جدیدیت کیا ہے کیا آپ کو یقین ہے کہ مابعد جدیدیت نے ہندوستانی تاریخ نویسی پر گہرا اثر ڈالا ہے؟
2. مابعد جدیدیت اور ماڈرنسٹ فلسفے میں کیا فرق ہے؟
3. مابعد جدیدیت کے فلسفے میں مشیل فوکو کے کاموں اور شراکت پر ایک نوٹ لکھیے۔

16.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Carr, E.H., *What is History?* University of Michigan, 1961.
2. Chatterjee, Partha, *The Nation and Its Fragments: Colonial and Postcolonial Histories*, Princeton University Press, 1993.
3. Eagleton, T., *The Illusions of Postmodernism*, Blackwell Publishing, New York,1996.
4. Foucault, M., *Madness and Civilization: A History of Insanity in the Age of Reason*, Routledge, London, 1965.
5. Foucault, M., *Archaeology of Knowledge and the Discourse of Language*, Harper Colophon, New York, 1969.
6. Foucault, M., *Discipline and Punish: The Birth of the Prison*, Vintage, London, 1977.
7. Lyotard, J.F., *The Postmodern Condition: A Report on Knowledge*, Manchester University Press, Manchester, 1988.
8. Prakash, Gyan, 'Writing Post-Orientalist Histories of the Third world: Perspective from Indian Historiography', *Comparative Studies in Society and History*, Vol. 32, No. 2, April 1990.
9. Sasse, Jochen Schulte, 'Modernity and Modernism, Postmodernity and Postmodernism: Framing the Issue', *Cultural Critique*, No. 5, 1987.
10. Sreedharan, E., *A Textbook of Historiography, 500 BC-2000 AD*, Orient BlackSwan, Hyderabad, 2004.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم
Master of Arts ماسٹر آف آرٹس
Subject Code: MAHS204CCT
Subject: Modern Historiography
پرچہ: جدید تاریخ نویسی
2nd Semester Examination ، دوسرا سمسٹر امتحان
Time : 3 hours   وقت : 3 گھنٹے   Marks : 70   نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

1. نشاۃ ثانیہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟
2. دو جرمن فلسفیوں یا نظریہ سازوں کا نام بتائیے جنہوں نے نظریہ جدیدیت کی بنیاد قائم ڈالی۔
3. کسی دو سبلٹرن مورخین کے نام بتائیے۔
4. روشن خیالی سے کیا مراد ہے؟
5. Montesquieu کے مطابق 'موسمیاتی تعین' کیا ہے؟
6. کمیونسٹ مینی فیسٹو کس نے لکھی؟
7. انگریزی لفظ 'Empiricism' کس یونانی لفظ سے ماخوذ کیا تھا؟

8. تجربیت پسندوں کے نزدیک علم کی صحیح شکل کیا ہے؟
9. رانکے کے ان پانچ کلیدی الفاظ کو لکھیے جو تاریخ نویسی کی بنیاد ہیں۔
10. اپنی پہلی کتاب رانکے نے کہاں لکھی تھی؟

حصہ دوم

1. جین بوڈین کی تاریخ نویسی کے اہم نکات کیا ہیں؟
2. فرانسیسی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کے کسی دو تاریخی فلسفیوں کی شراکت کے بارے میں لکھیے۔
3. تاریخ نویسی میں Diderot کی کیا شراکت ہے؟
4. انسانی معاشروں کی ترقی کے ٹرگوٹ کے تین مراحل کی وضاحت کریں۔
5. آگسٹ کومتے کے فلسفیانہ نظریہ کو دس جملوں میں بیان کیجیے۔
6. نظریہ اثباتیت سے متعلق دو اصطلاحات کا تعارف کرائیے۔
7. روشن خیالی کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
8. انسانیت پرست تاریخ نویسی پر ایک نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

1. اطالوی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیں۔
2. روشن خیالی کی تاریخ نویسی کی اہم خصوصیات کی وضاحت کریں۔
3. رانکے کون تھا؟ تاریخ نویسی کے طریقہ کار کے فلسفے میں ان کی شراکت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
4. سبلٹرن تاریخ نویسی کی تنقید میں مختلف مفکرین کے نظریات بیان کیجیے۔
5. مابعد جدیدیت کیا ہے؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ مابعد جدیدیت نے ہندوستانی تاریخ نویسی پر گہرا اثر ڈالا ہے؟

اہم نکات